خواتین ڈائجسٹ
اپریل 2023
سالگرہ نمبر

آپ سے کیا پردہ

خاتون کی ڈائری

مجھ سے ملیے

مکمل ناول

ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

پکوان

رنگا رنگ پھول

میری بیاض سے

نفسیات

بیوٹی بکس

پبلشر آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617 Fax: 92-21-32766872 0317 2266944

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

راحت جبیں

آنگنا پھول کھلیں گے

ارم کو ثانیہ کی دراز میں وہی لاکٹ نظر آتا ہے، جو اس کے بھائی عبید نے اسے اپنے لیے خریدنے کا مشورہ دیا تھا۔ واپسی پر اس کو وسیم ملتا ہے جس کی نگاہوں میں ارم کے لیے محبت تھی۔

ارم، ثانیہ سے اسی لاکٹ کے بابت دریافت کرتی ہے ثانیہ چڑ جاتی ہے اور عبید کو لاکٹ واپس کردیتی ہے۔ ارم عبید کو فون پر کسی سے باتیں کرتا سن کر اسے چڑاتی ہے اور اس لڑکی کا نام جاننا چاہتی ہے، جسے عبید اس کی بھابھی بنانا چاہتا ہے۔

نادرہ کی کمیٹی نکلی ہے وہ بہت خوش ہے کہ آصفہ آجاتی ہے اور اپنے خراب فریج کا رونا روتی ہے۔ شبیر نادرہ کو ڈانٹ ڈپٹ کر پیسے دینے پر راضی کرلیتا ہے۔ وہ پیسے آصفہ کو دیتا ہے کہ عین وقت پر ثانیہ وہ روپے اپنا حق جتاتے پکڑ لیتی ہے اس پر ایک جھگڑا کھڑا ہوتا ہے شبیر اس کو تھپڑ مارتا ہے۔ آصفہ ناراض ہو کر چلی جاتی ہے۔ گھر جا کر وہ خوب ڈرامہ کرتی ہے۔ سہیل ماں کی بے عزتی پر آگ بگولہ ہوجاتا ہے اور اپنی ماں کے علاوہ رابعہ کا بھی مکان سے حصہ مانگنے کا عندیہ دیتا ہے۔

ثانیہ بہت دکھی ہے عبید اسے جلد ہی اپنا بنانے کا وعدہ کرتا ہے اور اسے آصفہ سے معافی مانگنے کا کہتا ہے۔ آسیہ نے عبید کے لیے لڑکی پسند کرلی ہے۔

ثانیہ معافی مانگنے پھوپھو کے گھر پہنچ جاتی ہے۔ شبیر فریج لے کر بہن کے گھر آتا ہے۔ ثانیہ کے معافی مانگنے پر فرخ اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ عبید اس سے منگنی کرنا چاہتا ہے۔

پانچویں قسط

ایک لمحے کو آصفہ کو سانپ سونگھ گیا۔ بے یقینی سے فرخ کو دیکھا۔ وہ شروع سے ہی لاڈلا اور منہ زور تھا۔ اپنی من مانی کا عادی۔ مگر گھر چھوڑنا۔ وہ بھی ایک لڑکی کی خاطر اندر کہیں آگ بھڑکی اور سرتاپا جھلسا گئی۔ ایسی شکست ایسی ہار وہ، بھی نادرہ کی بچی کے ہاتھوں وہ رابعہ کی طرف لپکیں۔

"کون سے تعویذ گھول کر پلاتی رہی ہیں ماں بیٹیاں۔" اس سے قبل کہ وہ رابعہ کے بال ہی نوچ لیتیں سہیل سامنے آگیا۔

"اماں! ہوش کریں۔ کیا ہوگیا ہے۔"

اماں کیا ہوش کرتیں یہاں تو دیکھتے ہی دیکھتے حالات بدل گئے۔ جذبات بدل گئے۔ ان کے اپنے بیٹے ان کے سامنے آکھڑے ہوئے تو پیچھے بچا کیا تھا۔

آصفہ کا واویلا آسمان چھونے لگا۔

تھر تھر کانپتی رابعہ شوہر کے پیچھے چھپی جارہی تھی۔ جو بے بسی سے دانت پیستے ماں کو خاموش کروا رہا تھا۔

فرخ نے بےزاری سے پیشانی مسلتے ماں کو دیکھا۔ مگر بولا کچھ نہیں۔ ماں کے اندر کا غبار باہر آنا ضروری تھا۔ جب وہ روتی پیٹتی صوفے پر گر کر اکھل چھل سانس بحال کرنے لگیں تب اس نے تسلی سے دریافت کیا۔

"آپ چھپن کی یا نانی سے کہوں، میرا رشتہ مانگیں۔"

"میری جانی ہے جوتی۔" آصفہ نے سارا واویلا رائیگاں جاتا دیکھ کر چپل کھینچ ماری۔ چپل فرخ کے سینے سے ٹکرا کر نیچے گری۔

فرخ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس نے سر جھکا کر چپل کو دیکھا۔ اسے ٹھوکر سے اڑایا۔ اور بگولے کی طرح نکلا۔ سہیل اس کے پیچھے لپکا۔ کیونکہ فرخ کی ضد سے اچھی طرح واقف تھا۔ گھر سے نکل جاتا تو واپس لانا مشکل تھا۔

"دفع ہو، جہاں کی خاک چاٹنی ہے۔ جا کے چاٹ۔" نصرت چلائیں۔
"فرخ، رک نا یار۔" سہیل بمشکل اسے دروازے تک پکڑ پایا۔
"مجھے اس گھر میں نہیں رہنا۔ جہاں میری بات کی کوئی ویلیو ہی نہ ہو۔"
"تمہیں بھی پتا ہے، امی کو ثانیہ پسند نہیں ہے۔ ورنہ اگر وہ رابعہ کو بہو بنا سکتی ہیں تو انہیں ثانیہ پر کیا اعتراض ہوگا۔"
"مجھے تو پسند ہے اور شادی بھی میں نے کرنی ہے اور کوئی غیر خاندان کی نہیں، امی کے بھائی کی بیٹی ہے۔" سہیل کو اندازہ ہونے لگا۔ عشق سر چڑھ کر بول رہا ہے۔
"اچھا ٹھیک ہے۔ گھر چھوڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں اماں سے بات کرتا ہوں۔"
سہیل کے مفاہمت پسند صلح جو انداز پر فرخ دھیما پڑ گیا۔
"صرف بات نہیں کرنی، انہیں منانا ہے بھائی۔"
"منا لوں گا۔ ہتھیلی پر سرسوں تو نہ جماؤ۔ چلو میرے ساتھ، چھوٹی چھوٹی باتوں پر گھر نہیں چھوڑتے۔" وہ سمجھا بجھا کر فرخ کو اندر لے گیا۔
فرخ کو سمجھانا آسان تھا۔ مگر ماں کو؟ سہیل کو آنے والے مشکل وقت کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔
"اماں! ثانیہ کٹوری میں تیل ڈالے آ گئی۔ بال بہت ہی روکھے اور بے رونق ہو گئے تھے۔ کالج سے چھٹیاں شروع ہو گئی تھیں کہ کلاسز کو فری کر دیا تھا۔ ثانیہ نے شکر ادا کیا کہ اب ارم کی شکل دیکھنا نہیں پڑے گی۔ دونوں میں دوری دیکھ کر سہیلیوں نے ہی سوال کر کے جان کھا لیا تھی۔
"تیل ہی لگا دیں۔"
موبائل پر ڈرامہ دیکھتی نادرہ بدمزہ ہو گئیں۔ ٹیمپو ہی ٹوٹ گیا۔ "خود لگا لو۔"
"کیا ہو گیا اماں...... آپ کی ہیروئن تھوڑی دیر بعد گھر سے بھاگ جائے گی۔" وہ زبردستی پیڑھی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ نادرہ نے بیزار ہو کر موبائل ایک طرف رکھا۔
"اب اتنا منہ نہ بنا ئیں۔ آسیہ خالہ کو دیکھا ہے۔ کیسے ارم کے بالوں اور اسکن کی حفاظت کرتی ہیں۔"
"ایک تو یہ پڑوسن مجھے لے کر بیٹھ گئی ہے۔" نادرہ بڑبڑاتے ہوئے تیل لگا کر مالش کرنے لگیں۔
"اسی جلیسی میں آپ نے کبھی ان کے ساتھ بنا کر نہیں رکھی۔" ثانیہ نے گلہ کیا۔
جس دن آسیہ چکر لگا کر جاتیں یا دادی ان کے گھر سے ہو کر آتیں۔ سارا دن انہیں نادرہ بھی کیا کرتیں۔ نادرہ کے ہر کام میں کیڑے دکھائی دیتے۔ آسیہ کی ٹوک ٹاک آسیہ کے گھر کا سلیقہ، صفائی ان کے تو کان پک جاتے۔ بجائے آسیہ سے کچھ سیکھنے کے وہ ان کی صحبت سے دور ہی بھاگتیں۔ وہ تو دادی کی ٹانگوں نے چلنے سے انکار کیا اور نادرہ کے رویے سے آسیہ پیچھے ہٹیں تو نادرہ نے سکون کا سانس لیا۔
"ہونہہ حسد کرتی ہے میری جوتی۔ ایویں بس کچھ لوگوں کو ہر وقت اپنی تعریفیں کرنے کا شوق ہوتا ہے۔"
"سب ہی کرتے ہیں۔" ثانیہ کا لہجہ مدھم ہو گیا۔
نادرہ کی توجہ موبائل پر مرکوز ہو گئی۔ الٹے سیدھے ہاتھ مار کر چوٹی گوندھ دی۔
ثانیہ خاموشی سے امرود کی شاخوں میں چھپے پکے ہوئے امرود ڈھونڈنے لگی۔ اسے امرود پسند نہیں تھے۔ مگر ارم اور عبید چھوڑتے نہیں تھے۔ دونوں امرود توڑ کر اسی کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر کچر کچر کھاتے...... اور اسکول کی ساری باتیں دہراتے۔ کبھی کبھار ثانیہ خاموشی سے دونوں کو دیکھا کرتی۔ ارم کی کتر کتر چلتی زبان، کونسی بات تھی جو وہ عبید کو نہیں بتاتی تھی۔ وہ بھی جھاڑ بھی ڈانٹتا۔ کبھی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی بے مقصد اور بے معنی باتیں سنا کرتا۔
ایسے ہی کسی لمحے کی اسیر ہو کر ثانیہ نے بھی وسیم کو اپنے اسکول کی باتیں بتانے کی کوشش کی تو اس نے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ اس کے میٹرک کے پرچے تھے۔ اتنا وقت کہاں تھا کہ وہ ثانیہ کی بے سروپا باتیں سنتا۔ ثانیہ نے غصے سے امرود کی کئی شاخیں توڑیں۔ پتے نوچے اور حل یہ نکالا کہ خود ارم اور عبید کے درمیان گھس کر بیٹھ جاتی۔ عبید اسے بھی اسی تحمل اور سکون سے سنا کرتا۔
"کاش کاش وہ بچپن کے دن دوبارہ لوٹ آئیں۔"
"ٹھک۔" باہر سے کسی نے پتھر مارا تھا۔
نادرہ نے غصے سے کٹوری پٹخی...... اور چپل لے کر باہر بھاگیں۔ ثانیہ نے گہری سانس لے کر موبائل اٹھایا۔ جس پر رابعہ کی کال آ رہی تھی۔
"ہیلو۔"
"کرلو تیاری، آ رہے ہیں تمہارا رشتہ لے کر......" کانپتی لرزتی آواز۔
"کس کا رشتہ......" ثانیہ نے حیرت سے دہرایا۔
"فرخ کا رشتہ تمہارے لیے۔" رابعہ نے دانت پیسے۔ ثانیہ کو ہنسی آ گئی۔
"اس کی اوقات ہے، مجھ سے شادی کے خواب دیکھے۔ شکل نہیں دیکھی تو آئینہ دکھا دو۔" وہ اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔
"انگوٹھی عبید کے ہاتھوں پہن کر شادی کے خواب اسے دکھاتی رہی ہو۔" رابعہ پھٹ پڑی۔ وہ ہنسی، وہ مذاق، خوامخواہ کی بے تکلفی۔
"تمہاری خاطر تھوڑا ہنس بول لیا تو اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے۔" وہ رابعہ کی باتوں پر چڑ گئی۔
"اس نے تو یہی مطلب لیا ہے۔ ہمارے گھر میں تو فساد ہو رہا ہے۔"
"ہائے پھوپھو کی تو حالت دیکھنے والی ہو گی۔" ثانیہ نے چڑایا۔ وہ اب بھی بات کی سنگینی کو نہیں سمجھی تھی۔
"تم مزے لیتی رہنا۔ اگر فرخ نے ماں کو منا لیا تو......" رابعہ کو غصہ آ گیا۔
"پھوپھو خودکشی کر لیں گی۔ مگر ثانیہ کا رشتہ لے کر نہیں آئیں گی۔ لکھ کر رکھ لو......"
ثانیہ نے چوٹی کو ہاتھ میں لیا۔ تیل لگے بالوں کی گندھی چوٹی اس حالت میں فرخ دیکھ لے تو ویسے ہی انکار کر دے۔ پھر یاد آیا، وہ اس کا کزن ہے اور بچپن سے اسے ہر حلیے میں دیکھتا آ رہا ہے۔
"فرخ سے بات کر لو۔ اسے باز رہنے کا کہو۔ یہ نہ ہو، کسی مشکل میں پڑ جاؤ اور امی کو فوراً عبید کے بارے میں سب کچھ بتا دو۔ باقی وہ سنبھال لیں گی۔" دوسری طرف رابعہ کہہ رہی تھی۔
"سنبھال ہی نہ لیں۔" ثانیہ بڑبڑائی۔ اسے ماں کی صلاحیت پر ایک فیصد بھی یقین نہ تھا۔ رابعہ کو تسلی دے کر کال کاٹ دی۔ دل میں خیال سا آیا۔
"عبید کو بتاؤں، تمہارا رقیب پیدا ہو گیا ہے۔"
پھر خود ہی ارادہ بدل دیا۔ ابھی عبید پریشان تھا۔ وہ اسے مزید بے سکون کرنا نہیں چاہتی تھی۔
"اس فرخ کے بچے سے خود ہی نمٹ لوں گی۔"

☆☆☆

"یار میری جرابیں نہیں مل رہیں۔" گلے میں ٹائی لٹکائے عبید باہر آیا تو بے تحاشا جھنجھلایا ہوا تھا۔
"مجھے انڈے نہیں مل رہے۔" فیصل نے سارا کچن چھان مارا۔ رات ہی تو لایا تھا۔ اب غائب۔

"میں اپنی جرابوں کا پوچھ رہا ہوں۔"
"میں اپنے انڈوں کا......" جرابوں پر وہ آ نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ اس کے پیروں میں موجود تھیں۔
"تم نے کب سے انڈے دینا شروع کر دیے؟"
"جب سے تو کڑک ہوا ہے۔" فیصل برجستہ بولا۔
"دفع دور......" عبید کو ایسا گھٹیا مذاق پسند نہیں آیا۔ تو ناک کس کے لاؤنج کے صوفے پر آ بیٹھا۔ کیونکہ سامنے رکھا اس کا موبائل بج رہا تھا۔
تڑ...... تڑ...... تڑ کچھ تو عجیب ہوا تھا۔ وہ جتنی جلدی بیٹھا تھا اس سے زیادہ کرنٹ کھا کر اٹھا۔ مگر انہونی ہو چکی تھی۔ سارے انڈے شاپر اور باہر...... ملیامیٹ...... اور جو اس پر بیٹھا تھا......؟"
"فیصل......" وہ حلق کے بل چلایا۔
"کیا ہوا؟" فیصل گھبرا کر بھاگا۔
"تمہارے انڈے ٹل گئے ہیں۔" اس نے غصہ ضبط کرتے تحمل سے بتایا۔
"کہاں؟" فیصل نے حیرت سے اس کے خالی ہاتھوں کو دیکھا۔
"یہاں......" عبید پلٹا، اس کی پینٹ کا حشر دیکھ کر فیصل ہکا بکا رہ گیا۔
"یار! میں نے تو مذاق کیا تھا تو سیریس ہی ہو گیا۔"
ہنس ہنس کر ثانیہ کا چہرہ لال ہو گیا۔ عبید نے ناراضی سے ڈانٹا۔
"اب تم بھی میرا مذاق اڑاؤ گی۔"
"مذاق نہیں اڑا رہی۔ تم نے بات ہی ایسی سنائی ہے۔"
"تمہاری خاطر مجھے کیا کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ فیصل انتہائی لاپرواہ اور پھوہڑ انسان ہے۔ میں جتنا مرضی لڑوں یا پریشان ہو جاؤں۔ بس اپنی من مرضی کرتا ہے۔ کبھی میری شرٹ پہن جاتا ہے تو کبھی جرابیں...... اور کئی کئی دن نہیں اتارتا۔"
عبید تمیز، تہذیب اور طریقے سلیقے سے رہنے کا عادی تھا۔ فیصل کے ساتھ رہنا کسی امتحان سے کم نہ تھا۔
"راہ عشق میں نجانے کیا کیا امتحان آئیں گے۔ تم ابھی سے گھبرا گئے۔" ثانیہ نے تفاخر سے شیمپو زدہ بالوں کو جھٹکا دیا۔ وہ ابھی نہائی تھی۔ تبھی دھوپ کے لیے چھت پر آ گئی۔ سائڈ والی چھت سنسان تھی اور دیکھ کر لگتا تھا کئی دنوں سے صفائی بھی نہیں ہوئی۔ تب ہی عبید کی کال آ گئی۔ اور اب وہ اپنے دکھڑے رو رہا تھا۔
"گھبرایا تو نہیں ہوں۔ تم سناؤ۔ گھر میں سب ٹھیک ہے۔"
"ہاں، سب ٹھیک ٹھاک ہے، یہاں کیا ہونا ہے۔ تسلی سے بیٹھ کر انتظار کر رہے ہیں کہ کب بیٹا حالات سے گھبرا کر گھر آئے اور ان سے معافی مانگے۔"
"تمہیں لگتا ہے۔ میں یہ کروں گا؟" عبید سنجیدہ ہو گیا۔
"جب تھک گئے تو یہی کرو گے۔"
"تم میرے ساتھ کھڑی رہو۔ میں نہیں تھکوں گا۔"
"میں تو خود تمہارے سہارے کھڑی ہوں عبید۔"
"اور تم دیکھنا، بہت جلد وہ دن بھی آئے گا جب تمہارا نام میرے نام کے ساتھ جڑ جائے گا۔ تم آفیشلی میری ہو جاؤ گی۔" عبید [illegible] یقین سے [illegible] ثانیہ نے بے اختیار ان شاء اللہ کہا۔
تبھی اس نے اوپر آتی ارم کو دیکھا۔ وہ پرندوں کو دانہ اور پانی ڈالنے آئی تھی۔ ثانیہ نے خدا حافظ کہہ کر کال

کاٹ دی۔
ارم نے اسے یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔
ثانیہ خود ہی منڈیر کے پاس آ گئی۔
"انکل کی طبیعت اب کیسی ہے ارم؟"
"ٹھیک ہیں۔" وہ مختصراً کہہ کر مٹی کی کنالی دھونے لگی۔ ثانیہ کو وہ خاموش اور اداس لگی۔
"عبید نہیں آیا ابھی تک۔" نجانے کیوں ثانیہ کے منہ سے پھسلا ارم نے تڑپ کر سر اٹھایا۔
"میرا مطلب ہے......" ثانیہ تھوڑا شرمندہ ہو گئی۔
ارم نے کنالی کو پانی سے بھرا اور سیدھی ہوئی۔
"آئے گا تمہاری خاطر نہیں ہماری خاطر اپنے گھر والوں کے لیے آئے گا۔"
"آئے گا۔ تو اسی کی خاطر جس کی خاطر، اس نے گھر چھوڑا ہے۔" ثانیہ نے ناک کر نشانہ لیا۔
ارم کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ کتنا بھی نظر انداز کرلی سچائی تو یہی تھی۔
"تم میرے اور عبید کے رشتے کو تسلیم کرلو۔" ثانیہ کو شاید ارم پر ترس آ گیا۔ "ہماری دوستی بھی قائم رہے گی۔ اور عبید کا دل بھی خراب نہیں ہوگا۔"
"عبید کا دل تم نے جتنا خراب کرنا تھا کر لیا۔ تم نے تو بنیاد ہی جھوٹ پر رکھ دی ہے ثانیہ! لیکن بہت جلد وہ تمہاری اصلیت جان لے گا۔ کیونکہ جس رشتے میں خلوص نہ ہو وہ پھیکا اور بے رنگ ہوتا ہے۔"
ارم کو دکھ تھا۔ ثانیہ نے کتنی آسانی سے جھوٹ بولا اور عبید نے یقین بھی کر لیا۔
"اپنے رشتے میں رنگ کیسے بھرنا ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں تم بتاؤ بھائی سے ملنے کو دل چاہتا ہے تو میں بلا دیتی ہوں کیونکہ آج کل وہ ثانیہ کے سوا کسی کو نہیں سنتا۔"
"مجھے اپنے بھائی سے ملنے کے لیے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔" ارم نے سلگتے لہجے میں کہا اور تیزی سے نیچے اتر گئی۔
"آہ...... تم کیا جانو، سچے پیار کی طاقت کیا ہوتی ہے۔" ثانیہ نے مزید چڑایا۔
"کیا ہوا؟" ارم کا چہرہ اس کے اندرونی جذبات کا عکاس تھا۔ غصہ، بے بسی آنکھ کنارے مچلتا پانی کتاب پڑھتی آسیہ ایک نظر ڈالتے ہی چونکیں۔
"امی! ابو سے کہیں، عبید کو ڈھونڈیں۔ کسی دوست کی طرف ہی گیا ہوگا۔ شہر تو نہیں چھوڑ گیا۔"
"ان کی طبیعت ابھی بہتر نہیں ہوئی بیٹا۔" انہوں نے نرمی سے سمجھایا۔ ارم اوپر گئی تھی۔ یقیناً ثانیہ کے ساتھ ٹاکرا ہوا تھا۔
"وہ ثانیہ کے ساتھ رابطے میں ہے۔ ہمیں ایک کال نہیں کر سکتا۔"
ارم سچ میں رو پڑی۔ آسیہ نے کتاب رکھی اور آہستگی سے ان کا ہاتھ پکڑ کر سہلایا۔ مگر کچھ کہا نہیں۔ گھنے بادل برس جائیں تو مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ وہ بھی چاہتی تھیں۔ ارم کے اندر کا غبار دھل جائے۔ اور خود وہ...... ان کی آنکھوں میں دھند سی ہونے لگی۔ جس میں رستہ سجھائی ہی نہ دیتا۔ ثانیہ کے لیے ہاں نہ کرتیں تو بیٹا بکھر جاتا۔ ہاں کرتیں تو گھر کا شیرازہ بکھرتا تھا۔
"یا اللہ مدد......" بیٹی کا سر کندھے سے لگاتے انہوں نے دعا مانگی۔

☆☆☆

"نانی صدقے، نانی واری۔" دادی نے اپنے پوپلے منہ سے فرخ کا منہ چوم لیا۔ فرخ نے فخر سے ماں کو

دیکھا..... آصفہ تلملا کر بیٹھ گئیں۔ ورنہ اب تک اٹوائی کھٹوائی لیے پڑی تھیں۔ ان کی بھوک ہڑتال جاری تھی۔ رابعہ کی شکل نہ دیکھتیں۔ اس کے ہاتھ سے کچھ کھانے کو نہ دیتیں۔

سمجھانے کی ہر کوشش ناکام ہوئی تو سہیل دادی کو اٹھا لایا..... اور ان کے تو من کی مراد پوری ہوئی تھی۔ خوشی سے نہال نہ ہوتیں تو کیا کرتیں۔

فرخ بھاگ کر ان کے لیے دودھ جلیبی بھی لے آیا۔

"مجھے لگا۔ میری ماں میرا ساتھ دے گی۔ مگر اس نے تو دشمنوں سے ہاتھ ملا لیا ہے۔"

"کون سے دشمن..... پگلی نہ ہو تو چل اٹھ، کچھ کھا لے۔" دادی نے پکارا۔ ساتھ ہی رابعہ کو آوازیں دیں۔

"زہر نہ کھا لوں۔"

"زہر کھائیں تمہارے دشمن۔"

"دشمن کیوں کھانے لگے، وہ تو میرے سینے پر مونگ دلیں گے۔"

"کیا دشمن دشمن لگا رکھی ہے۔ بھابھی اور بھائی ہیں۔" دادی نے ٹوکا۔

"رہنے دو اماں! جس بھابھی کو ساری زندگی جوتے کی نوک پر رکھا۔ اسی کی بیٹی کو میرے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس کمبخت نے۔"

انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے فرخ کو گھورا۔ جو تسلی سے بیٹھا جلیبیاں کھا رہا تھا۔ جانتا تھا نانی سب سنبھال لیں گی۔

"آج سامنے کھڑا کیا ہے۔ شادی ہو گئی تو یہی فرخ پاؤں دھو دھو کر پیے گا۔" دادی نے پکارا۔

تب ہی رابعہ پیالا بھر دودھ جلیبی لے آئی۔

"اماں! اس سے کہو، میری نظروں سے دور رہے۔"

"خبردار آصفہ، جو میری پوتی سے اس طرح بات کی تو۔" دادی کو تاؤ آ گیا۔ کچھ بھی ہو، پوتی بہت پیاری تھی۔

آصفہ روتے بیٹھ گئیں۔ رابعہ نے پیالا میز پر رکھا اور کمرے میں آ گئی۔ موبائل اٹھا کر دیکھا۔ بیلنس ختم تھا۔

وہ رہ گئی۔ گھر سے کال آ جاتی تو ماں کو بتاتی یہاں کیا چل رہا ہے۔ مگر نہیں رابعہ کے موبائل میں بیلنس نہ ہو تو کوئی کال کر کے خیریت بھی نہیں پوچھتا تھا۔

نہ جانے اندر کھاتے چل کیا رہا تھا۔

اس نے سن گن لینے کی کوشش کی۔ مگر کمرے کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔ اور بند کمرے میں نجانے کیا کیا فیصلے ہو رہے تھے۔

☆☆☆

آفس سے نکلا ہی تھا کہ وسیم کی کال آ گئی۔ سلام دعا کے بعد اس نے فوراً ہی پوچھا۔

"انکل کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"انہیں کیا ہوا؟" عبید نے تعجب سے پوچھا تو وسیم متحیر رہ گیا۔

"کیا مطلب؟ تم گھر پر نہیں ہو؟"

عبید کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو فوراً سنبھل گیا۔

"[illegible] گھر سے باہر آیا ہوں۔" وسیم نے مختصراً تفصیل بتائی۔ عبید کو لگا، اس کے ہاتھ

پاؤں ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ نجانے کیا کہہ کر کال کاٹ دی تو وسیم کو خیال آیا۔ وہ شہر سے باہر ہے تو کیا گھر والوں کے ساتھ رابطے میں بھی نہیں ہے۔

"ہو سکتا ہے اس کی پریشانی کے خیال سے اس کو بتایا نہ گیا ہو۔"

بہت دیر خود کو روکنے، سوچنے کے باوجود وسیم نے بے اختیار ارم کا نمبر ملا لیا۔

"ہیلو....."

وسیم نے آنکھیں بند کر کے اس کی آواز کو اپنے اندر جذب کیا۔ تو من آنگن میں کلیاں ہی کلیاں کھل گئیں۔

"ہیلو کون؟"

دوسری طرف اس کا نمبر بھی سیو نہیں تھا، اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"ہیلو کون ہے، بولتے کیوں نہیں ہو؟" آواز میں جھنجلاہٹ در آئی۔

"ہو سکتا ہے۔ تمہیں میری آواز پسند نہ آئے۔ لیکن میں نے صرف انکل کی خیریت پوچھنے کو کال کی ہے۔"

اس نے قصداً بیگانگی کی چادر اوڑھی۔

"وہ اب ٹھیک ہیں۔" ارم نے مدھم لہجے میں بتایا۔

"اللہ کا شکر ہے، ابھی عبید سے بات ہوئی تو۔"

"آپ کی عبید سے بات ہوئی؟" ارم نے بے تابانہ بات قطع کی..... تو وسیم متحیر رہ گیا۔

"آپ لوگوں کی عبید سے بات نہیں ہوئی؟"

"نہیں وہ....." لفظ گم ہو گئے بے بسی سے آنکھیں نم ہو گئیں۔ اب بھائی کی خبر غیروں سے ملے گی۔

"میرے خیال میں آپ لوگوں نے انکل کی بیماری کا نہیں بتایا۔"

"جی....."

"آئی ایم سوری، لیکن میں نے بتا دیا تھا۔" وسیم شرمندہ ہوا۔

"کوئی بات نہیں۔"

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتانا، میں کسی کو کہہ....."

"بہت شکریہ۔"

وہ بات پوری نہیں سنتی تھی۔ سوال کرتا تو جواب میں سوال ہی کرتی۔ اور کال کاٹ دی۔

"کس پتھر سے سر پھوڑ رہے ہو وسیم۔" وہ گہری سانس بھر کے رہ گیا۔

"ارم! کس کی کال تھی۔" وہ ستون کے ساتھ لگی موبائل ہاتھ میں لیے کھڑی تھی ہلکی مسکراہٹ لبوں کے گوشوں میں مچل رہی تھی۔

"وسیم بھائی کی۔"

آسیہ چونکیں وسیم کی کال پر یہ کیسی غیر محسوس سی خوشی تھی۔

"اس کی عبید سے بات ہوئی ہے۔ عبید کو پتا چل گیا ہے۔ اب دیکھنا ابو کی بیماری کا سن کر وہ رک ہی نہیں سکتا۔" تو یہ تھی اس کی مسکراہٹ کی وجہ۔

باہر نکلتے توفیق کے لبوں پر مضمحل سی مسکراہٹ جاگی۔

"ہاں۔ ان کا بیٹا ان کی بیماری کی خبر سن کر کہاں رکے گا۔ آ گیا تو جانے نہیں دوں گا۔"

انہوں نے مصمم ارادہ باندھ لیا۔

☆☆☆

عبید کی بائیک گلی کا موڑ مڑی تھی۔ جب اس نے باپ کو دیکھا۔ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ اس نے اطمینان بھری سانس کھینچی۔

وہ ٹھیک تھے۔

وسیم کی کال سنتے ہی وہ اڑتا ہوا پہنچا تھا۔ وہ کیسے گرے ہوں گے۔ گرتے ہوئے اسے پکارا ہوگا۔ امی کی کیا حالت ہوگی۔ ارم کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ چڑیا جتنا تو دل ہے اس کا۔

بائیک عین گھر کے سامنے رک گئی۔

وہ متذبذب سا بند دروازے کو دیکھنے لگا۔ جائے یا نہ جائے۔ دستک دے یا پلٹ جائے۔

دل ہمک رہا تھا۔ انا راستہ روکے کھڑی تھی۔

پھر راستہ کھل گیا۔ مگر اس گھر کا نہیں ساتھ والا دروازہ کھلا اور ثانیہ نے باہر جھانکا۔ عبید کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔ خوشی سے بڑھ کر غالب احساس تھا کہ کل تک دعوے کرنے والا آج واپس بھی لوٹ آیا تھا۔ عبید اسے دیکھ کر قریب چلا آیا۔

''عبید......''

''تم نے بتایا نہیں، ابو کی طبیعت خراب ہے۔'' ثانیہ ایک لمحے کو لاجواب ہوئی پھر راستہ دے دیا۔

''اندر آجاؤ۔''

عبید متذبذب سا اندر چلا آیا۔

ثانیہ نے دروازہ بند کیا اور مڑ کر عبید کو دیکھ کر دلکشی سے مسکرائی۔

''کتنے دنوں کے بعد تمہیں دیکھا ہے۔''

''تمہیں مجھے بتانا چاہیے تھا۔''

ثانیہ کے ہونٹوں کی دلکشی ماند پڑ گئی۔

''مجھے لگا۔ تمہیں ارم نے بتا دیا ہوگا۔''

''تم اچھی طرح جانتی ہو۔ وہ مجھ سے ناراض ہے۔''

وہ اپنے ابو کی خاطر اسے کٹہرے میں کھڑا کر رہا تھا۔

''عبید! تمہارا نمبر بند تھا۔ جب تک رابطہ ہوا۔ انکل ٹھیک ہو کر گھر آ گئے تھے۔ معمولی سا بی پی ہائی تھا۔ اور سب سے بڑی بات میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔'' آخری جملہ کہتے اس کا لہجہ بھیگ گیا۔

''کوئی سیریس بات ہوتی تو گھر والے تمہیں بتاتے نا...... یہ بہترین موقع تھا۔ تمہیں واپس بلانے کا۔''

اس نے پلکیں جھپکتے چہرہ جھکا لیا تو عبید کو احساس ہوا۔

''سوری یار......'' عبید نے آہستگی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''نہیں تم مجھ سے اس لہجے میں بات کر سکتے ہو۔'' وہ اداس ہوگئی اور عبید بے چین۔

''نہیں۔ کر سکتا...... بس ابو کو گلی میں دیکھا تو جذباتی ہو گیا۔''

''ان سے ملے؟'' ثانیہ نے چونک کر سر اٹھایا۔

عبید نے نفی میں گردن ہلا دی۔ چہرے پر ملال رقم تھا۔

''تمہیں میری خاطر ان سے دور ہونے کی ضرورت نہیں ہے عبید۔ جاؤ گھر چلے جاؤ۔'' ثانیہ نے آہستگی سے ہاتھ چھڑا لیا۔

''ناراض ہو۔''

''نہیں......'' اس نے سر اٹھا کر عبید کو دیکھا۔ ''تم سے خفا ہو کر کہاں جاؤں گی۔''
ثانیہ نے معصومیت سے کہا تو عبید کو ٹوٹ کر پیار آیا۔
''ناراض ہو کر اور بھی پیاری لگتی ہو۔''
''بس رہنے دو۔'' وہ شرما گئی۔
''تم نے رنگ کیوں اتار دی۔''
وہ بس یونہی اوپر آئی تھی۔ بغیر کسی مقصد کے...... بغیر کسی وجہ کے ثانیہ کے گھر میں بھی جھانک لیا۔ اور وہ جھانکنا مہنگا پڑ گیا۔ وہ کئی لمحے بت بنی سامنے کا منظر دیکھتی رہی۔
منظر جو جان دار تھا۔ بھرپور تھا۔ اس میں رنگ تھے۔
''اپنے رشتے میں رنگ کیسے بھرتا ہے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔''
نجانے کیوں سارا منظر دھندلا ہونے لگا۔
وہ ابھی ابھی عبید کی پسند کا کھانا بنا کر آئی تھی۔ دل کہتا تھا وہ آج آئے گا۔ مگر دل نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ساتھ والے گھر میں آئے گا۔
''لوگ سوال کرتے ہیں۔ کیا جواب دوں۔''
''سب ٹھیک ہو جائے گا۔''
''کب ٹھیک ہوگا۔ میں خود کو مجرم محسوس کرتی ہوں۔''
''ہرگز نہیں۔ اس سارے قصے میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ اپنے گھر والوں کا مجرم اگر کوئی ہے تو میں ہوں ثانیہ۔''
اس کے پاس ثانیہ کو دینے کے لیے خوب صورت لفظ تھے۔ اس کی آنکھیں بولتیں تو لہجہ مہکتا تھا۔
ثانیہ پھولوں کی طرح کھلتی گئی۔
ارم کا دل خزاں رسیدہ پتا ہو گیا۔ جو نت نئے خدشوں سے لرز رہا تھا۔
پھر وہ منظر خالی ہو گیا۔
عبید چلا گیا تھا۔
سرشاری ثانیہ دروازہ بند کر کے پلٹی تو نادرہ کو دیکھ کر گڑبڑا گئی۔ نادرہ کا منہ کھلا اور چہرے پر بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ مطلب وہ بہت کچھ سن چکی تھیں۔
''اماں! آپ تو سو رہی تھیں۔''
''سوئی تھی، مر نہیں گئی تھی۔'' نادرہ چیل کی طرح جھپٹیں۔
''پرائے لڑکوں کو بلا کر ملاقاتیں۔ بے شرم بدذات۔ کمبخت! تیرا باپ یہ منظر دیکھ لیتا تو۔''
ارم گہری سانس لے کر پیچھے ہٹ گئی۔
''اماں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ ابو کی خیریت پوچھ۔''
''کیوں اس کی ماں اور بہن مر گئی ہیں۔ جو تجھ سے پوچھ رہا ہے۔''
ماں کی آواز بلند ہو رہی تھی۔
''میرے ساتھ آئیں۔ سب بتاتی ہوں۔'' وہ ماں کو کھینچ کر اندر لے گئی۔ شکر ہے دادی موجود نہ تھیں۔
☆☆☆
ارم کا رونا برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ آسیہ کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ بمشکل چند گھونٹ پانی کے

لے کر اس نے متورم نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔
''عبید آیا تھا امی......''
''عبید آیا تھا؟ کہاں...... کہاں ہے وہ؟'' آسیہ بے تابانہ اٹھیں۔ ماں کا دل تڑپ گیا۔ ارم نے ان کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔
''ہم سے ملنے نہیں آیا تھا۔''
''کیا مطلب؟ کہاں آیا تھا پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو۔'' آسیہ چڑ گئیں۔
''امی! ابو کی بیماری کا سن کر بھی وہ ہم سے نہیں ثانیہ سے ملنے آیا تھا۔'' ارم پھٹ پڑی۔ آسیہ ششدر رہ گئیں۔
ششدر تو نادرہ بھی رہ گئی تھیں۔ جب ثانیہ نے ہر بات کھول کر ان کے سامنے رکھ دی۔
''ارم کے بہانے عبید سے ملنے جاتی تھی۔ ماں مر گئی تھی، جو خود اپنے لیے بر ڈھونڈنے کھڑی ہو گئی۔''
''اماں! مجھ سے یہ جاہلوں جیسی باتیں نہ کریں۔'' ثانیہ بدلحاظ ہوئی۔ ''کوئی فلرٹ نہیں کر رہا وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''
''تو کواڑوں کے پیچھے چھپ چھپ کر ملنے کی کیا ضرورت ہے سیدھی طرح رشتہ بھیجے۔''
''کیسے بھیجے، ان ماں بیٹی نے میرے خلاف محاذ بنا لیا ہے۔'' وہ تڑخ کر بولی۔
''تو اب کیا ہوگا؟ تمہاری پھوپھی نے تو میرے سر پر جوتے برسانے ہیں۔''
''اماں......'' ثانیہ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کیا عبید ویسا نہیں۔ جیسا داماد آپ چاہتی ہیں؟''
ایک لمحے کو نادرہ چپ ہو گئیں۔ پھر ان کی آنکھیں چمکیں۔
''ہاں، وہ ایسا ہی ہے۔''
''وہ رشتہ لائے تو آپ میرا ساتھ دیں گی نا۔'' ثانیہ بہت امید سے ماں کے ہاتھ پکڑے۔
''دل و جان سے، ایسا رشتہ تو نصیب والوں کو ملتا ہے۔ وہ آئیں تو سہی۔ میں تو فٹ سے رشتہ کر دوں گی۔ میری کوئی بیٹی تو سکھی ہو۔'' نادرہ کے دل کی حسرت جاگی۔
''ایسا ہی ہوگا ان شاء اللہ بس ہمیں تھوڑا سا وقت دیں۔'' ثانیہ مسکرائی۔
مسکراہٹ جو پھولوں کی طرح کھلتی۔ اور انہیں کی طرح مرجھا جاتی ہے۔
☆☆☆
اندر کی تپش جسم و جان کو جلانے لگی تھی۔ تو بخار بن کر سامنے آئی۔ وہ کب سے تکیہ میں منہ دیے لیٹی تھی۔ دوا بھی کھائی مگر بخار کم نہ ہو رہا تھا۔
اس کی جلتی پر پیشانی پر مہربان ہاتھ آ رکا۔
''میری بہادر بیٹی۔ اتنی جلدی ہمت ہار گئی۔ یہی تو زندگی ہے۔''
اس کی آنکھوں سے گرم سیال بہہ نکلا۔
''کبھی کبھار دکھ وہاں سے وار کرتے ہیں۔ جہاں سے سوچا بھی نہیں ہوتا۔ کوئی بہت خیال کرنے والا بہت تکلیف دے جاتا ہے مگر اس طرح ہاتھ پیر تو نہیں چھوڑتے بچے۔''
ان کی آواز سوکھے دھانوں پر پانی جیسی تھی۔ سکون دیتی، بہلاتی مگر وہ بہل نہیں رہی تھی۔ عبید کو آنا چاہیے تھا۔ اس کا ذہن اسی ایک نکتے پر مرکوز ہو گیا تھا۔

"آپ نہیں جانتے ابو۔ ہم بہن اور بیٹیوں کی طاقت ہمارا باپ اور بھائی ہوتے ہیں۔ باپ کا ہاتھ سر پہ ہو اور بھائی کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہو تو ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور میرا بھائی......"

اس نے ہچکی روکی۔ توفیق نے اس کے آنسو ہتھیلیوں میں سمیٹ لیے۔

"وہ مجھے دو کوڑی کا کر گیا۔"

"وہ نالائق ہے مگر تم تو میری پیاری بیٹی ہو۔ خبردار جو اس طرح دوبارہ بیمار ہوئیں۔ تم تو ہماری چڑیا ہو۔ ہنستی گاتی ہی اچھی لگتی ہو۔"

"باپ بیٹی کی باتیں ختم ہو گئی ہوں تو کچھ کھا لیں۔" آسیہ سینڈوچز لے کر آ گئیں۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" توفیق صاحب نے خوش گوار انداز میں کہا تو ارم بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جانتی تھی، وہ خود کو چھپا کر اسے بہلا رہے ہیں۔ ورنہ بات اتنی بھی معمولی نہ تھی۔

☆☆☆

جب سے دادی پھوپھو کے گھر سے واپس آئی تھیں۔ عجب ہی ترنگ میں تھیں۔ کبھی گنگناتی کبھی مسکراتیں اور تو اور محلے سے ایک غریب عورت کو بلا کر سارے صحن کی دھلائی بھی کروادی۔ دادی کے تخت پر چادر بھی نئی تھی۔ جو عام طور پر عیدین پر ہی بچھائی جاتی تھی۔

ثانیہ نے صاف ستھرے صحن کو دیکھا۔ کیاری سے اٹھتی گیلی مٹی کی خوشبو کو محسوس کیا۔ پھر مشکوک نظروں سے کھچڑی کھاتی دادی کو دیکھا۔

"سچ سچ بتائیں۔ دادی کون سی کھچڑی پکا کر لائی ہیں۔"

"جو بھی پکاؤں گی تجھ ہی کو کھلاؤں گی۔"

دادی نے پیار سے سبز ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس بالوں کی اونچی سی پونی بنائے صبیح چہرے والی ثانیہ کو دیکھا۔

"ہونہہ میں نہیں کھاتی کھچڑی وچڑی۔" ثانیہ نے ناک چڑھائی۔

"ناشکری نہیں کرتے۔"

"شکر کس بات کا کروں؟ سفید پوش گھر میں پیدا کیا جہاں جوڑ توڑ ہی ختم نہیں ہوتے۔ جہاں شادی کرنا چاہتی ہوں۔ وہاں بھی سو سو رکاوٹیں۔"

ثانیہ کے اپنے ہی شکوے تھے۔ اس سے قبل کہ دادی اسے ٹوکیں۔ شبیر بہت سے شاپر لیے آ گئے۔

"یہ لو پکڑو۔ میری تو انگلیاں رہ گئی ہیں۔"

"ابا! کیا مہینے کا سودا لے آئے ہیں۔" ثانیہ نے شاپر پکڑ کر تخت پر رکھے۔

"میں نے کہا تھا۔ چھوٹا گوشت لانا۔" دادی نے کہا۔

"لایا ہوں اماں۔"

"ابا! اتنا کچھ۔ کوئی مہمان آ رہا ہے۔" شاپر کھول کھول کر دیکھتی ثانیہ چونکی۔

"آپا آ رہی ہیں۔" شبیر ماں کو دیکھ کر مسکرائے۔

"کون سا پہلی بار آ رہی ہیں۔" ثانیہ کے منہ سے پھسلا۔ ہاتھ میں لذیذ کھیر کا ڈبہ تھا۔ مطلب کھیر بھی بنے گی۔

"عزت کیا کرو، بڑی پھوپھی ہے۔" دادی نے نرمی سے ٹوکا۔

"اور کتنی عزت کروں؟" وہ بے دلی سے سامان اٹھانے لگی۔ تو شبیر نے ڈانٹ دیا۔

"خبردار جو فالتو بات منہ سے نکالی۔ آپا آ رہی ہیں۔ اچھا سا کھانا ماں کے ساتھ بنوالو۔ سہیل اور رابعہ نے بھی آنا ہے۔"

"گھر کا کام کرتے تو ان ماں بیٹی کو موت پڑتی ہے۔"

"اچھا چپ۔ ہر وقت سختی نہ کیا کر، بنالیں گی کھانا۔"

"اب سارا ٹبر پتا نہیں کیوں اٹھ کر آ رہا ہے۔"

ثانیہ منہ میں بڑبڑاتی کچن میں چلی گئی۔

"گھر کتنا اچھا لگ رہا ہے۔" شبیر نے صاف ستھرے صحن پر نگاہ دوڑائی۔ پتا نہیں کتنے مہینوں کے بعد دھلائی نصیب ہوئی تھی۔ دادی آہ بھر کے رہ گئیں۔ کہتیں بھی تو کیا۔ اب تو عادت سی ہو گئی تھی۔

ثانیہ نے سامان ماں کے حوالے کیا۔ اور نادرہ کا پارہ ہائی ہو گیا۔

"اتنا بولنے کا فائدہ کیا ہے۔ جب پکانا ہی ہے، پتا تو ہے۔ ابا کی پھپھو سے محبت ہی نرالی ہے۔ اب پیسے نہیں دیے تو یوں راضی کریں گے۔"

"ان کی محبتوں کی کہانیاں عجیب ہیں۔ ایک دفعہ ککر پھٹ گیا۔ اللہ نے تجھے بال بال بچا لیا۔ مگر شوربے نے میرے ہاتھ اور منہ جلا دیا تمہارا باپ فون کر کے کہہ رہا ہے۔ آپا! ککر پھٹ گیا ہے۔ رات کا کھانا ہماری طرف آ کر کھا لیں۔"

ثانیہ کو ہنسی آ گئی۔ "سچ میں اماں......"

"تمہیں ہنسی آ رہی ہے اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ سچ میں جل مرتی۔ ان بہن بھائی کی محبت میرے لیے ہمیشہ امتحان ہی بنی رہی۔"

شاید اسی لیے مجھے ارم اور عبید کی محبت سے ڈر لگتا ہے۔ تب ہی اس کے موبائل پر فرخ کا میسج آ گیا۔

"تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔"

"کیوں! تم میرا رشتہ لے کر آ رہے ہو۔" یہ سراسر طنز تھا۔

"اف! اتنی بے صبری۔" آگے ہنستے لڈیاں ڈالتے ایموجی تھے۔ اس نے ٹیڑھے منہ کا ایموجی بھیجتے سوچا۔

"آؤ تو سہی، منہ کی کھاؤ گے۔"

"کون ہے؟" نادرہ نے اسے موبائل پر مصروف دیکھا تو چونک گئیں۔

"کوئی نہیں، فرخ ہے۔ پوچھ رہا ہے۔ کیا پک رہا ہے؟"

اس نے لاپروائی سے بتایا۔ رابعہ نے بتایا تھا کہ فرخ نے گھر میں رشتے کی بات کی ہے۔ مگر اس نے ماں سے ذکر نہیں کیا تھا۔ اُسے عبید کے بارے میں بتانا تھا...... بتا دیا...... باقی رہا فرخ تو اُسے پھپھو نے خود ہی قابو کر لینا تھا۔

"ابھی تو دماغ پک رہا ہے...... کلیجہ جل رہا ہے۔ بھوکے ندیدے لوگ...... جب بھی کچھ اچھا کھانے کو دل چاہے، یہاں آ! مرتے ہیں۔"

ثانیہ ایک دم چونکی...... چھٹی حس نے گویا ہلکی سیٹی بجائی وہ ابھی آتی ہوں کہہ کر کمرے میں آ گئی۔

رابعہ کا نمبر ملایا تو وہ اُسی پر برس پڑی......

"بیلنس ختم ہو جائے تو تم لوگ کال ہی نہیں کرتے......"

"اچھا بابا! اب کر لی نا، تم بتاؤ۔ کیا چل رہا ہے۔"

"مجھے کیا پتا...... بند کمرے میں صلاح مشورے ہوئے ہیں۔ اب خاموشی ہے...... لگتا ہے بات ٹھپ

ہوگئی ہے۔ تب ہی سکون ہے۔''

''اتنی جلدی...... کوئی ہنگامہ تو ہوتا......'' ثانیہ نے منہ بنالیا۔

''بہت تخریبانہ سوچ ہے تمہاری......'' رابعہ چڑ گئی۔

''پھر تم لوگ کس خوشی میں آرہے ہو۔''

''ہم آرہے ہیں مجھے تو پتا نہیں۔'' رابعہ متحیر رہ گئی۔

''بی بی اپنے حجرے میں نکل کر باہر کی خبر لو...... ابا تو یہاں گویا بارات کا کھانا پکوا رہے ہیں۔'' ثانیہ نے کہہ کر کال کاٹ دی۔

''اس بات کا کیا مطلب ہے......'' رابعہ نے حیرت سے سوچا پھر کچھ سوچ کر پھوپھو کے کمرے میں آگئی...... پہلی نظر ہی سامنے رکھی مٹھائی کی ٹوکری پر گئی...... فرخ ماں کے پاس بیٹھا تھا اور وہ برس رہی تھیں۔

''وہ کلو کہاں تھا۔ ٹوکری کیوں اٹھا لائے ہو؟''

''کوئی پاس ہونے کی مٹھائی نہیں جا رہی...... میری منگنی کی مٹھائی ہے......'' وہ فرخ تھا۔ اپنی من مانی کرنے والا۔

(منگنی) رابعہ ٹھٹھکی......

''وہ تمہاری دفعہ کتنی مٹھائی لے کر گئی تھی......'' آصفہ نے رابعہ سے پوچھا تو وہ گڑبڑا گئی۔

''آپ تو لے کر نہیں گئی تھیں۔ ابا نے منگوائی تھی......''

''ہاں تو ایک ہی بات ہے۔'' آصفہ سٹپٹا گئیں۔

''اماں! انگوٹھی لے لی......''

''بڑی کمائیاں میرے ہاتھ پر رکھتا رہا ہے۔ جو میں انگوٹھی بنواؤں۔ تیری تنخواہ میں تو تیرے اپنے فیشن ہی پورے نہیں ہوتے۔''

''اماں! کیا بات کرتی ہیں۔ انگوٹھی کے بغیر منگنی کیسے ہوگی؟ دونوں کی جرح جاری تھی اور رابعہ ہکا بکا......

''حد ہے، انگوٹھی کے بغیر منگنی نہیں ہوگی۔''

''کس کی منگنی......'' رابعہ سے رہا نہ گیا تو بے اختیار پوچھ بیٹھی......

''تم بہنوں کی سازشیں کامیاب ہو رہی ہیں......''

سوال گندم تو جواب چنا آیا۔

''اب وہاں آجا کر ایسی باتیں نہ شروع کر دینا......'' فرخ نے فوراً ٹوکا...... ساتھ ہی پھر آصفہ نے دھموکا جڑ دیا......

''ہونے والی سسرال کی اتنی فکر......''

''ہونے والی سسرال......'' رابعہ کا دل ڈوبنے لگا......

''آپا! تیار ہو جائیں۔ ثانیہ کے لیے میرا رشتہ لے کر جانا ہے۔'' فرخ نے مسرت سے بتایا اور رابعہ کا دل سچ میں ڈوب گیا۔

''کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ ابھی تو رشتہ بھی نہیں گیا...... آپ منگنی کی تیاری کر رہے ہیں۔''

''میں رشتہ لے کر جاؤں گی تو بھلا انکار تھوڑی کرے گا......'' آصفہ نے گردن اکڑائی۔

اور انکار [illegible] وہاں [illegible] کر کے بیٹے کو اس طرح قابو کرتیں۔

("یا اللہ! بند کمرے میں یہ سب ہوتا رہا اور میں بے خبر ہی رہی")

''پھوپھو! ایسا کچھ نہیں ہے۔ مجھے نہیں لگتا۔ ثانیہ اس رشتے کے لیے مانے گی۔'' رابعہ بوکھلا گئی...... پھوپھو کیسے مان گئیں کایا کیسے پلٹ گئی...... دادی کون سی گیدڑ سنگھی سنگھا گئی تھیں۔

''کیوں؟ میرے بیٹے میں کس چیز کی کمی ہے...... خواہ مخواہ کے نخرے...... جانا ہے تو تیار ہو جاؤ......'' آصفہ نے تڑخ کر کہا۔

''میری پیاری آپا!'' فرخ اُٹھ کر پاس آیا۔ ''سب کچھ ثانیہ کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ آپ جلدی سے تیار ہو جائیں۔ ورنہ اماں کو غصہ آجائے گا۔''

رابعہ نے تیار کیا ہونا تھا۔ اس کے تو ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ تب ہی کمرے میں بھاگی تو باہر نکلتے سہیل سے ٹکرا گئی......

''کیا ہو گیا ہے؟''

''جلدی سے اپنا موبائل دیں......'' کہتے کہتے افراتفری میں خود ہی اُس کے ہاتھ سے موبائل جھپٹ لیا۔

''سمجھ میں نہیں آرہا۔ فرخ کو اتنی بڑی غلط فہمی کیوں ہوئی۔ اب اُدھر سے انکار ہوگا تو پھوپھو نے انا کا مسئلہ بنا لینا ہے۔'' وہ ساتھ ساتھ نمبر ملا رہی تھی۔

''انکار کیوں ہوگا؟ اماں نے ماموں کو بتا تو دیا ہے۔'' رابعہ نے تحیر سے سر اٹھا کر سہیل کو دیکھا۔

''ابا کو پتا ہے؟''

''ہاں، ان کی مرضی سے ہی رشتہ جا رہا ہے۔''

رابعہ تحیر سے جامد ہو گئی۔

دوسری طرف سے بزی ٹون سنائی دے رہی تھی۔

☆☆☆

''خود آتی تو سچ سچ کر آتی...... پر یہاں تو بالا ہی بالا سارے فیصلے ہو جاتے ہیں اور ماں باپ کو بعد میں پتا چلتا ہے۔''

سب کے درمیان بیٹھی آصفہ غصے سے بول رہی تھیں۔ نادرہ نے حیران ہو کر رابعہ کو دیکھا...... تیر کمان سے نکل چکا۔ اب تو نشانہ ہی لگنا ہے...... اُس نے چپ سادھ لی...... شبیر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

دادی نے قدرے چڑ کر بیٹی کو دیکھا...... آصفہ کو منانے میں سارا کردار اُنہیں کا تو تھا۔

''فرخ، سہیل جیسا بیبا بچہ نہیں ہے۔ ضد کرو گی تو ہاتھ سے نکل جائے گا۔ پھر پچھتاؤ گی اور جھگڑا کیا ہے...... پہلے بھی تو ایک بھتیجی بس رہی ہے۔''

''وہ رابعہ جیسی بالکل نہیں ہے۔'' آصفہ نے دہائی دی۔

''فرخ بھی سہیل جیسا نہیں ہے...... اسے ثانیہ جیسی لڑکی ہی قابو کر سکتی ہے...... جیسا اُس کا مزاج ہے وہی لگام ڈال سکتی ہے۔''

''اُس کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی لگام میں ڈالے گی۔''

''لو...... تمہارے ہوتے یہ ممکن ہے۔'' دادی ہنسیں تو آصفہ نے فخر سے گردن اکڑا لی۔

''یہ تو ہے۔''

''کوئی پرائی آئی، بیٹے کو لے کر الگ ہو گئی؟ تو کیا کرو گی؟ یہاں بھائی کے گھر کے ساتھ اور بھی تعلق مضبوط ہو جائے گا۔ میں آج مر جاؤں تو تمہارا بھائی کے سوا اور کون سا رشتہ باقی ہے...... تمہارے قریب رہتا

ہے، تمہارے دکھ سکھ کا سانجھی ہے۔"
دادی کی فہم فراست...... اقوال زریں...... ملکۂ جذبات بن کے انہوں نے آصفہ کو خوب بلیک میل کیا...... آصفہ کے ذہن نے بھی جوڑ توڑ کرلیا۔ ثانیہ کے لیے ڈالی گئی ساری کمیٹیاں اُن کی سلامی میں فرخ کے لیے موٹر سائیکل مانگ لوں گی۔ دوسری بیٹی بھی آ گئی تو نادرہ کی شہ رگ پر انگوٹھا آجائے گا۔ چوں بھی نہیں کرسکے گی۔
رہی سہی کسر فرخ نے اُن کے پیر پکڑ کر نکال دی......
"لو جی! بیٹا تو ابھی سے بے دام غلام بن رہا تھا......" رہی ثانیہ، تو اُس کے کس بل وہ خود ہی نکال دیں گی۔
"اماں! بس ایک بار میری مان لیں...... ساری زندگی آپ کی مانوں گا۔" اُترا فرخ میسنا بنا منمنا رہا تھا۔
"پکی بات ہے۔"
"قسم لے لیں۔"
"ٹھیک ہے۔" آصفہ نے فیصلہ کر ہی لیا۔ "پر وہ اس گھر میں اُسی طرح رہے گی جس طرح رابعہ رہتی ہے۔"
"آپا سے بھی زیادہ خدمت کرے گی۔ مجھ سے لکھوا لیں۔"
"چلو...... اب میری مالک میرے گھر آئی ہے تو انکار تھوڑی کرسکتی ہوں۔"
دادی خوشی سے نہال ہو گئیں۔ دونوں بچوں کی خوشی پوری ہو رہی تھی اور کیا چاہیے (اُن کے خیال میں ثانیہ اور فرخ ایک دوسرے کے عشق میں مرے جا رہے تھے۔)
اسی وقت شبیر کو فون کر کے رائے لی گئی...... اندھا کیا چاہے دو آنکھیں...... بیٹی کا بوجھ سر سے اُتر رہا تھا۔
"آج کے دور میں اچھے لڑکے ملتے کہاں ہیں...... پھر ثانیہ کی زبان درازی تو سارے خاندان میں مشہور ہے...... گھر میں بہن ہوں، مجھے ہی اپنے بھائی کا بوجھ بانٹنا ہے...... پھر خود تمہاری لڑکی بھی تو یہی چاہتی ہے۔ فرخ نے خود بتایا ہے کہ وہ دونوں۔"
چلو قصہ ہی ختم
میاں بیوی راضی، تو کیا کرے گا قاضی۔ پھر اپنا مارے گا تو چھاؤں میں ہی ڈالے گا......
اپنی زبان درازی کے ہاتھوں ثانیہ نے مار تو کھانی ہی تھی...... اس بات کا انہیں بھی یقین تھا تو بس قصہ تمام شد...... ہنسی خوشی فون پر ہی رشتہ طے ہو گیا۔ باقی رہیں نادرہ...... تو بے وقوف عورتوں سے مشورہ کون کرتا ہے...... وہ ویسے ہی آصفہ اور فرخ کے خلاف تھیں...... کوئی بات نہیں ثانیہ انگوٹھی پہنے گی تو ماں کو بھی پتا چل جائے گا......
ہر طرف تسلی ہی تسلی...... اطمینان ہی اطمینان تھا......
"بس بھی کرو...... وقت بدل گیا ہے...... اب آج کل کے بچے ہم سے کہیں سیانے ہیں۔" دادی نے لبرل پن دکھاتے بیٹی کو خود پر قابو رکھنے کی تنبیہ آنکھوں آنکھوں میں ہی کی۔
ثانیہ آئی تو آصفہ نے لپک کر پکڑا اور پہلو میں بٹھا لیا۔ اُس نے جز بز ہو کر رابعہ کو دیکھا...... وہ شتر مرغ کی طرح گردن ریت میں دبائے بیٹھی تھی۔
[illegible]"

سہیل نے جلدی سے گاڑی سے مٹھائی کی ٹوکری نکال کر میز پر رکھی...... نادرہ اور ثانیہ نے چونکتے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ آصفہ نے اپنے بیگ سے لال دوپٹہ نکال کر ثانیہ کے سر پر ڈال دیا۔
نادرہ نے بوکھلا کر شبیر کو دیکھا۔
انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
نادرہ ہکی بکی ہو گئیں۔
"وہ آ...... آپا! یہ کیا کر رہی ہیں؟......"
"فرخ کا رشتہ کر رہی ہوں ثانیہ کے ساتھ......" آپا نے لاپروائی سے بتایا۔
"اتنی اچانک۔ ہم نے تو کوئی مشورہ بھی نہیں کیا...... وسیم بھی نہیں ہے۔" نادرہ حواس باختہ ہو گئیں...... ثانیہ ہلکا سا مسکرائی اور اُس کی مسکراہٹ سے رابعہ ڈر گئی۔
"جنہوں نے مشورے کرنے تھے، آپس میں کر لیے۔" آصفہ نے جتایا۔
"تم چپ کرو...... میں اس کا باپ بیٹھا ہوں نا فیصلے کرنے کے لیے۔" شبیر نے غصے سے ٹوکا۔
آصفہ نے پرس کھول کر اندر سے پانچ ہزار کا نوٹ نکالنا چاہا مگر ہمت نہ ہوئی۔ دو ہزار نکال کر ثانیہ کی مٹھی میں دے دیے۔
"لو بھئی مبارک ہو۔"
"مبارک ہو آپا۔"
دادی نے ثانیہ کی بلائیں لینی شروع کر دیں۔
ثانیہ نے ہاتھ کھولا اور اُس پر رکھے دو ہزار دیکھے۔ اتنی سستی تھی وہ۔
سہیل نے مٹھائی کی ٹوکری کھولی۔ "رابعہ! سب کا منہ میٹھا کرواؤ۔"
رابعہ کی اٹھنے کی ہمت نہ ہوئی...... وہ کبھی نادرہ تو کبھی ثانیہ کو دیکھ رہی تھی۔ آصفہ نے لڈو اٹھا کر ثانیہ کے منہ میں ٹھونسنا چاہا......
"لو منہ میٹھا کرو، من کی مراد بر آئی ہے۔"
ثانیہ نے لب بھینچ لیے۔
"لو بھئی، اب بہن بھائی کا رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔ اللہ حاسدوں کی نظر سے محفوظ رکھے۔" دادی خوشی خوشی گلاب جامن کھانے لگیں۔
"ارے بھئی۔ کھا بھی لو کہ من میں لڈو زیادہ پھوٹنے لگے ہیں۔" آصفہ نے اپنے تئیں مذاق کیا تھا...... ثانیہ نے آہستگی سے ہاتھ پیچھے کیا۔
"سوری پھوپھی! مجھے لڈو پسند نہیں...... اور یہ والے تو بالکل بھی نہیں۔"
ثانیہ کی سرد شفاف آواز سب کو چونکا گئی۔
"شگن کے لڈو ہیں...... کیوں بدشگونی کر رہی ہو۔" دادی نے ٹوکا۔
"کیسا شگن؟ ابا! مجھے فرخ سے شادی نہیں کرنی۔"
اس نے ہاتھ میں پکڑے روپے آصفہ کی گود میں پھینک دیے۔
"تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔"
ایسی جرأت۔ ایسی بے باکی۔ شبیر کا دماغ گھوم گیا۔
"ابا! وہ مجھے پسند نہیں۔"

ثانیہ نے دوپٹہ اُتارا اور کھڑی ہوگئی...... مگر آصفہ نے دانت پیستے اُس کا بازو دبوچا اور دوبارہ بٹھالیا۔

''وہ جو پسند ہے، وہ بتادو۔''

''پاگل فرخ کو بتاتی رہی۔ تجھے اُس سے بنورتی رہی۔ اب وہ پسند نہیں۔'' وہ غم وغصے اور احساسِ شکست سے پاگل ہونے لگیں۔

''پھوپھو! خواہ مخواہ الزام مت لگائیں...... میں نے فرخ سے کبھی ایسی بات نہیں کی۔'' بات صاف اور واضح ہوگئی۔

''پر...... میں نے خود تجھ سے پوچھا تھا......'' دادی بوکھلائیں۔

''کب؟''

''اُس دن جب انگوٹھی کی بات ہوئی۔''

''فرخ کا نام لے کر پوچھا تھا؟''

دادی گم صم...... نام تو نہیں لیا تھا۔ بس گمان تھا۔ خیال تھا اور اپنے گمان پر یقین بھی تھا۔

''تو اُسے اتنی بڑی غلط فہمی کیوں ہوگئی۔'' سہیل کو غصہ آنے لگا۔

''اُسی سے پوچھیں۔

''ہائے میں مرگئی...... ایسی بے شرمی...... میرے بھیا! تمہاری اولاد تمہارے ہاتھوں سے نکل گئی ہے۔'' آصفہ نے سینہ پیٹ لیا احساسِ توہین سے شبیر کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

''بول کون ہے؟ کون ہے جس کے پیچھے لگ کر انکار کررہی ہے...... کس کو تاڑ رکھا ہے......'' آصفہ نے آسمان سر پر اُٹھالیا۔

''بس کریں آپا۔'' نادرہ بے اختیار بولیں۔

''کیا بس کروں؟ سب تمہاری تربیت ہے آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ جب بیٹی یہ گل کھلا رہی تھی۔ بس بہت تماشا ہوگیا۔'' آصفہ نے پاؤں نیچے اتارے، جوتے اڑسے۔

''مجھے گھر بلا کر بے عزت کیا ہے۔ اب ساری زندگی تمہاری دہلیز پر قدم نہ رکھوں گی۔''

''میں اس بے ہدایتی کا گلا دبادوں گا۔'' شبیر۔ اٹھے تو نادرہ تڑپ کر درمیان میں آگئیں۔

''بس کرو شبیر۔''

''پراں مر۔'' شبیر نے انہیں دھکا دے کر ہٹایا۔

''بس رہنے دو یہ مار کٹائی...... میری جھولی تو انکار سے بھر گئی۔ گھر بلا کر بے عزتی کی۔ میرے پلے تو کچھ نہیں رہا۔'' وہ پھپھک پھپھک کر رونے لگیں۔

''کوئی انکار نہیں ہوا۔'' شبیر بپھرے، لال انگارہ آنکھوں سے ثانیہ کو دیکھا...... ایک لمحے کو ثانیہ دہل سی گئی۔

''میں نے رشتہ پکا کیا ہے اور اب میں ہی کہہ رہا ہوں۔

''اب منگنی نہیں نکاح ہوگا...... فرخ کو بلائیں آپا......!''

سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا......

ثانیہ کی جرأت ہوا ہوئی۔ بے تحاشا خوف نے اُس کے وجود کو جکڑ لیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

"شگفتہ او شگفتہ! یہ گڈو نہیں آیا ابھی تک؟ ادرک لانے والا تھا میں سالن بنانے سے بیٹھی ہوں۔" راشدہ بیگم نے زور زور سے آوازیں لگائیں تو کچن میں کام کرتی شگفتہ اور کمرے میں اپنی چھ ماہ کی بچی کو سلاتی نازش جلدی سے باہر آئیں مبادا ان کی ساس کو کوئی ضروری کام تو نہیں؟

ساس کی بات سن کر شگفتہ بغیر کوئی جواب دیے دوبارہ اندر چلی گئی۔ اور کچن میں جا کے دل کی بھڑاس نکالی۔

"ماموں کی پنشن ہے اور گڈو بھی ان کی ہتھیلی پہ پیسے رکھتے ہیں پھر بھی مامی دس روپے کی ادرک کے لیے بھی گڈو کا انتظار کر رہی ہیں، عجیب ناانصافی ہے۔ سب کام گڈو ہی کرے۔"

جبکہ نازش مسکراتے ہوئے اندر چلی گئی، جانتی تھی اب ساس اور بہو دونوں اندر اندر کڑھیں گی لیکن اسے کسی چیز کی پریشانی نہیں تھی کیونکہ اس کے

سحرش خان

میاں تو سب سے چھوٹے تھے۔

رات کو شہباز عرف گڈو واپس آیا تو شگفتہ سے رہا نہ گیا اور میاں سے گلہ کر ہی دیا۔

"آپ نے کیا ٹھیکہ لے رکھا ہے پورے گھر کا؟ دوسرے دو بھائی بھی تو ہیں نا کیا ان کی کوئی ذمہ داری نہیں کہ دس روپے کی ادرک کے لیے بھی آپ کا انتظار کیا جاتا ہے؟"

گڈو نے پل بھر کے لیے بیوی کو دیکھا جس کی

آنکھوں میں شکوہ تھا ناراضی تھی۔

"بس جب وہ نہیں سمجھتے تو مجھے کرنا پڑتا ہے نا۔ وہ غافل رہ سکتے ہیں میں نہیں۔ تمہارے اور تمہارے بچوں کے اخراجات بھی تو پورے ہو رہے ہیں نا؟"

گڈو نے مسکرا کر بات بدل دی اور ساتھ ہی تکیہ سیدھا کر کے آنکھیں موند لیں۔

شگفتہ سمجھ گئی ہمیشہ کی طرح اس کا میاں بحث سے بچنے کے لیے سوتا بن گیا ہے۔

☆☆☆

اگلے دن شگفتہ نے فجر کی نماز کے لیے گڈو کو اٹھایا تو وہ نہ اٹھا۔ شگفتہ نے ہاتھ لگا کر چیک کیا تو بخار سے جسم جل رہا تھا۔ فوری پٹیاں کیں لیکن بخار نہ اترا، گھر میں موجود پیناڈول بھی دی لیکن طبیعت نہ سنبھلی۔ شگفتہ نے ساس اور دونوں دیوروں کو بھی بتایا۔ بھائیوں نے کھڑے کھڑے حال پوچھا اور اپنے اپنے کام پر چل دیے۔ ساس بھی تھوڑی دیر کو بیٹھیں پھر چلی گئیں۔ شگفتہ کا دل جلا لیکن وہ خاموش رہی۔ ڈاکٹر نے ابھی دیر سے بیٹھنا تھا تو گڈو کے لیے یخنی بنانے لگی۔ دیکھا تو کافی چیزیں نہیں تھیں۔ چادر اوڑھی ساس کو بتایا اور بازار چلی گئی۔ واپس آئی اور آ کر یخنی چڑھا دی۔ بخار کی شدت کم تھی لیکن پورا اترا نہ تھا۔

"تم خود بازار گئی تھیں؟" گڈو کو ذرا ہوش آیا تو شگفتہ سے سوال کیا کیونکہ وہ اسے چادر اتارتے دیکھ چکا تھا۔

"جی وہ امی نے چھوٹی کو پکڑا ہوا تھا تو میں پھر خود ہی چلی گئی۔" شگفتہ نے دیور کی چھ ماہ کی بچی کا نام لیا۔

اچھا..... کہہ کر گڈو سوچ میں پڑ گیا۔ شگفتہ نے کریم سے گاڑی منگوائی اور گڈو کو ہسپتال لے گئی۔ راشدہ نے کہا کہ میں ساتھ چلتی ہوں لیکن گڈو نے منع کر دیا۔ ڈاکٹر نے گڈو کو آرام کی ہدایت کی۔ ڈاکٹر نے دس دن کا ریسٹ لکھ کر دے دیا۔ گڈو کا جنرل اسٹور بھی تھا اور ساتھ واسا میں جاب بھی، اس لیے دس دن سن کر وہ پریشان ہو گیا لیکن شگفتہ نے تسلی دی اور کہا کہ دونوں بھائی اسٹور کچھ دن دیکھ لیں گے آپ ریسٹ کریں۔ دفتر سے تو چھٹی لے لی، اس کی پریشانی نہ تھی لیکن اسٹور مسلسل تیسرے روز بھی بند رہا تو گڈو نے حامد اور ناصر دونوں کو باری باری کہا کہ تھوڑی تھوڑی دیر بیٹھ جایا کریں لیکن دونوں بھائیوں نے فوری منع کر دیا کہ دفتر سے تھک ہار کر آنے کے بعد اسٹور نہیں کھول سکتے۔ گڈو خاموش ہو گیا۔ یہ تک نہ کہہ سکا کہ میں بھی تو دفتر کے بعد ہی کھولتا ہوں اور پھر گھر کے بل اور کچن اسی کی کمائی سے چلاتا ہوں۔

دونوں بھائی جو چھوٹے ہونے کا خوب فائدہ اٹھاتے تھے اب بیماری کے دنوں میں نظر ہی نہ آتے۔ گڈو کا بخار اترا۔ گیارہویں دن جا کے اس نے اسٹور کھولا۔ گھر واپس آنے پر ماں نے بجلی کا بل اور سودے کی لسٹ یہ کہتے ہوئے تھما دی۔

"شکر ہے تو ٹھیک ہو گیا ورنہ گھر کیسے چلتا۔ اخراجات منہ پھاڑ کے کھڑے ہوتے ہیں۔ تیری بھابھی کے بھائی کی بھی شادی آ رہی ہے کہہ رہی تھی کہ گڈو بھائی سے کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے۔"

گڈو نے لسٹ پکڑی ایک نظر دیکھی اور ماں کو تھما دی۔

"امی! اس میں صرف اپنا، میرا اور میرے بیوی بچوں کا سامان لکھیں۔ وہ دونوں اب چھوٹے نہیں ہیں۔ اپنا بوجھ خود اٹھائیں۔"

گڈو کے لہجے میں کچھ تھا جس نے راشدہ بیگم کو ہمیشہ کا راگ الاپنے سے روک دیا ورنہ انہوں نے یہ ہی کہنا تھا۔

"تو بڑا ہے وہ چھوٹے ہیں، تیرا باپ بھی نہیں اب تیرا فرض ہے ان کی مدد کر۔"

کھڑکی میں کھڑی شگفتہ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ دس دن کا بخار تھا اتر تو گیا لیکن عقل دے گیا۔

☆☆

روحیلہ خان
محبتوں کے رشتے

"آفس سے آتے ہوئے نمکو اور سموسے ضرور لیتے آئے گا۔"

فرحانہ بیگم نے داؤد صاحب کو جاتے جاتے ہانک لگائی تھی۔ آج پھر کچھ لوگ بیلا کو دیکھنے آ رہے تھے۔ جب سے اس نے گریجویشن مکمل کیا تھا، یہ کوئی بارہویں فیملی تھی جو اسے دیکھنے آ رہی تھی، مینا آپی نے بڑے وثوق سے بتایا تھا کہ لڑکے کی ماں بہت بیمار ہے اور وہ لڑکیاں دیکھ دیکھ کے تھک چکے ہیں لہٰذا بیلا کو پسند کرنے کے چانسز زیادہ تھے۔ بیلا کون سی ہانیہ عامر کی طرح گوری چٹی اور خوب صورت تھی کہ لڑکے والے ایک نظر دیکھتے ہی فدا ہو جاتے، کتنی بار پارلر سے تیار ہو کر بھی دیکھ لیا۔ صاف جواب یا طویل خاموشی۔

"بیلا! بیٹا خالہ جی نے جو تسبیح پڑھنے کو بتائی تھی وہ یاد سے پڑھ لینا۔" فرحانہ بیگم پہ ایک ٹینشن سی سوار تھی۔

"قسم لے لیں امی! نجانے کتنے وظیفے پہلے بھی پڑھے تھے پھر بھی ایک نے بھی ہامی نہ بھری۔ بس میں نے سوچ لیا ہے کہ عامر کی باری میں ایک ایک کر کے بدلہ لوں گی۔" بیلا کلس کر بولی۔

"ہاں جیسے عامر تمہاری پسند کے انتظار میں تو بیٹھا ہے ناں۔ اس نے پہلے ہی اپنی کلاس فیلو حنا کو پسند کر رکھا ہے۔"

نائلہ نے مسکراتے ہوئے بتایا تو بیلا کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"میں ہرگز بھی اس بلگرامی کی بچی سے اپنے بھائی عامر کی شادی نہیں ہونے دوں گی۔"

"اے بی بی! خدا خدا کر کے یہ رشتہ آ رہا ہے پہلے تم تو اپنی سسرال کو نکلو......" فرحانہ بیگم کو اس وقت ان دونوں بہنوں کی گفتگو سے بڑی کوفت محسوس ہو رہی تھی۔

"رمضان آنے والے ہیں آپی! اگر اس پارٹی کی آنکھوں میں کچھ پڑھ کر پھونک دو تو ہو سکتا ہے کہ اس عید پر تمہارا ہی ڈولا اٹھ جائے۔"

نائلہ ہنسی تھی۔

"دیکھا امی! یہ ہے بڑی بہن کی عزت اس کی نظر میں......" بیلا روہانسی سی ہو رہی تھی۔ فرحانہ بیگم نجانے کیوں اس بار بہت بوکھلا رہی تھیں۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

"نائلہ! جا کر دیکھو تو کس کا فون ہے۔"

"امی جان! کیا سارے کام میں ہی کروں اور یہ محترمہ تو ابھی سے اپنے آپ کو دلہن سمجھ بیٹھی ہیں۔ پیروں میں مہندی لگی ہے ناں ان کے۔"

نائلہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھی جبکہ بیلا واٹس ایپ کے پیغامات میں خالہ جی کا وہ خاص رشتے میں برکت والا وظیفہ دیکھنے لگی۔

"جی پھوپھو! ابھی بلاتی ہوں۔" نائلہ کچھ دیر ریسیور کان پر لگائے سننے کے بعد بولی تو فرحانہ بیگم ٹھٹک کر رہ گئیں۔

"اے لو یہ کیا...... یہ نجمہ بی بی کیسے ٹپک پڑیں اچانک۔"

اس سے پہلے کہ وہ نائلہ کو اشارے سے منع کرتیں نائلہ گلا پھاڑ کر بولی۔

"امی! نجمہ پھوپھو آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔"

نجمہ سے ان کی کوئی خاص نہیں بنتی تھی اور جب سے اماں جان کو وہ اپنے گھر لے کر گئی تھیں معاملہ بالکل ہی چوپٹ ہو گیا تھا پھر اس وقت جب کہ بیلا کو دیکھنے کچھ لوگ آ رہے ہیں، ایسے میں نند جی کی نحوست ان کا ماتھا ٹھنکا۔

"ہاں نجمہ! کیسی ہو۔" انہوں نے زبردستی خوش اخلاقی دکھانے کی کوشش کی لیکن دوسرے ہی پل ان کا بلڈ پریشر شوٹ ہونے لگا تھا۔

"لیکن نجمہ......"

"ہاں ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو...... پر سنو تو۔ ارے تمہارے بھیا لیکن...... اور پھر کھٹ سے فون رکھ دیا گیا۔ ان کے چہرے کی اڑی رنگت دیکھ کر دونوں بہنیں ماں کے نزدیک آ گئیں۔

"امی! کیا ہوا خیریت تو ہے ناں۔"

بیلا کا دل گھبرانے لگا تھا خدا جانے نجمہ پھوپھو نے ایسا کیا کہہ دیا تھا۔

"امی! کیا ہوا خدارا کچھ تو بولیں۔" نائلہ نے اپنی ماں کے سرد ہوتے ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری دادی جان آ رہی ہیں۔" یہ ایک انکشاف تھا یا بم۔

"کیا۔" دونوں بہنوں کے منہ بے ساختہ کھل گئے۔

"پر کیوں؟ کیسے، میرا مطلب ہے کہ کب......" بیلا ہونق بنی گڑبڑا رہی تھی۔

"ابھی اسی وقت۔" فرحانہ بیگم نے نائلہ کو اشارے سے پانی لانے کا کہا۔

"پر امی! آپ نے بتایا نہیں انہیں کہ۔"

"کیسے بتاتی نجمہ نے بتانے کو چھوڑا ہی کیا تھا تمہارے پھوپھا جی کا لاہور میں ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

"خیریت سے تو ہیں ناں پھوپھا جی......" نائلہ نے پانی کا گلاس ان کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"ارے خیریت ہی ہے انہیں کیا ہونا ہے ایویں اپنی ماں کو ہمارے گلے ڈالنے کا بہانہ ہے اور کیا۔"

انہوں نے پانی کا گلاس منہ سے لگایا اور غٹا غٹ پی ڈالا۔

"امی جان! دادی یہاں ایزی فیل نہیں کرتیں۔" نائلہ کو شاید برا لگا تھا۔

"وہ ایزی فیل کریں یا نہ کریں پر مجھ سے اب ان کے چونچلے نہیں اٹھائے جاتے سہارے کے بنا وہ چل پھر نہیں سکتیں۔ اور پل میں تولہ پل میں ماشہ ہو جاتی ہے ان کی طبیعت، بھئی ہم نہیں کر سکتے ان کی خدمت گزاری۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ امی! دادی اب کافی بوڑھی ہو چکی ہیں نظر بھی نہیں آتا انہیں لیکن نجمہ پھوپھو کے گھر رہنے سے ان کی صحت بہت اچھی ہو گئی ہے۔" نائلہ سے پھر رہا نہ گیا۔

"تو کیا میں تمہاری دادی کو کھانے کو نہیں دیتی تھی۔ بھئی جو گھر میں پکتا ہے وہ ہی سب کو کھانا پڑتا ہے۔ اب اس میں نخرے کیسے اور پھر اگلے ہفتے سے رمضان شروع ہو رہے ہیں، بھئی بڑے جھمیلے ہیں تمہاری دادی کے۔"

فرحانہ بیگم بری طرح جھنجلا رہی تھیں۔ کس مشکل سے انہوں نے وہ دن گزارے تھے۔ جب وہ بیاہ کر اس گھر میں آئی تھیں تب قمر النساء بیگم نے بڑے چاؤ سے ان کا استقبال کیا تھا۔ اس وقت یہ سب کچھ بہت اچھا لگتا تھا۔ ایک پڑھی لکھی ساس کی بہو بن کر انہیں فخر سا محسوس ہوتا۔

قمر النساء ایک نجی اسکول میں برسوں سے انگریزی پڑھا رہی تھیں۔ جب ان کے شوہر کا انتقال ہوا تھا اس وقت نجمہ اور داؤد بہت چھوٹے تھے، گھر کے حالات نے انہیں نوکری کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس طرح انہیں یہ فائدہ حاصل ہوا تھا کہ دونوں بچوں کی اسکول کی فیس معاف ہو گئی تھی کیونکہ وہ اسی اسکول کی ایک قابل ٹیچر تھیں۔ ان ہی حالات میں داؤد نے اور نجمہ نے اپنی تعلیم مکمل کی اور قمر النساء اپنے دونوں بچوں کی شادیوں کے فرض سے سبکدوش ہوئیں۔

قمر النساء کی زندگی کا معمول تھا، صبح سویرے فجر کی نماز سے فارغ ہو کر ناشتے کی تیاری میں مصروف ہو جاتیں دوپہر کو کیا پکانا ہے۔ کچا پکا تیار کرتیں تاکہ اسکول سے واپس آنے کے بعد ہانڈی کو تیار کر لیں۔ یہاں تک کہ بہو کے آنے کے بعد بھی یوں ہی رہا۔

فرحانہ بیگم کے ذمے رات کا کھانا اور شام کی چائے تھی اس دوران بیلا اور عامر ہو گئے تب داؤد نے ماں کو پڑھانے سے روک دیا کیونکہ اب ان کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی اور یہ ہی وہ وقت تھا جب فرحانہ بیگم پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ قمر النساء ایک چڑچڑی، بد دماغ اور نخریلی قسم کی ساس ہیں۔

نجی اسکول والے اپنی قابل استانی کو چھوڑنے پر راضی نہ تھے لیکن داؤد کو اپنی ماں کی صحت عزیز تھی،

نجمہ بیاہ کر اپنے گھر چلی گئی تھی۔ قمر النساء شوگر کی مریضہ کیا ہوئیں بیماریوں کی جیسے پوٹ کھل گئی تھی۔ بلڈ پریشر، جسم میں درد اور نجانے کیا کیا بہانے گھڑ لیے تھے انہوں نے، یہ خیال فرحانہ بیگم کا ہی تھا اور پھر اپنے شوہر نامدار کو بھی انہوں نے ہم خیال بنا لیا۔ ایک سو بیس گز کے گھر کے کسی کونے میں ان کے لیے جگہ نہ بنی تو اسٹور روم میں ان کا بستر لگا دیا گیا۔

قمر النساء پہلے بھی کم گو تھیں، انہیں تو اپنے شاگردوں کو انگریزی گرامر پڑھانے میں مزا آتا تھا پر اب تو جیسے ان کے منہ پر تالے پڑ گئے تھے۔ تنخواہ کا سلسلہ کیا رکا جیسے ایک دنیا رک گئی ہو۔ ان کی ذات میں اس قدر کیڑے ہیں، وہ خود بھی اس سے انجان تھیں، پوتا پوتیاں بھی ماں کی سنگت میں دادی سے دور ہو گئی تھیں۔

نجمہ کے میاں کی پوسٹنگ کراچی میں ہوئی تو اس سے رہا نہ گیا اور وہ اپنی ماں کو اپنے گھر لے گئی تب فرحانہ بیگم نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ بلا سر سے ٹلی۔

☆☆☆

ٹیکسی گیٹ پر آ کر رکی تھی، نجمہ پھوپھو اپنی پیاری امی جان کو سہارا دیتی گیٹ تک لائیں۔

"خدا خیر کرے، مینا آپی نے کس قدر یقین دلایا تھا کہ اس بار بات بن جائے گی پر یہ نجمہ نحوست۔"

فرحانہ بیگم دل ہی دل میں نجمہ بیگم کو کوسنے دے رہی تھیں۔

"بھابھی! یہ اماں جان کی دوائیں ہیں۔ شاپر میں ان کے دودھ کے ڈبے ہیں روزانہ ناشتے کے بعد بنا کر دینا ہے۔ آپ کو دودھ کی کوئی پریشانی نہیں ہوگی ساری دوائیں مہینہ بھر کی ہیں۔ میں تو ان شاء اللہ ہفتہ بھر میں ہی لوٹ آؤں گی۔ میری نمرہ کے امتحانات بھی ہونے والے ہیں پر اس کے پیپانے بڑی چاہ سے بچی سے ملنے کی فرمائش کی تھی اب کیسے رد کر لی۔" نجمہ بیگم اپنی داستان سنانے لگیں جس کو فرحانہ دوری رکھنا نہ لیکن لازما سنا رہی۔

"میں نے کہہ دیا ہے کہ اپنی پوسٹنگ بھی کرالیں کراچی میں اماں جان کے بغیر تو ان کا بھی دل نہیں لگتا وہاں عادت ہو گئی ہے ناں اور پھر ہماری اماں جان تو اس قدر پڑھتی پڑھاتی ہیں کہ گھر میں برکتیں نازل ہوتی رہتی ہیں۔ نجانے کتنے ہزار تو دن بھر میں درود شریف پڑھ لیتی ہیں۔"

وہ قمر النساء کی شان میں قصیدے پڑھ رہی تھیں اور فرحانہ بیگم کا دل جل جل کر کباب ہوئے جا رہا تھا۔ النساء بیگم سفید کپڑوں میں ملبوس چپ چاپ بیٹھی تھی۔

"ارے نجمہ! تمہاری ٹرین کا وقت کیا ہے۔"

فرحانہ بیگم نے جان چھڑانے کو کہا۔

"ارے ہاں بھابھی! بس ایک گھنٹہ رہ گیا ہے۔ ابھی تو گھر جا کر کتنا سامان سمیٹنا ہے۔ پتا نہیں میرے پیچھے عمار کیا حشر کرے گا گھر کا ابھی بچہ ہی تو ہے۔"

"ارے نجمہ! بچہ کہاں ہے۔ اکیسویں میں لگ رہا ہے۔"

"جی بھابھی پھر بھی پہلی بار اکیلا اس پر گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں ناں۔ اوپر والی شرمین بھابھی کو تو کہہ دیا ہے کہ میرے بچے کے کھانے پینے کا خیال رکھیے گا۔"

فرحانہ بیگم کی نظریں بار بار گھڑی کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ چار بج چکے تھے، لڑکے والوں نے ساڑھے پانچ بجے تک آنے کا کہا تھا، نجمہ کی باتیں زہر لگ رہی تھیں۔

"پھوپھو! پانچ بجے کی ٹرین ہے آپ کی۔" بیلا نے بھی یاد دہانی کرائی تو جان چھوٹی۔

"اچھا اماں! چلتی ہوں اپنا خیال رکھیے گا یہ سب آپ کے لیے ہیں کوئی بات ہو کوئی چیز چاہیے ہو۔ بھابھی جان ہیں ناں اور داؤد بھائی سے تو میں خود فون کر کر کے پوچھتی رہوں گی۔"

جاتے جاتے بھی انہوں نے دس پندرہ منٹ لگا دیے تھے ان کے جانے کے بعد فرحانہ بیگم کی جان میں جان آئی۔ "شکر ہے خدا کا۔" قمر النساء بستر پر دراز چھت کو گھور رہی تھیں۔

☆☆☆

لڑکے والے اچھے خاصے معقول تھے، لڑکا ایم بی اے کر کے کسی باہر کی کمپنی میں ملازم تھا۔ بس ایک چھوٹی بہن تھی اس کی بھی منگنی طے تھے۔ عید پر بیٹی کے ساتھ وہ بیٹے کے فرض سے بھی سبکدوش ہونا چاہتے تھے لڑکے کے والد کا اپنا کاروبار تھا۔ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ لڑکے کے والدین بہت خوش اخلاق تھے۔ لڑکا بھی اچھا لگ رہا تھا اور کیا چاہیے تھا انہیں۔ فرحانہ بیگم کے تو خوشی سے ہاتھ پیر پھولے جا رہے تھے۔

"خدایا! یہاں بات بن جائے۔" ان کے دل سے دعا ابھری، تب ہی بیلا چائے کی ٹرالی لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

"یہ میری بیٹی ہے بیلا، اسی سال اس نے بی اے کا امتحان دیا ہے۔"

فرحانہ بیگم کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا لیکن لڑکے کی ماں کے چہرے کے رنگ دھیمے پڑ گئے تھے۔ معمولی نین نقش کی بیلا شاید انہیں پسند نہیں آئی تھی۔ ان کے سینے پر جیسے کسی نے بوجھ سا رکھ دیا ہو۔

"ہائے میری بچی کے نصیب۔"

بے ساختہ ان کا دل رو دینے کو چاہا۔ وہ جان چکی تھیں کہ مینا آپی کے سارے وثوق پچھلی گیارہ پارٹیوں کی طرح ہوا میں اڑ چکے ہیں۔ وہ جیسے پتھر کی مانند جم سی گئی تھیں کس قدر ارمان پال لیے تھے ان چند دنوں، چند لمحوں میں...... بیلا نے ان سب کو چائے اور لوازمات بڑے سلیقے سے سرو کیے۔

"بیلا......"

قمر النساء کی آواز گونجی تو انہیں لگا جیسے کسی ویرانے میں ڈھیر ساری چمگادڑیں اپنے شکار پر جھپٹی ہوں۔

"ان کی ہی تو نحوست ہے۔" دل غصے سے دھاڑا تھا۔

"بیلا جاؤ تمہاری دادی بلا رہی ہیں۔" انہوں نے ٹھنڈے ہوتے لہجے میں کہا۔

"جی امی......!" بیلا بھی مہمانوں کے رویے پہچان چکی تھی دل تو اس کا بھی ٹوٹا تھا۔

"آپ کی ساس آپ کے ساتھ رہتی ہیں کیا۔" لڑکے کی ماں نے سوال داغا جو انہیں اس وقت نہایت بے تکا محسوس ہوا۔

"جی۔" انہوں نے گہری سانس بھرتے ہوئے جواب دیا پتا نہیں کیوں ان کا دل بڑی زور سے دھڑکا تھا۔

"میں ان سے مل سکتی ہوں کیا۔" لڑکے کی ماں کا اصرار بڑا عجیب سا لگا۔

"جی بالکل آیئے۔" وہ مرے دل سے اٹھیں۔ فرحانہ بیگم انہیں لے کر چلیں۔ شکر تھا کہ نجمہ بیگم نے قمر النساء کو ڈھنگ کے کپڑے پہنائے تھے۔ تسبیح ان کے ہاتھ سے گر پڑی تھی شاید اسی لیے انہوں نے بیلا کو پکارا تھا۔

"ارے یہ تو مس قمر النساء ہیں ناں۔" لڑکے کی ماں کے چہرے پر خوشی کا ایک رنگ سا ابھرا تھا۔

"جی جی آپ جانتی ہیں انہیں یہ......" ابھی ان کی بات ادھوری ہی تھی کہ لڑکے کی ماں نے اچک لی۔

"جی جی کیوں نہیں ......ارے یہ تو ہماری انگریزی کی ٹیچر تھیں۔ اس قدر پیار سے پڑھاتی تھیں کہ سب سے برا لگنے والا مضمون بھی اچھا لگنے لگا تھا۔ مس! آپ نے مجھے پہچانا نہیں میں فرحت ہوں فرحت شاہ یاد ہے آپ کو میں اکثر آپ کو پھول پیش کرتی تھی میں وہی پھول والی فرحت ہوں۔"

فرحت شاہ گھٹنوں کے بل بیٹھی بڑی عقیدت سے اپنی استانی کو تک رہی تھیں۔ قمر النساء کی بوڑھی نظروں میں استعجاب در آیا اور پھر ان کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔

"فرحت! اب بھی ابو بن ادھم کی سمری یاد ہے ناں۔"

"جی مس! اب بھی یاد ہے۔ خدا تک پہنچنے

کے لیے ان کے بندوں کے دل سے گزرنا پڑتا ہے۔"

وہ خوشی اور سرشاری دیکھ کر فرحانہ بیگم دنگ تھیں ماضی کے دریچے کھل چکے تھے ایک شاگرد اپنی استانی سے مل رہی تھی ایسے جیسے وہ کوئی بہت چھوٹی سی بچی ہو۔

"فرحت! پھر کب آؤ گی؟" قمر النساء نے پوچھا۔

"اب تو آتی جاتی رہوں گی میں، آپ کی پوتی کو اپنی بہو جو بنانا ہے اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو۔"

فرحت شاہ کے اس جملے نے فرحانہ بیگم کے خون میں اس قدر گرمی پیدا کر دی تھی کہ انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ گرم ہوتا خون ان کے کانوں اور آنکھوں سے بہہ نکلے گا۔

"بیٹا کہاں ہے؟ اسے تو بلاؤ......" قمر النساء کے لب ملے۔

"جی مس! ابھی بلاتی ہوں......ارسلان بیٹا! ذرا ادھر تو آنا۔" ماں کے بلانے پر مودب بیٹا فوراً آیا۔ ہینڈسم سا ارسلان قمر النساء کو بھا گیا۔ اس نے بڑے ادب سے جھک کر انہیں سلام کیا تو انہوں نے اس کی بلائیں لے ڈالیں۔

"اچھا ہے، مجھے تو قبول ہے بچہ، پر فرحانہ سے تو پوچھ لو، داؤد سے پوچھ لو بھئی، یہ بیلا کے ماں باپ ہیں۔"

"ارے اماں جی! بس آپ نے کہہ دیا تو ہمارے لیے وہ پتھر پر لکیر ہو گیا۔ مجھے بھی قبول ہے۔"

فرحانہ بیگم کا دل چاہا کہ اپنی ساس کے ہاتھ چوم لیں اور ان پہ صدقے واری جائیں۔ سب کچھ اتنی جلدی بلکہ ایسے ہوا کہ وقت کا پتا ہی نہ چلا اور عید کے تیسرے دن نکاح طے پا گیا۔

☆☆☆

نجمہ: ہم کو لوٹنے میں ہفتہ بھر بھی نہ لگا تھا، اپنی ماں کی یاد انہیں جلد ہی کراچی کھینچ لائی تھی۔ ان کے شوہر کا ٹرانسفر بھی کراچی ہو گیا تھا۔

"ارے نجمہ! یہ کیا تم نے تو ہفتہ بھر بعد آنے کا کہا تھا ناں...... جلدی لوٹ آئیں۔"

"بھابھی! اماں کو لینے آئی ہوں بس جلدی جلدی میں، ہو سکتا ہے کہ کل ہی روزہ ہو جائے۔ سارے کام پھیلے ہوئے ہیں، مجاہد نے تو ذرا پرواہ نہ کی کسی کام کی، کہنے لگے بھئی میری برکتوں والی ساس کو تو لے آؤ۔ پھر سارے کام کرتی رہنا۔"

"لیکن نجمہ! میں اماں جان کو اب تمہارے ساتھ کیسے بھیج دوں۔" فرحانہ بیگم کے اس جواب پر نجمہ بیگم ششدر رہ گئی۔

"کیا کہہ رہی ہیں بھابھی......"

"سچ کہہ رہی ہوں مجھے تو پتا ہی نہ تھا کہ میری اماں جی اس قدر بابرکت ہیں۔ ان کے قدموں تلے تو جنت ہے اور اب میں یہ جنت تمہیں نہیں لوٹا سکتی۔ اماں جان اب اسی گھر میں رہیں گی۔" فرحانہ بیگم کی آواز آنسوؤں میں رندھ گئی تھی۔

"پر بھابھی!" نجمہ بیگم نے کچھ کہنا چاہا۔

"مجھے معاف کر دو نجمہ! پہلے ہی میں اس قدر گناہ کر چکی ہوں اب اور نہیں کر سکتی۔ میرے گھر کی برکتیں تو تمہارے گھر میں تھیں اور میں وظائف میں انہیں ڈھونڈ رہی تھی۔ ہاں تمہارا اور مجاہد کا جب دل چاہے اماں جان سے آ کر مل سکتے ہو۔"

داؤد صاحب فرحانہ بیگم کے پیچھے کھڑے مسکراتے ہوئے اپنے آنسو پونچھ رہے تھے۔ اگر آج چاند نظر آئے گا تو بازار جا کر بہت کچھ خریدنا ہے۔ فرحت شاہ کی فیملی کے لیے اور ان کی استانی کے لیے بھی۔ فضا میں سائرن کی آواز گونجنے لگی تھی کل پہلا روزہ ہوگا۔ ان کی زندگی کا خوب صورت ترین بابرکت روزہ۔

☆☆

قرۃ العین خرم ہاشمی

سانولی سی محبت

اپنے گھر کے باہر، چوڑی اور وسیع گلی میں کھڑی نئی نکور بائیک کو رگڑ رگڑ کر دھوتے ہوئے ارسلان اونچی آواز میں گنگنا رہا تھا، جب اپنی دھن میں تیز قدم اٹھاتی، سبزی لے کر واپس آتی ماریہ کی نظر اس پر پڑی۔ جینز کے دونوں پائنچے چڑھائے، آدھے بازوؤں کی سرخ رنگ کی ٹی شرٹ میں اس کا گورا رنگ چمک رہا تھا۔

"کاکے! ڈر تو تمہیں محلے کی شریف اور نیک بیبیوں کا بھی نہیں ہے، جو کسی مجبوری کے تحت گھر سے باہر سودا سلف لینے نکلتی ہیں اور تمہارے جیسے کل کے بچے گلا پھاڑ کر، اپنی پیدائش سے پہلے کے گانے بھی ایسے گاتے ہیں جیسے گلوکار کی روح ان میں حلول کر گئی ہے۔"

ارسلان کے گورے رنگ اور گانے نے اس کے دل کے کسی تار میں اچانک کرنٹ سا دوڑا دیا تھا۔ اب یہ کرنٹ ہی بجلی بن کر سامنے والے کی شامت لانے میں کارگر ثابت ہوا تھا۔ سرف کے جھاگ میں کھوئے، ارسلان نے چونک کر ماریہ کی طرف دیکھا۔ ماریہ کا گھر ان کے گھر کے بالکل ساتھ تھا۔

"ماریہ باجی! سوری مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ آپ آ رہی ہیں ورنہ۔"

ارسلان نے معصوم چہرہ بناتے ہوئے کہا تو، اپنے گھر کا بیرونی تالا کھولتے ہوئے ماریہ نے بے زار نگاہ اس پر ڈالی۔

"ورنہ کیا؟ پھول نچھاور کرنے تھے؟" ماریہ نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

"نہیں، ورنہ میں اسی گانے کے جواب میں یہ دوسرا گانا گا تا نا!

سانولی سلونی سی محبوبہ، تیری چوڑیاں شرنگ کرکے"

ارسلان نے لہک لہک کر گاتے ہوئے شرارت بھری نگاہ، ماریہ کے سرخ ہوتے چہرے پر ڈالی تھی۔

"ارسلان کے بچے! ابھی بتاتی ہوں۔"

ماریہ کو کوئی اور چیز نظر نہیں آئی تو اس نے سبزی کے تھیلے میں سے، ایک آلو نکال کر ارسلان کا نشانہ لے کر پھینکا۔ ارسلان تو فوراً ایک طرف ہو گیا اور آلو اس کے گھر کے دروازے سے باہر نکلتے، جاوید کے سینے پر لگا اور وہ دل تھام کر رہ گئے۔

ارسلان گھبرا کر باپ کی طرف بڑھا۔

"ابا! آپ ٹھیک ہیں؟ یہ میزائل جیسا آلو، سامنے والی ماریہ باجی نے پھینکا ہے مگر آپ فکر مت کریں۔ میں اسی آلو کے چپس بنا لوں گا۔"

ارسلان نے جلدی سے ماریہ کی شکایت لگاتے ہوئے فخریہ انداز میں کہا۔ تو جاوید نے گہری سانس لے کر ماریہ کی طرف دیکھا جو اب اپنے گھر کا دروازہ کھول چکی تھی۔

آج بھی تمہارا ہر نشانہ میرے دل پر لگتا ہے۔ جاوید نے دل میں سوچا مگر ان لفظوں کو زبان پر نہیں لا سکے کہ نقص امن کا اندیشہ تھا۔

"تمہیں یہی وقت ملا تھا بائیک دھونے کا؟ چلو اندر۔ تمہاری ماں کب سے آوازیں دے رہی ہیں۔"

جاوید نے بیٹے کو جھاڑا کیونکہ ساتھ والے گھر کا دروازہ بہت زور سے ان کو دیکھ کر ہمیشہ کی طرح بند کیا گیا تھا۔

"ابا! آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے میں چھوٹا بچہ ہوں اور گلی میں کنچے کھیلتے ہوئے پکڑا گیا ہوں۔"

ارسلان نے خشک کپڑے سے بائیک کو صاف کیا اور فخریہ انداز میں باپ کی طرف دیکھا۔

"بیٹا! کبھی اپنے منہ کو بھی اسی طرح رگڑ رگڑ کر اور محنت سے دھو لیا کرو۔" جاوید نے منہ بنا کر کہا۔

"ابا! کیا ضرورت ہے صابن اور پانی کو ضائع کرنے کی۔ جب وراثت میں اتنا گورا اور چمکتا رنگ ملا ہے۔" ارسلان نے ذرا اتراتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! اسی گورے رنگ نے تمہاری کالک کو چھپایا ہوا ہے۔ قسم سے اگر ایک بار تمہیں تیزاب یا فنائل سے دھوئیں تو کئی ٹن مٹی نکلے گی۔ ہٹو راستے سے۔"

جاوید نے اسے جھاڑتے ہوئے ایک طرف کیا اور پھر ماریہ کے گھر کی طرف دیکھ کر وہ آہ بھری، جو ناکام عاشق کے دل سے نکلتی ہے۔

"کبھی ہم میں، تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔" جاوید نے دھیمے قدم اٹھاتے ہوئے خود کلامی کی تھی۔

☆☆☆

"کیا کہا؟"

چھوٹے قد کی، فربہی مائل سرخ و سفید رنگ کی مالک زرینہ، بیٹے سے کچھ دیر پہلے کا قصہ سنتے ہی تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھنے کی ناکام کوشش میں بس تھوڑا سا ہل کر رہ گئی تھی۔ اس کا روز بہ روز بڑھتا وزن اور پھر اس پر سستی کی عادت۔

"اماں! ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ ثبوت کے طور پر یہ آلو دیکھ لیں۔ یہ آلو ہی ماریہ باجی نے سیدھا ابا کے دل پر مارا۔ شکر ہے ابا کا ہارٹ فیل نہیں ہوا۔ ورنہ آپ کو یہ سرخ چوڑیاں توڑنی پڑ جاتیں۔"

ارسلان نے فکرمندی سے کہا تو زرینہ نے جھک کر اپنی چپل اٹھائی اور تیزی سے ارسلان پر برسانے لگی۔

"بے شرم! باپ کے بارے میں ایسا کہتے ہوئے تیرا دل نہیں کانپا۔"

زرینہ نے ارسلان کو اس کے سخت لفظوں کا احساس دلایا تو وہ شرمندہ ہو گیا۔ ہر بات اور ہر رشتہ مذاق کے لیے نہیں ہوتا ہے۔

"اچھا! غلطی ہو گئی۔ اب چلیں بھی۔" ارسلان نے جلدی سے کہا۔

"کہاں؟" زرینہ نے چونک کر پوچھا۔

"ماریہ باجی سے لڑنے۔" ارسلان نے جلدی سے کہا۔

"میں کیوں کسی سے لڑنے جاؤں؟ اور یہ تم اسے باجی کس خوشی میں کہتے ہو؟ میری ہم عمر ہی ہوگی۔"

زرینہ نے منہ بنا کر کہا تو ارسلان نے غور سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ بھلے ان کو رنگ آج بھی چلکتا تھا مگر سانولی سلونی سی ماریہ، اپنی اسمارٹنس اور نک سک سے رہنے کی وجہ سے اس کی ماں سے بہت چھوٹی لگتی تھی۔

"مگر اماں! وہ تو آپ سے بہت چھوٹی لگتی ہیں۔ ویسے اگر آپ انہیں کچھ نہیں کہیں گی تو وہ یہ سمجھیں گی کہ آپ کو اپنے شوہر کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔" ارسلان نے جلدی سے کہا تو زرینہ سوچ میں پڑ گئی۔

"اچھا، اگر میں اس کے گھر نہیں جاؤں بلکہ اپنے ٹیرس پر کھڑے ہو کر لڑوں تو۔" زرینہ نے ڈرے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"آپ اتنا ڈرتی کیوں ہیں ان سے؟"

ارسلان نے پرسوچ انداز میں سوال کیا۔

"ڈرتی تو نہیں! بس مجھے اس کے گھر جانا اچھا نہیں لگتا۔" زرینہ نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔

"اچھا! فی الحال یہ بھی بہت ہے۔" ارسلان نے سر ہلا کر کہا۔

"ویسے تم کیوں محلے کی روایتی عورتوں کی طرح لڑائی، جھگڑے کروانے میں ماہر بنتے جا رہے ہو؟"

زرینہ نے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے کو لتاڑا تو وہ سر کھجاتے ہوئے مسکرا دیا۔

"اور جو ماریہ باجی ہر وقت ہمارے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ وہ آپ کو نظر نہیں آتا ہے؟" ارسلان نے منہ بنا کر کہا۔

"پتا نہیں کیا بولتے رہتے ہو۔ چلو۔" زرینہ نے نگاہیں چرا کر کہا تھا۔ ارسلان ماں کو دیکھ کر رہ گیا۔

☆☆☆

...تو تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے شوہر کو آلو مارنے کی۔"

زرینہ نے بہادر بنتے ہوئے اونچی آواز میں کہا تو اپنے صحن میں کھڑی، ماریہ نے سر اٹھا کر ساتھ والے گھر کے ٹیرس کی طرف دیکھا تھا۔

"میری جرات دیکھنی تھی تو میرے گھر آ کر بات کرتی نا!!" ماریہ نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ زرینہ نے گھبرا کر ارسلان کی طرف دیکھا۔

"اماں! ڈر کیوں رہی ہیں! وہ اتنی دور سے کیا کر لیں گی؟"

ارسلان نے ماں کا حوصلہ بڑھایا تو زرینہ نے تھوک نگل کر سامنے، کمر پر ہاتھ رکھ کر غصے سے گھورتی ماریہ کو دیکھا تھا۔

"اونہہ! میں تمہاری جیسی کے منہ لگنا پسند نہیں کرتی ہوں۔" زرینہ نے اکڑ کر کہا۔

"میری جیسی کے برابر آنے کی پہلے اپنی اوقات بناؤ۔ پھر کہنا۔ ویسے تمہارے بیٹے کو اس بات کا بے کر!!"

ماریہ کہتے ہوئے معنی خیز انداز میں رکی۔

زرینہ گھبرا کر پیچھے ہوئی۔

"چلو ارسلان! پاگل عورت ہے۔ کچھ بھی بولتی رہتی ہے۔" زرینہ جلدی سے ارسلان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے واپس اندر لے گئی۔

"اماں! آپ آخر ماریہ باجی سے اتنا ڈرتی کیوں ہیں؟ کون سا راز ہے جو انہیں معلوم ہے اور وہ آپ کی کمزوری ہے۔" ارسلان نے چڑ کر کہا

"کوئی راز نہیں ہے۔ تم عورتوں کی طرح فضول باتوں میں دلچسپی لینے کے بجائے، اپنے کام پر توجہ دو۔ پڑھائی تم نے مکمل کی نہیں، ہنر کوئی سیکھا نہیں۔ اب اگر باپ نے اسٹیشنری کی دکان کھول دی ہے تو اس پر توجہ دو۔" زرینہ نے غصے سے کہا اور کچن میں چلی گئی۔

"کچھ تو ہے بیٹا ارسلان، پہلے ماریہ باجی کے منہ سے وہ راز اگلوانا ہے جو میرے والدین کی کمزوری بن چکا ہے۔" ارسلان نے چپکے سے تہیہ کیا تھا۔

☆☆☆

"ماریہ بھابی! یہ آپ سے اس بچے کی بات کیوں کر رہی تھیں؟"

کمرے میں نو سالہ گڑیا کے ساتھ کھیلتی، رعنا نے جب باہر سے آتا شور سنا تو جلدی سے کمرے کی کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ ماریہ واپس آئی تو رعنا نے جلدی سے پوچھا۔

"اونہہ! یہ مجھ سے بات کرنا ہی نہیں چاہتی ہے وہ تو اس ارسلان کے بچے کا نے پر ہر بار چلی آتی ہے اور منہ کی کھا کر واپس جاتی ہے۔"

ماریہ نے منہ بنا کر کہا۔

"مگر انہیں آپ سے مسئلہ کیا ہے؟ یا ارشد بھائی کی وجہ سے؟" رعنا نے اپنے بڑے بھائی کا نام لیتے ہوئے پوچھا۔

"ارشد کون سا یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ کویت میں رہ کر وہ کسی کو کیا کہہ سکیں گے۔ انہیں مجھ سے ہی مسئلہ ہے۔ خیر تم چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ آگے کیا سوچا ہے؟ بی اے میں تو بہت اچھے نمبر لیے ہیں۔"

ماریہ نے مسکرا کر اپنی لاڈلی اور عزیز نند کی طرف دیکھا تھا۔ جو کچھ دن پہلے گاؤں سے رہنے کے لیے یہاں آئی تھی۔

"بھابھی! اماں تو ہرگز نہیں چاہتی کہ میں آگے پڑھوں مگر ابا اور ارشد بھائی کی خواہش ہے کہ میں ایم اے تو ضرور کروں۔ اسی لیے تو انہوں نے مجھے گاؤں شہر بھیجا ہے تاکہ یہاں کسی اچھی یونی ورسٹی میں داخلہ لے سکوں۔"

رعنا نے نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ماریہ نے بہت غور سے رعنا کی طرف دیکھا۔ دبلی، پتلی تیکھے نین نقش اور سانولے رنگ روپ کی مالک رعنا، بلاشبہ دلکش اور پیاری لڑکی تھی۔ کبھی کبھی ماریہ کو رعنا میں اپنی جھلک نظر آتی تھی۔

"ہاں ٹھیک ہے میں قاریہ سے کہوں گی تمہارے ساتھ یونی ورسٹی چلی جائے گی۔" ماریہ نے دو گلیاں چھوڑ کر رہنے والی اپنی سہیلی کی چھوٹی بہن کا نام لیتے ہوئے کہا۔

"جی ٹھیک ہے۔" رعنا نے جلدی سے سر ہلایا تھا۔ چار سالہ گڑیا کے رونے کی آواز سن کر ماریہ تیزی سے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

عجیب سا منظر اس کی بند آنکھوں کے سامنے تیزی سے گزر رہا تھا۔ ہر طرف سفید دھوئیں جیسے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اڑتے ان سفید بادلوں میں بارش کے قطرے نہیں تھے بلکہ ان بادلوں میں سے مسلسل چوڑیوں کے کھنکنے کی ہلکی سی آواز آ رہی تھی۔ وہ حیران تھا کہ بادل کیوں چھن چھن کر رہے ہیں۔ حیرت سے چاروں طرف دیکھا، وہ اچانک چونکا۔ ان سفید بادلوں کے درمیان اڑتی لال چنری نے اس کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی تھی۔ وہ بے اختیار سدھ بدھ بھلائے سفید بادلوں میں چھپتی، کبھی نظر آتی سرخ چنری یا کے پیچھے بھاگنے لگا۔ کچھ دور جا کر اس نے کالے لباس میں ملبوس کسی لڑکی کی ہلکی سی جھلک دیکھی اور اس لڑکی کے نازک اور سلونے ہاتھوں میں سرخ رنگ کی چوڑیاں دیکھی تھیں۔ ارسلان کے دیکھتے دیکھتے ہر طرف تیزی سے سفید بادل چھا گئے۔

ارسلان ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ قریبی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

ارسلان کا دل عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔

"اماں کہتی ہیں کہ فجر کے وقت دیکھا خواب سچا ہوتا ہے۔ مگر میرا خواب ہے کیا؟" ارسلان عجیب سی الجھن کا شکار ہو کر سوچنے لگا۔

جب کوئی سرا اسے سجھائی نہیں دیا تو نماز پڑھنے کے لیے اٹھ گیا۔

☆☆☆

جدوں ہولی جئی لیندا میرا نام۔۔!!

ماریہ مگن انداز میں، کپڑے دھوتے ہوئے سریلے انداز میں گاتی ہوئی مسکرا رہی تھی۔

"ماریہ!!" وہ خیالوں میں کھوئی میں مگن تھی، باریک اور مدھم آواز پر اتنے زور سے اچھلی کہ ہاتھ میں پکڑے کپڑے چھپاک سے پانی کے بھرے ٹب میں گرے اور پانی اچھل کر ماریہ کو بھگو گیا۔ اسے بھگا

دیکھ کر اپنی چھت کی منڈیر سے چھپ کر دیکھتے، جاوید کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ماریہ نے کڑے تیوریوں سے منڈیر کی دیوار کو گھورا۔

"ابھی بتاتی ہوں۔"

ماریہ نے مشین کا بزر چلایا اور پانی کا نل کھول کر تیزی سے منڈیر کی طرف بڑھی۔ مشین چلنے کی آواز کے ساتھ بہتے پانی کا تیز شور تھا۔ اس لیے جاوید کو اندازہ نہیں ہوسکا کہ ماریہ چلتے ہوئے دیوار کے قریب آگئی ہے۔ وہ کچھ دیر کے بعد دوبارہ اس کو پکارنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اچانک جاوید کو اپنے اوپر پانی جیسی کوئی چیز گرنے کا احساس ہوا تو اس نے تیزی سے اپنے سر سے منہ تک ہاتھ پھیرا اور جیسے ہی اپنا ہاتھ آنکھوں کے سامنے کیا تو چونک گیا۔ اس کا ہاتھ نیلے رنگ میں رنگ چکا تھا۔ جاوید اچھل کر سیدھا کھڑا ہوا تو منڈیر کی دیوار، اس کے دراز قد کے سامنے چھوٹی پڑ گئی۔ منڈیر کے دوسری طرف نیل کی خالی بوتل ہاتھ میں پکڑے اطمینان سے ماریہ کھڑی تھی۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" جاوید نے اپنے چہرے، ہاتھوں اور کپڑوں پر نیل کے نشان دیکھے تو جھنجھلا کر بولا۔

"اور جو تم نے میرا نام لینے کی جرات کی ہے!"

ماریہ نے تندخو لہجے میں پوچھا تو جاوید کھسیانا ہو گیا۔

"میں نے کب تمہارا نام لیا ہے؟" جاوید نے اکڑتے ہوئے کہا۔

"اونہہ! مجھے سب یاد ہے۔ تمہاری ہمیشہ سے عادت تھی چھت کے کسی کونے میں چھپ کر، مجھے کام کرتا دیکھنے اور پھر پکارنے کی۔"

ماریہ نے منہ بنا کر کہا تو جاوید بے ساختہ مسکرا دیا۔

"میری عادت یاد ہے، میری محبت نہیں!" جاوید نے مسکرا کر کہا۔

"تم خود کو جاوید شیخ سمجھ کر پوز مارنا بند کرو، دوبارہ اس لہجے میں بات کی تو اگلی بار نیل نہیں، تیزاب پھینکوں گی۔"

ماریہ نے سخت انداز میں کہا اور تیزی سے پلٹ گئی۔

"تم کبھی مجھے معاف بھی کرو گی؟"

جاوید نے مایوسی سے پوچھا۔ ایک لمحے کے لیے ماریہ کے قدم سست ہوئے مگر وہ تیزی سے شیڈ کے نیچے رکھی مشین کی طرف بڑھ کر، اپنا ادھورا کام مکمل کرنے لگی۔ اسی وقت رعنا اور گڑیا ہنستے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئیں۔ رعنا نے علی کو گود میں اٹھایا ہوا تھا۔

"ماریہ بھابھی! میں کپڑے تار پر ڈال دیتی ہوں۔"

رعنا نے جلدی سے علی کو چھت پر موجود چارپائی پر بٹھایا اور ٹوکری میں دھلے کپڑے تار پر ڈالنے کے لیے جیسے ہی مڑی تو اس کی نظر جاوید پر پڑی۔ وہ چونک گئی۔ جاوید اسے دیکھ کر فوراً چھت کے دوسری جانب چلا گیا۔ رعنا نے ایک نظر نیلوں نیل ہوئے جاوید اور دوسری خاموشی سے کپڑے دھوتی ماریہ پر ڈالی تھی۔

"کپڑے ماریہ بھابھی دھو رہی ہیں اور رنگ ساتھ والے انکل کو لگا ہوا ہے؟"

رعنا نے حیرانی سے سوچا اور پھر کندھے جھٹک کر کپڑے تار پر ڈالنے لگی۔

☆☆☆

"رعنا! تمہارا داخلہ ایم اے اردو میں ہو گیا ہے، بس اب تم یونی ورسٹی جانے کی تیاری کرو اور میری چند باتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔"

گڑ والے چاول کی بھاپ اڑاتی پلیٹ رعنا اور گڑیا کے سامنے رکھتے ہوئے ماریہ نے سنجیدگی سے کہا تو رعنا نے چونک کر بھابھی کی طرف دیکھا تھا۔ جو علی کو گود میں لے کر چاول کھلا رہی تھی۔

"جی بھابھی!" رعنا نے پریشانی سے پوچھا۔

اسے اندازہ تھا کہ ماریہ اسے لڑکوں سے دور رہنے، ماں باپ کی عزت کا خیال رکھنے کا کہے گی۔ اس لیے وہ ہمہ تن گوش تھی۔

"میں نے بھی یونی ورسٹی سے ایم۔ اے ایجوکیشن کیا ہے۔ اس لیے میں وہاں کے ماحول سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

ماریہ نے تمہید باندھتے ہوئے کہا۔

"ماریہ بھابھی! یونی ورسٹی کا ماحول بہت اچھا اور دوستانہ ہے۔ میری کچھ کلاس فیلوز سے ملاقات ہوئی ہے۔ سب بہت عزت اور احترام سے ملے۔"

رعنا نے جلدی سے کہا۔

"بھئی ایسی بھائیوں، بہنوں والی باتیں تم رہنے ہی دو! باہر کا ماحول کیسا ہے۔ یہ کسی سے ڈھکا چھپا تو نہیں۔ آزادی کے نام پر نوجوان بچے بچیاں جس طرف جارہے ہیں، وہ ایک الگ کہانی ہے مگر ان نوجوان بچوں کے والدین، سرپرست آزادی، مقابلہ بازی، کی دوڑ میں جتنا آگے نکل رہے ہیں وہ اصل میں ہمارے معاشرے کا المیہ بن چکا ہے۔" ماریہ نے منہ بنا کر کہا تو رعنا شرمندہ ہو کر سر ہلانے لگی۔

"بہرحال میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اگر تمہیں کسی سے محبت ہو جائے تو اسے سچ مت سمجھنا کیونکہ یونی ورسٹی میں ہونے والی محبت، بس اس کے در و دیوار تک ہی زندہ اور قائم رہتی ہے۔ عملی زندگی میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ دوسری بات، تمہارے بھائی اور والدین محبت کی شادی کو سب کی طرح ہی برا سمجھتے ہیں۔ جہاں تک میری بات ہے تو میں محبت کی شادی کو برا نہیں سمجھتی ہوں۔ لیکن یہ محبت ہو جائے تو کسی قابل نہیں رہنے دیتی۔ چونکہ تم پہلے ہی ایک عام سی لڑکی ہو۔ اس لیے محبت کر کے، مزید دکھ پالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وقت آئے گا تو تمہیں بھی کوئی نہ کوئی کاٹھ کا الو مل ہی جائے گا۔ اور اگر تمہیں یہ لگے کہ کسی سے محبت کر کے مجھے وکیل کے طور پر، اپنے والدین یا بھائی کے سامنے لے جاؤ گی تو یہ تمہاری پہلی اور آخری بھول ہو گی۔ میں بھی ایسے کسی معاملے میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گی۔"

ماریہ نے منہ بنا کر تیز لہجے میں کہا اور سر جھٹک کر علی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ رعنا جو حیرت سے منہ کھولے اس کے سنہری فرمودات سن رہی تھی۔ ایک دم ہی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور کتنی ہی دیر ہنستی رہی۔

"بھابھی! مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی کہ آپ مجھے محبت کرنے سے منع کر رہی ہیں یا محبت سے بچانا چاہ رہی ہیں۔"

رعنا نے مسکراتے ہوئے کہا تو ماریہ نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ پھر بے ساختہ نگاہ چرا گئی تھی۔ رعنا، گڑیا کو چاول کھلانے میں مگن تھی۔ اس نے ماریہ کے چہرے کے بدلتے رنگ کو نہیں دیکھا تھا۔

اگر دیکھ لیتی تو جان جاتی کہ ماریہ کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے آنے والا رنگ، دل کے کسی کونے میں بسی اس مردہ محبت کا تھا، جس نے ماریہ کے لہجے کی نرمی ہمیشہ کے لیے ختم کر دی تھی۔ ماریہ کو ڈر لگتا تھا کہ کہیں سالوں سے دل کے کونے میں پڑی یہ مردہ محبت، اس کے دل کی نرمی کو بھی نہ جذب کر کے پتھر کا بنا دے۔ اسے جیتا جاگتا انسان ہوتے ہوئے، بے حسی کا پتھر بننے سے خوف آتا تھا۔

آلودہ سخن بھی نہ ہونے دیا اسے
ایسا بھی دکھ ملا، جو کسی سے نہیں کہا

☆☆☆

"اماں! ایک بات تو بتائیں؟" ارسلان نے شلجم چھیلتی ماں کی طرف دیکھا۔

"ہاں کہو!" زرینہ نے مصروف انداز میں پوچھا۔

"کیا سچ میں صبح کے وقت دیکھے خواب سچے ہوتے ہیں؟" ارسلان نے پرسوچ انداز میں پوچھا۔

"میں نے اپنی زندگی میں صبح کے وقت ایک ہی خواب دیکھا تھا، وہ تو پورا ہوا ہے۔" زرینہ نے فخریہ انداز میں کہا۔

"کون سا خواب؟" ارسلان نے پرتجسس انداز میں پوچھا۔

"تمہارے باپ سے شادی کا خواب" زرینہ نے منہ بنا کر کہا۔

"یہ تو خوشی کی بات ہے نا!" ارسلان نے حیرانی سے اپنی ماں کے چہرے کے بگڑے نقوش کی طرف دیکھا تھا۔

"اونہہ!" زرینہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

"ہوں! اس کا مطلب ہے کہ ایسے خواب آنا

ہماری وراثت میں ہیں۔" ارسلان نے فکرمندی سے خودکلامی کی۔

"ویسے تم نے کیا خواب دیکھ لیا ہے؟" زرینہ نے بیٹے کے پرفکر انداز کو بغور دیکھا۔

"اماں! عجیب سا خواب تھا کہ۔!" ارسلان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ماں کو کیسے بتائے۔ اسی وقت تیزی سے سیڑھیاں اتر کر جاوید نیچے آیا تو دونوں ماں بیٹا چونک گئے۔

"یہ نیلا رنگ کہاں سے، کیسے لگا؟" زرینہ نے حیرت سے سوال کیا۔

"تم جاہل عورت ہو! واشنگ مشین کے پاس تیل کی بوتل پڑی تھی جس کا ڈھکن ٹھیک سے بند نہیں تھا۔ سارا تیل میرے اوپر گر گیا۔"

جاوید غصے میں کہتے تیزی سے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

"تیل کی بوتل کیسے کھلی رہ گئی؟" زرینہ نے خودکلامی کی۔ ارسلان ماں کو تیل کے مسئلے میں الجھا دیکھ کر وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

"مگر تیل تو گھر میں ہے ہی نہیں تو پھر۔" زرینہ کو اچانک یاد آیا کہ کپڑے دھونے والی ملازمہ نے کئی بار کہا تھا کہ تیل منگوا دیں مگر زرینہ ہر بار بھول جاتی تھی۔

"کہیں یہ ساتھ والے گھر کی کارستانی تو نہیں" زرینہ نے چنتی سے سوچتے ہوئے اٹھ کر جاوید کے پیچھے چلی گئی، جو کپڑے بدل کر بیڈ پر لیٹا ہاتھ میں پکڑا موبائل دیکھ رہا تھا۔

"سنو! یہ نیلے داغ دھبے، کہیں پرانی محبت نے نشانی کے طور پر تو نہیں دیے ہیں؟"

زرینہ نے جاوید کو ایسے دیکھا جیسے اس کے چہرے پر موجود، ہلکے نشانوں سے اصل بات پا کر کے ہی رہے گی۔

"پرانی محبت کو ایسی نشانیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک کپ چائے بنا دو۔" جاوید نے سرسری انداز میں کہا۔

"... سب ... آپ ... سے شادی کر کے پچھتاتے ہیں۔ کتنی بار کہا کہ یہ گھر بیچ کر کسی نئی جگہ پر گھر لے لیتے ہیں مگر آپ کو تو اپنی محبت کے آسیب زدہ مسکن کے پاس رہنے سے روحانی تسکین ملتی ہوگی نا۔"

زرینہ نے شکایتی انداز میں کہا۔ جاوید نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر دوبارہ موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"چائے میں چینی کم ڈالنا۔ مجھے زیادہ میٹھا پسند نہیں۔" جاوید نے کہا تو زرینہ بڑبڑاتی ہوئی واپس پلٹ گئی۔ جاوید نے گہری سانس لی۔

"محبت کے آسیب زدہ مسکن باہر نہیں، ہمارے دل کے اندر ہوتے ہیں۔" جاوید نے اداسی سے خودکلامی کی تھی۔

☆☆☆

ارسلان روز کی طرح بےزار سا دکان کھول کر بیٹھا ہوا تھا۔ ارسلان کی سستی اور کام میں عدم دلچسپی کی بنا پر دکان پہلے ہی کم سے چل رہی تھی۔ ابھی بھی وہ موبائل پر گیم کھیلنے میں مگن تھا کہ اسے اپنے آس پاس کی کچھ خبر نہیں تھی۔ ایک بچی بار بار اس کے کاؤنٹر کے پاس آتی۔ کچھ کہنے کی کوشش کرتی رہی مگر ارسلان نے ہوں ہاں کر کے اپنی توجہ موبائل پر ہی مرکوز رکھی۔

"گڑیا! یہ دیکھو۔" ایک نرم اور مدھر آواز پر ارسلان نے چونک کر سامنے دیکھا تو بڑی سی ہال نما دکان کے دوسری طرف بنے ریکس میں رکھی کتابوں کے پیچھے ایک لڑکی موجود تھی۔ اسی نے بچی کو آواز دے کر بلایا تھا۔

"یہ تو ماریہ باجی کی بیٹی گڑیا ہے۔ اس کے ساتھ کون ہے؟" ارسلان متجسس ہو کر تھوڑا آگے ہوا مگر کاؤنٹر ہونے کی وجہ سے وہ اپنی جگہ سے تھوڑی ہی حرکت کر سکا۔ دکان پر موجود ملازم لڑکا انھیں مطلوبہ کتابیں دکھا رہا تھا۔

"بل بنوانے تو کاؤنٹر پر آئیں گی نا! اچھا امپریشن پڑے گا کہ میں دکان کا مالک ہوں۔"

ارسلان نے جلدی سے چھوٹے آئینے میں اپنے بال سیٹ کیے اور پھر اکڑ کر کرسی پر بیٹھ کر اس طرح حساب کرنے لگا جیسے بہت کمائی کر رہا ہے۔ ارسلان کن

اکھیوں سے ریکس کے پیچھے موجود لڑکی کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گڑیا ریکس کے آخری سرے پر کھڑی منہ بسور رہی تھی جیسے اسے کچھ پسند نہیں آ رہا۔ گڑیا کی نظر ایک دو بار ارسلان پر پڑی تو اس نے خیر سگالی مسکراہٹ سے نوازا مگر گڑیا نے منہ پھیر لیا۔

"ماشاء اللہ! بچی نے بالکل اپنی ماں جیسا سڑیل مزاج پایا ہے۔" ارسلان نے کھسیانا ہو کر خودکلامی کی۔

لڑکی جس نے کالے سوٹ پر سرخ چنری کا دوپٹہ سلیقے سے لیا ہوا تھا، اس کی نازک کلائیوں میں اسی رنگ کی چند چوڑیاں مسلسل کھنک کر ارسلان کو کچھ گانوں کو یاد دلا رہی تھیں، مگر ارسلان اس وقت وہ گانے گا کر گالیاں نہیں سننا چاہتا تھا۔ اس لیے خود پر ضبط کرتے ہوئے کن انکھیوں سے کالے لباس والی لڑکی کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ ناکام رہا۔ لڑکی نے سرخ چوڑیوں سے سجا ہاتھ گڑیا کے کندھے پر رکھا تو اچانک ارسلان کے ذہن کو زور کا جھٹکا لگا اور اس سانولے اور نازک ہاتھ کو دیکھتے ہی کچھ مہینے پہلے دیکھا اپنا خواب یاد آیا تھا۔

"خواب میں بھی لڑکی نے لال رنگ کا دوپٹا لیا تھا اور اس خواب والی لڑکی کا ہاتھ بالکل ایسا ہی تھا جیسا۔" ارسلان نے گم صم انداز میں خودکلامی کی۔ گڑیا اور لڑکی اب اسے نظر نہیں آ رہے تھے۔ ارسلان نے فوراً سر جھٹکا اور مزید وقت ضائع کیے بنا کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر، بھاگتے قدموں سے ریکس کے پاس پہنچا تو ملازم لڑکے، سلیم نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"بھائی! کیا ہوا؟" سلیم نے پوچھا تو ارسلان نے نفی میں سر ہلایا۔

"ابھی یہاں ایک بچی کھڑی تھی نا؟" ارسلان نے جلدی سے پوچھا۔

"جی اسے کچھ پسند نہیں آیا تو وہ واپس چلے گئے ہیں۔" سلیم نے مصروف انداز میں کہا تو ارسلان بھی تیزی سے باہر کی طرف بھاگا مگر تب تک وہ رکشے میں بیٹھ کر جا چکی تھیں۔

"اللہ میاں! پلیز نہیں مانا کہ عجیب ہوں مگر ایسی ادھوری محبت کی سزا مجھے مت دینا۔"

ارسلان نے بےاختیار آسمان کی طرف دیکھ کر دعا کی تھی۔ ارسلان نے دوبارہ نظر اس راستے پر ڈالی جہاں وہ رکشہ گیا تھا۔ اس کا دل جس طرح بےچین ہو کر اب ایک دم ویران ہوا تھا، ارسلان کو یہ آثار کچھ اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ ارسلان کو سرخ چنری یا اور اپنے خواب کا کوئی گہرا تعلق لگ رہا تھا۔ اس نے فوراً سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تھا۔

"اللہ جی! مجھے تو کیا، کسی کو بھی یک طرفہ محبت نہ ہو۔"

ارسلان کو اپنے کئی دوست یاد آئے۔ جنھوں نے یک طرفہ محبت کو بھلانے کے لیے کئی دو طرفہ محبتیں کی تھیں مگر وہ یک طرفہ محبت اپنی جگہ پوری شان و شوکت سے کھڑی رہی تھی۔

"اور تنگ کر دوسروں کو، ضرور ارسلان بیٹا، تجھے ماریہ باجی کی بددعا لگی ہے۔" دکان کے اندر جاتے ارسلان نے مایوسی سے سوچا تھا۔

میں نے کہا بھی تھا یہاں سے نکل چلتے ہیں
اے دل! تیرے لحاظ میں مارا گیا ہوں میں

☆☆☆

"اماں! کہاں ہیں؟"

ارسلان دروازہ کھول کر پریشانی سے پکارتا اندر داخل ہوا تو سیب کی قاش منہ میں ڈالتی زرینہ کا ہاتھ کانپا اور کھلے منہ میں جانے کے بجائے، قاش دوسری سمت نکل گئی۔ زرینہ پریشانی سے منہ کھولے بیٹے کو دیکھنے لگی۔

"ارسلان! سب ٹھیک تو ہے نا؟" زرینہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اسے ایک دم جاوید کا خیال آیا۔

"اماں! میری ادھورے خواب والی، ادھوری محبت بالآخر تین مہینے کے بعد، ادھورا نظر آ کر، پھر سے کہیں کھو گئی ہے۔"

ارسلان نے ادھورے کی گردان اتنی بار پڑھی کہ زرینہ کو یک دم اپنا گھر، اپنا وجود، سامنے بیٹھا بیٹا،

اس کے منہ سے نکلے سب الفاظ بھی ادھورے ہی نظر آنے لگے تھے۔

"ہائے اللہ! میرا ادھورا سر۔!" زرینہ نے اپنے چکراتے سر کو ہاتھ سے تھاما۔

"اماں! آپ ٹھیک ہیں؟"

ارسلان فکرمندی سے پاس آیا تو زرینہ نے جھک کر پیر کے پاس پڑی چپل اٹھائی اور تاک کر نشانہ لگایا۔ ارسلان نے بچپن کی پریکٹس کو بروئے کار لاتے ہوئے پڑوسی ملک کی طرح اچانک کیے گئے حملے سے بچنے کے لیے دوسری طرف چھلانگ لگائی مگر یہ چھلانگ اس کے لیے اذیت ناک چھلانگ ثابت ہوئی کیونکہ اس کی ٹانگ بہت زور سے صوفے سے ٹکرائی اور وہ تڑپ اٹھا۔

"اماں! بچے کو تکلیف میں دیکھ کر اب خوش ہیں؟" ارسلان نے اپنی ٹانگ کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"بے حس بیٹے! کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ ماں کا دل کتنا کمزور ہوتا ہے؟ پہلے گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے پریشان کر دیا، اوپر سے ادھورے پن کی گردان اتنی بار کی کہ مجھے ساری دنیا ہی ادھوری نظر آنے لگی۔"

زرینہ نے منہ بنا کر کہا اور پھر اپنے ادھورے رہ جانے والے سیب کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"اماں! میری ادھوری محبت" ارسلان نے بچے کی طرح منہ بسور کر کہا۔

"دیکھو میرے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے! محبت ادھوری ہو یا پوری، راس تو تجھے آنی نہیں۔ اس لیے ان خرافات میں پڑنے کے بجائے، اپنے کام پر توجہ دو۔ اگر تمہارا یہی حال رہا تو پہلے کی طرح یہ کام بھی ٹھپ ہو جائے گا اور تمہارا مستقبل ادھورا رہ جائے گا۔ پھر اس ادھورے مستقبل کے ساتھ تمہیں کوئی رشتہ نہیں دے گا۔" زرینہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"اماں! آپ بھی ظالم سماج کی طرح صرف پیسے کی بات کر رہی ہیں۔ محبت کی نہیں۔" ارسلان نے فرط جذبات سے کہا۔

"بیٹا تمہاری جیب سے تھوڑی ہی دور ہے۔ بہتر ہے کہ یہ راگ الاپنا بند کرو۔ ہمارے خاندان کو محبت راس نہیں۔ یہ ضد چھوڑ دو۔"

زرینہ نے بے زاری سے کہا تو ارسلان منہ بناتا وہاں سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

مسلسل بجتی گھنٹی کی آواز پر صحن میں کھیلتی گڑیا تیزی سے بھاگ کر دروازے کے پاس گئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے مسکراتے چہرے کے ساتھ ارسلان کھڑا تھا۔

"گڑیا رانی! کیسی ہو؟ جلیبی کھاؤ گی؟" ارسلان نے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ پر رکھا کپڑا ہٹا کر جلیبی کا دیدار کروایا تو گڑیا نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

"اچھا پہلے جلدی سے یہ بتاؤ کہ اس دن میری دکان پر کس کے ساتھ آئی تھیں؟" ارسلان نے گڑیا کے پیچھے نظر دوڑائی کہ کہیں ماریہ تو نہیں آ رہی۔

"کس دن؟" گڑیا نے حیرانی سے سوال کیا۔

"گڑیا رانی! اس دن، جس دن......" ارسلان کہتے ہوئے سوچ میں پڑ گیا کہ بچی کو کیسے یاد دلوائے۔

"انکل! آپ نے جلیبی دینی ہے تو دیں۔ مما بلا رہی ہیں۔"

گڑیا نے چڑ کر کہا اور پلیٹ پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا جب ہی پیچھے سے تیز لہجے میں بولتی ماریہ وہاں آ گئی۔ ارسلان کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر ماریہ نے ایک ہاتھ کمر پر رکھا اور اسے گھورنے لگی۔

"یہ کیا ہے؟" ماریہ نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

"ماریہ باجی جلیبی!! نن نہیں، میرا مطلب ہے جلیبی لایا ہوں۔" ارسلان نے گھبرا کر کہا۔

"کس خوشی میں؟ اور تم لوگ کب سے محلے میں کچھ بانٹنے لگے ہو" ماریہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"میں نے ایم اے کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اسی خوشی میں اماں نے جلیبی بانٹی ہے۔" ارسلان نے بنا سوچے سمجھے کہا۔

"ارسلان بیٹا! تمہاری اماں نے تو تب بھی کوئی میٹھی چیز نہیں بانٹی تھی، جب تم پیدا ہوئے تھے، تب بھی نہیں جب تم نے روتے دھوتے میٹرک کیا تھا، تب بھی نہیں جب تم نقل کر کے ایف اے سے نکلے اور اس وقت تو بالکل بھی نہیں جب خیر سے تم تھرڈ ڈویژن میں بی اے پاس ہوئے۔ یعنی خوشی اور میٹھے کا تمہارے گھرانے سے دور دور تک واسطہ نہیں ہے۔ پھر ان جلیبیوں کی اصل کہانی کیا ہے۔ جلدی سے بتا دو ورنہ......" ماریہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"ماریہ باجی! دراصل یہ جلیبی ہم لوگوں کے تعلق میں مٹھاس لانے کے لیے ہے۔" ارسلان نے جلدی سے کہا۔

"یوں کہو نا! کہ جادو ٹونا کر کے لائے ہو۔ ایک منٹ سے پہلے یہاں سے غائب ہو جاؤ۔"

ماریہ نے کہتے ہوئے گڑیا کو اندر کیا اور زور سے دروازہ بند کر دیا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" زور سے دروازہ بند کرنے کی آواز سے ارسلان کے پیچھے کھڑے جاوید کے دل پر لگا تھا۔

"ابا! آپ ہمیشہ دروازہ بند ہونے پر ہی کیوں آتے ہیں۔ ویسے اماں کب سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔" ارسلان نے گھبرا کر کہا۔

"ذرا گھر کے اندر چلو۔"

جاوید نے اسے گھورا تو ارسلان سر جھکا کر گھر میں داخل ہوا۔ لاؤنج میں بیٹھی زرینہ نے باپ بیٹا کو آگے پیچھے گھر کے اندر داخل ہوتے دیکھا تو مسکرا دی۔

"ارسلان! محلے سے کیا آیا ہے؟" زرینہ نے ارسلان کے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ کو دیکھ کر کہا۔

"آیا نہیں! تمہارا بیٹا ساتھ والے گھر میں لے کر جا رہا تھا۔ مجھ پر روک ٹوک کرنے کے بجائے، بیٹے پر نظر رکھو۔ جو محلے کے گھروں میں جلیبیاں بانٹتا پھر رہا ہے۔ ویسے ایک بات تو بتاؤ! کماتے تو تم کچھ ہو نہیں، اس فضول خرچی کے لیے پیسے کہاں سے آئے؟"

جاوید نے ارسلان کے ہاتھ سے پلیٹ پکڑی اور مزے سے جلیبی کھانے لگے۔

"مزا تو ایسے آ رہا ہے جیسے میرے حق حلال کی کمائی سے خریدی گئی ہیں۔"

جاوید نے تفتیشی انداز میں بیٹے کی طرف دیکھا تو ارسلان نے فوراً نگاہیں چرائی تھیں۔ اب وہ باپ کے درست اندازے پر ہاں کہہ کر جوتے نہیں کھانا چاہتا تھا۔

"تم میرے دشمنوں کے گھر کیا کرنے گئے تھے؟" زرینہ نے کڑے تیوروں سے بیٹے کو گھورا۔

"اماں! دشمنی دشمنی معاف کریں۔ دل کو صاف کریں۔" ارسلان نے اپنی مرضی کے لفظوں کا ہیر پھیر کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں بہت فکر ہے ہمارے دل کی؟" زرینہ نے اسے گھورا۔

"فکر تو اپنے دل کی ہو رہی ہے۔" ارسلان بڑبڑایا۔ جاوید نے چونک کر بیٹے کی طرف دیکھا۔

"یہ کیا معاملہ ہے؟ شرم نہیں آتی۔ ماریہ تمہاری ماں جیسی ہے۔ اگر قسمت کا ہیر پھیر نہ ہوتا تو وہ ہی تمہاری ماں ہوتی مگر......!"

جاوید جذباتی ہو کر ماضی کا راز کھول بیٹھے تھے۔ ارسلان چونک گیا۔

"قسمت پہ کیوں ڈال رہے ہیں؟ بیٹے کو بتائیں کہ آپ کی نیت میں کھوٹ تھا۔" زرینہ نے غصے سے آگ بگولہ ہوتے ہوئے کہا۔

"میری نیت سے زیادہ تمہاری دوستی میں منافقت تھی۔ ماریہ تمہاری بچپن کی دوست تھی جس کی محبت سے تم نے شادی کی ہے۔"

جاوید نے بھی آج سب حساب بے باق کرنے کا سوچ لیا تھا۔

"اللہ توبہ! سارا الزام میرے سر ڈال رہے ہیں۔ ہم نے کون سا گن پوائنٹ پر شادی کے لیے ہاں کروائی۔ آپ ہی اپنی غربت سے تنگ تھے۔ اکلوتی اور گوری چٹی لڑکی کا رشتہ اس گھر اور گاڑی کے ساتھ مل رہا تھا۔ آپ فوراً اپنی یونی ورسٹی کی محبت کو بھول گئے اور شادی کے لیے ہاں کر دی تھی۔" زرینہ نے نم آنکھوں کے ساتھ قصہ بیان کیا تو

ارسلان سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"آج سمجھ میں آیا کہ آپ تینوں میں دشمنی کی اصل وجہ کیا ہے۔ ویسے ابا! بہت افسوس کی بات ہے۔"

ارسلان نے باپ کو دیکھ کر کہا تو جاوید نے آستین چڑھائی۔

"ابا کے بیٹے! ابھی بتاتا ہوں۔"

جاوید کہتے ہوئے ارسلان کی طرف بڑھا مگر وہ فوراً وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ جاوید نے زرینہ کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں اور دونوں نے اونہہ کہہ کر رخ پھیر لیا۔

☆☆☆

ارسلان کو آج بھی اپنے گھر کے صحن میں مسلسل تانک جھانک کرتا دیکھ کر ماریہ ٹھٹکی۔ ماریہ کو صحن میں کام کرتا دیکھ کر ارسلان فوراً ٹیرس سے ہٹ گیا۔ پچھلے کئی دنوں سے دونوں کے درمیان یہ آنکھ مچولی چل رہی تھی۔ ارسلان اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر ماریہ کے گھر پر نظر رکھتا کہ شاید دوبارہ گڑیا کے ساتھ، اس دن والی پراسرار لڑکی کو دیکھ سکے مگر اس کی یہ خواہش، اب تک خواہش ہی رہی تھی۔ جب کہ ماریہ کو ارسلان کا اپنے گھر کی طرف بے چینی سے دیکھنا بہت عجیب لگ رہا تھا۔

"ضرور اس زرینہ نے ارسلان کو کہا ہو گا میرے گھر پر نظر رکھنے کے لیے! ہمارے تو ہمسائے نہیں، خفیہ کیمرے ہیں۔"

ماریہ بڑبڑاتے ہوئے صحن میں جھاڑو دینے لگی پھر کچھ سوچ کر گھر کا بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ ارسلان جو کمرے کی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھ رہا تھا ماریہ کو گھر سے باہر نکلتا دیکھ کر، جلدی سے ٹیرس پر آیا اور تقریباً لٹکنے والے انداز میں جھک کر ماریہ کے گھر میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی وقت میزائل کی طرح کوئی چیز آ کر اس کے سر پر لگی تو وہ بوکھلا گیا۔ ارسلان نے گھبرا کر اپنے پیر کے پاس گری زنانہ چپل دیکھی تو چونک گیا۔

"یہ کہاں سے آئی ہے؟" ارسلان نے حیرانی سے خود کلامی کی۔

"بیٹا جی! یہ میزائل میں نے داغا ہے۔" ماریہ کی تیز آواز پر ارسلان نے چونک کر سامنے دیکھا تو گلی میں ماریہ کھڑی تھی، جس نے ارسلان کی چوری پکڑ کر تاک کر نشانہ لگایا تھا۔ ارسلان اسے وہاں کھڑے دیکھ کر گھبرا گیا اور جلدی سے گردن گھما کر گلی میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا مگر اس وقت چند بچوں کے علاوہ گلی میں کوئی نہیں تھا۔

"تم نیچے آ رہے ہو یا۔" ماریہ نے غصے سے پوچھا۔

"آہستہ میری ماں! محلے میں ہماری کوئی عزت ہے۔" ارسلان نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو ماریہ نے طنزیہ نگاہ اس پر ڈالی۔

"عزت ہوتی تو دوسروں کے گھروں میں تانک جھانک کرتے۔ ابھی بتاتی ہوں۔"

ماریہ نے اپنی انگلی بیرونی گھنٹی کے بٹن پر رکھ دی۔ سارا گھر تیز گھنٹی کی آواز سے گونج اٹھا۔ جاوید اور زرینہ، دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کر رہے تھے جب تیز اور مسلسل بجتی گھنٹی پر، حواس باختہ ہو کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھے۔ جاوید نے جیسے ہی دروازہ کھولا۔ سامنے ماریہ کو کھڑا دیکھ کر ٹھٹھک کر رک گیا۔

"کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں؟" جاوید نے خود کلامی کی۔

"نہیں! یہ سچ ہے۔"

زرینہ نے زور کی چٹکی اس کی کمر پر کاٹی تو جاوید تڑپ کر فوراً ایک طرف ہوا۔ زرینہ نے کچھ دور کھڑی ماریہ کی طرف دیکھا۔

"تم کیوں آئی ہو؟" زرینہ نے جلدی سے پوچھا۔ اسی وقت ماریہ کی چپل، ہاتھ میں پکڑے ارسلان بھی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا تھا۔

"اپنی چپل لینے، جو تمہارے بیٹے نے بہت شوق سے کھائی ہے۔"

ماریہ نے طنزیہ انداز میں کہا تو دونوں نے چونک کر ارسلان کی طرف دیکھا۔ جس نے اتنی عقیدت سے چپل ماریہ کے پیر کے پاس رکھی۔ جیسے وہ اس کا مرید ہو۔ ماریہ نے اونہہ کہتے ہوئے چپل پہنی۔

"دیکھو زرینہ! اگر یہ گھر میرے والدین کی آخری نشانی نہ ہوتی تو میں کب کا چھوڑ کر یہاں سے جا چکی ہوتی۔ اس لیے تم اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے کے بجائے، اپنے کام سے کام رکھو تو بہتر ہو گا۔" ماریہ نے سخت انداز میں کہا۔

"مگر میں نے کیا کیا ہے؟" زرینہ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ بھی میں بتاؤں گی؟" ماریہ نے ناگواری سے کہا۔

"اپنے بیٹے سے کہو کہ میری گھر کی نگرانی کرنا چھوڑ دے۔ اگر ایسا ہی چلتا رہا تو میں محلے کی کمیٹی سے بات کروں گی۔ میرے شوہر کے یہاں نہ ہونے کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اکیلی اور کمزور عورت ہوں جو۔"

ماریہ غصے سے بول رہی تھی۔ اسی وقت گڑیا اور رعنا قریبی بازار سے کچھ چیزیں خرید کر واپس آ گئیں۔ ماریہ کو غصے سے بھرا کھڑا دیکھ کر فوراً اس کے پاس آئیں۔

"ماریہ بھابھی کیا ہوا؟"

رعنا نے نرم آواز میں سوال کیا تو ارسلان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، جس نے گڑیا کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اس کے سانولے سلونے نازک سے ہاتھ میں آج بھی کانچ کی چوڑیاں موجود تھیں۔ جس کی چھن چھن کی آواز وہ اپنے خواب میں بھی سن چکا تھا۔ ارسلان یک ٹک اسے دیکھنے لگا جس کے چہرے کے عام سے نین نقش بھی عجیب سی کشش رکھتے تھے۔ ارسلان نے آج سے پہلے بہت سی خوب صورت، حسین و جمیل لڑکیاں دیکھی تھیں مگر رعنا کو دیکھ کر جس طرح وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہوا تھا، وہ بہت الگ اور انوکھا احساس تھا۔

ارسلان کی اس حالت کا اندازہ صرف رعنا اور جاوید کو ہی ہوا تھا۔

"کچھ نہیں! چلو یہاں سے۔"

ماریہ نے سر جھٹک کر کہا اور پھر ان دونوں کے ساتھ واپس چلی گئی۔ زرینہ نے حیرانی سے ارسلان کی طرف دیکھا جو گم صم کھڑا تھا۔

"ارسلان! ماریہ سچ کہہ رہی تھی؟"

زرینہ نے حیرانی سے سوال کیا تو ارسلان نے خالی نگاہوں سے، ماں کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔

"اسے کیا ہوا ہے؟" زرینہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"کھا کر لگتا ہے۔ مائل بہ کرم چاہتا ہے۔ رب خیر کرے۔" جاوید نے گہری سانس لے کر کہا تو زرینہ نا سمجھی میں اسے دیکھ کر رہ گئی۔

☆☆☆

رعنا تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی گلی پار کرنے لگی۔ اس کے چہرے کی گھبراہٹ اور قدموں کی تیزی بتا رہی تھی کہ وہ پریشان ہے۔ رعنا کو اپنی حماقت پر شدید غصہ آیا۔ یونی ورسٹی سے واپسی پر وہ فاریہ کو دیکھنے اس کے گھر چلی گئی۔ جو تین دن سے بیمار تھی اور یونی ورسٹی نہیں آ رہی تھی۔

رعنا نے سوچا کہ فاریہ کا گھر پچھلی گلی میں ہی تو ہے۔ مگر یہاں آ کر رعنا کو اندازہ ہوا کہ یہ فاصلہ اتنا بھی کم نہیں ہے۔ دوپہر میں سنسان پڑی گلی میں نجانے کہاں سے دو اوباش لڑکے اس کے پیچھے آنے لگے۔ وہ آوازیں کستے، سیٹیاں بجاتے ہوئے رعنا کو مسلسل ہراساں کر رہے تھے۔

رعنا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اپنی گلی کے پاس پہنچنے والی تھی جب وہ دونوں لڑکے بھاگتے ہوئے اس کے قریب آئے۔ رعنا خوف زدہ ہو کر بھاگنے کا سوچنے لگی مگر اسی وقت ایک بائیک اس کے پاس آ کر رکی۔ رعنا نے چونک کر دیکھا۔ وہ بھی کہ یہ بھی ان لڑکوں کا ساتھی ہے مگر وہ دونوں لڑکے،

بائیک کو دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے تھے۔ ارسلان نے ہیلمٹ اتارا تو رعنا چونک گئی۔

"آپ!!" رعنا نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا تو ارسلان نے مسکرا کر سر خم کیا اور پھر بائیک سے اتر کر تیزی سے ان دونوں لڑکوں کی طرف بڑھا جو اسے دیکھ کر واپس بھاگ گئے تھے۔

"رکو!! ابھی بتاتا ہوں تمہیں کہ اپنی گمشدہ بہن کو گھر کیسے چھوڑ کر آتے ہیں۔"

ارسلان نے نیچے جھک کر پتھر اٹھا کر ان کی طرف اچھالے۔ جن سے وہ بال بال بچے تھے۔ دونوں وہاں سے بھاگ گئے تو ارسلان رعنا کے پاس آیا۔

"اب مجھے سمجھ میں آئی کہ صبح سے آپ میرا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟" رعنا نے تیز نگاہوں سے ارسلان کو گھورا تو وہ اچھل پڑا۔

"قسم سے میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں ان لڑکوں کو جانتا بھی نہیں اور......"

ارسلان نے بوکھلا کر کہنا شروع کیا مگر رعنا سر جھٹک کر تیز تیز قدم اٹھاتی اپنی گلی میں داخل ہو گئی۔ ارسلان بھی آہستہ سے آہستہ بائیک چلاتا اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ یقین کریں وہ لڑکے واقعی مس کا آپ کو چھیڑ رہے تھے۔ میں تو آپ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس لیے......!"

ارسلان کی بات ادھوری ہی رہ گئی کیونکہ رعنا اپنے گھر کے اندر جا چکی تھی۔

"بیٹا جی! لڑکی کو متاثر کرنے کے یہ طریقے پرانے ہو چکے ہیں۔" جاوید نے سبزی کا تھیلا پکڑے قریب آتے ہوئے کہا۔

"ابا! آپ میری جاسوسی کر رہے ہیں؟" ارسلان نے منہ بنا کر کہا۔

"بیٹا! جاسوسی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تمہاری حرکتیں کون سا کسی سے چھپی ہوئی ہیں۔" جاوید نے ہنس کر کہا۔

"ابا! میں سچ کہہ رہا ہوں کہ یہ لڑکی ہی آپ کی اکلوتی بہو بنے گی۔" ارسلان نے جلدی سے کہا۔

"ماریہ یہ کبھی بھی ہونے نہیں دے گی۔ یہ خیال دل سے نکال دو۔" جاوید نے سنجیدگی سے کہا۔

"ابا! آپ لوگوں کی دشمنی میں میری محبت کیوں ادھوری رہے؟"

ارسلان نے تڑپ کر کہا تو جاوید نگاہیں چراتا ہوا گھر کے اندر داخل ہو گیا، جبکہ بیرونی دروازے کے پاس کھڑی زرینہ یہ سن کر گم صم کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ جاوید نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی اور سر جھکائے اندر چلا گیا۔

کئی سال پہلے زرینہ اور جاوید نے محبت کے نام پر کسی کو دھوکہ دیتے، کسی کو راہ میں چھوڑتے ہوئے یہ نہیں سوچا تھا کہ مکافاتِ عمل کی گرفت میں ان کی سب سے پیاری اور قریبی چیز آئے گی۔ اپنے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے کو ماہی بے آب کی طرح، کسی انجان اور چند بار دیکھی لڑکی کی محبت میں تڑپتا تو وہ کئی مہینوں سے دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

"یہ سب ارسلان نے ہی پلان کیا ہوگا۔ یہ سب اوچھے طریقے، لڑکیوں کے سامنے ہیرو بننے کے ہیں۔"

رعنا نے شام کو جب ساری بات ماریہ کو بتائی تو اس نے فوراً کہا۔ رعنا پر سوچ انداز میں ماریہ کو دیکھنے لگی۔

"مگر مجھے ایسا نہیں لگتا۔ شاید وہ سچ میں میری مدد کر رہا تھا۔" رعنا نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ماریہ نے اسے گھورا۔

"تم اسے جانتی ہی کتنا ہو؟" ماریہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"مجھے یہاں آئے کئی مہینے ہو چکے ہیں۔ پہلے کبھی ارسلان نے ایسی کوئی اوچھی حرکت نہیں کی اس لیے......!" رعنا نے جلدی سے کہا۔

"اونہہ! مرد کی فطرت سانپ جیسی ہوتی ہے۔ کبھی بھی بے وفائی کا ڈنک تحفے میں دے دیتا ہے۔" ماریہ نے سلگتے انداز میں کہا تو رعنا چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا مطلب؟" رعنا نے حیرانی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں، تمہیں زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔" ماریہ نے بے زاری سے کہا اور وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

رعنا خاموشی سے ارسلان کے بارے میں سوچنے لگی جو اس کو ٹکٹکی باندھ کر اس طرح دیکھتا تھا جیسے وہ کوئی اپسرا ہو۔ رعنا نے سامنے لگے شیشے میں اپنا عکس دیکھا۔ وہ خوش شکل تھی۔ مگر ارسلان بھی کم نہیں تھا۔

"اس پاگل لڑکے کو بھلا مجھ جیسی عام سی لڑکی میں کیا نظر آیا ہے؟"

رعنا نے حیرانی سے خودکلامی کی تو آئینہ کھلکھلا کر ہنس پڑا کہ رعنا کو بے ساختہ خود سے نگاہ چرانی پڑ گئی تھی۔

☆☆☆

"ارسلان! یہاں آؤ......"

زرینہ جو کافی دیر سے لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی ڈرائی فروٹس کی بھری پلیٹ سے انصاف کر رہی، بیٹے کی منتظر تھی۔ ارسلان کو تھکا ہارا لاؤنج میں داخل ہوتے دیکھ کر، بارعب انداز میں پکارا تو ٹاک شو دیکھتے جاوید نے طنزیہ مسکراہٹ سے، اس کی طرف دیکھا تھا جسے زرینہ نے نظر انداز کر دیا۔

"جی اماں!"

ارسلان نے پاس آتے ہوئے مؤدب انداز میں کہا تو زرینہ نے بہت غور سے بیٹے کو دیکھا جس کے انداز، پچھلے کئی مہینوں سے ہی بدلے ہوئے تھے۔

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ پڑوس والی ماریہ اور خالہ بلقیس کی لڑائی ہوئی ہے۔" زرینہ نے منہ بنا کر کہا۔ اتنی اہم خبر اسے ایک ہفتہ گزر جانے کے بعد، کام والی سے آج پتا چلی تھی۔

"اماں! لوگوں کی لڑائیوں سے ہمارا کیا لینا دینا۔" ارسلان نے بے زاری سے کہا۔

"لوگوں کی یا ماریہ بی بی کی!!" زرینہ نے تیز نگاہوں سے گھورا تو ارسلان گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"کیوں بچے کو تنگ کر رہی ہو، صبح کا گیا، ابھی گھر واپس آیا ہے۔" جاوید نے فوراً بیٹے کی طرف داری کی۔

"اونہہ! سب سمجھتی ہوں۔ دونوں باپ بیٹا ایک ہی تیر کا شکار ہیں۔" زرینہ نے ناگواری سے کہا۔

"استغفار، کیا فضول بول رہی ہو۔" جاوید نے ناگواری سے کہا۔

"ہاں تو، دونوں کو عاشقی کے لیے ایک ہی گھر ملا ہے۔" زرینہ نے ہاتھ نچا کر کہا۔

"صد افسوس، کون کہہ سکتا ہے کہ تم نے کالج کی شکل بھی دیکھی ہے۔ حد ہے جہالت کی۔" جاوید نے ناگواری سے کہا۔

"آپ دونوں ہر وقت کیوں لڑتے رہتے ہیں؟ بچپن سے دیکھ رہا ہوں آپ دونوں کو، ایک دوسرے کے خلاف الگ الگ محاذ پر کھڑے ہو کر گولہ باری کرتے ہوئے۔ اگر آپ دونوں نے پسند سے شادی کی تھی تو پھر اتنی بے زاری کیوں؟" ارسلان نے جھنجھلا کر کہا۔

"بیٹا جی! یہ بات ہی تو سمجھانا چاہ رہی ہوں کہ وقتی محبت کو سر پر سوار مت کرو۔" زرینہ نے منہ بنا کر کہا۔

"اماں! جب سے آپ نے منع کیا کہ آپ رعنا کا رشتہ لینے نہیں جائیں گی، میں نے دوبارہ اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس گھر کے سامنے سے بھی نہیں گزرتا ہوں اگر یہ وقتی محبت ہے تو اتنے مہینوں میں میرے دل کو قرار کیوں نہیں آ رہا؟"

ارسلان نے بے بسی سے کہا۔

"میں نے تمہارے لیے بہت اچھے گھرانوں

کے رشتے دیکھے ہیں۔ اونچی لمبی، گوری لڑکیوں کے۔ اس سانولی سی دبلی پتلی لڑکی سے لاکھ گنا اچھے رشتے ہیں۔" زرینہ نے پرجوش انداز میں کہا۔

"اماں! کیا آپ رعنا کی رنگت کی وجہ سے انکار کر رہی ہیں؟" ارسلان نے صدمے کی کیفیت میں پوچھا۔

"ایک وجہ یہ بھی ہے مگر سب سے اہم وجہ ماریہ ہے۔ میں ماریہ کے گھر کبھی اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی نہیں کروں گی۔"

زرینہ نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے، میں مجبور نہیں کروں گا مگر.....!"

ارسلان نے سنجیدگی سے کہا۔

"مگر کیا؟" زرینہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"میں ساری زندگی شادی نہیں کروں گا۔ آپ بھی مجھے مجبور نہیں کریں گی۔ اگر آپ اپنی ضد کی وجہ سے مجبور ہیں تو میں اپنے دل کے ہاتھوں!"

ارسلان نے سنجیدگی سے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

"دیکھا آپ نے؟" زرینہ نے شکایتی نگاہوں سے جاوید کی طرف دیکھا۔

"کاش جو میں دیکھ اور محسوس کر چکا ہوں، تم بھی کر لیتی تو آج ہمارے بیٹے کی یہ حالت نہیں ہوتی۔" جاوید نے افسوس سے کہا۔

"ارسلان وقت کے ساتھ ٹھیک ہو جائے گا مگر مجھے تو اب موقع ملا ہے ماریہ کو نیچا دکھانے کا۔ میں یہ موقع ہاتھ سے کیسے جانے دوں؟"

زرینہ نے جلدی سے کہا تو جاوید افسوس بھری نگاہ اس پر ڈال کر رہ گئے۔

☆☆☆

ماریہ، علی، رعنا اور گڑیا بازار سے شاپنگ کر کے واپس لوٹے تو اپنے گھر کے باہر کھڑی اسپورٹس بائیک کو محبت سے صاف کرتے ہوئے ارسلان کو ہلکی آواز میں گنگناتے ہوئے پایا۔

سانولی سلونی محبوبہ

تیری چوڑیاں شرونگ کر کے

قریب آتے ہوئے ماریہ کے ساتھ ساتھ رعنا بھی چونک گئی تھی۔ ماریہ نے چابی رعنا کی طرف بڑھائی تو وہ سر ہلاتی جلدی سے، بیرونی دروازے کا تالا کھولنے لگی جبکہ ماریہ نے کھوجتی نگاہ سے ارسلان کی طرف دیکھا۔

"ارسلان بیٹا! خیر ہے یہ گورے رنگ سے سانولی حسینہ تک کا سفر؟"

ماریہ نے حیرانی سے سوال کیا تو ارسلان کی نگاہ، ماریہ کے پیچھے کھڑی رعنا پر پڑی، رعنا نے اس سے نگاہ ملتے ہی فوراً نظریں جھکائی تھیں۔

"السلام علیکم ماریہ باجی! اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے ضرور بتایئے گا۔"

ارسلان نے سنجیدہ انداز میں کہا تو ماریہ حیرانی سے اتنی کایا پلٹ پر حیران رہ گئی۔

"یہ کیا ڈرامہ ہے؟" ماریہ بڑبڑائی اور واپس مڑی تو ارسلان کو دیکھتی، رعنا بوکھلا کر بند دروازے کی طرف بڑھی اور اس سے ٹکرا گئی۔ ارسلان کے ہاتھ سے پریشانی میں سرف کی بالٹی نیچے گر گئی اور سارا سرف بہہ گیا۔ ماریہ نے حیرانی سے پہلے رعنا اور پھر ارسلان کی طرف دیکھا تھا۔

رعنا جلدی سے دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ ماریہ کچھ سوچتی ہوئی گھر کے اندر داخل ہوئی۔ اس نے گردن گھما کر ارسلان کی طرف دیکھا تو وہ گم صم اپنی جگہ کھڑا تھا۔

"عجیب بات ہے۔" ماریہ نے خودکلامی کرتے ہوئے دھیرے سے دروازہ بند کیا۔

"حیرت ہے آج مجھے آتا دیکھ کر دروازہ زور سے بند نہیں کیا گیا ہے۔"

جاوید جو دفتر سے واپس آیا تھا اس نے حیرانی سے خودکلامی کی تو ارسلان نے چونک کر، پہلے باپ اور پھر بند دروازے کی طرف دیکھا۔

"ابا! آپ اپنی حیرت کو چھوڑ کر بیٹے کی پریشانی کا حل ڈھونڈیں۔" ارسلان نے تڑپ کر کہا۔

"بیٹا! تم نے مجھ سے پوچھ کر محبت نہیں کی تھی۔" جاوید نے گھور کر کہا۔

"ابا! محبت پوچھ کر ہوتی تو ضرور پوچھ لیتا۔" ارسلان نے بے بسی سے کہا۔

☆☆☆

"مجھے چھت پہ کیوں بلایا ہے؟"

رعنا چاندنی رات میں ماریہ کی نظر بچا کر چھت پر آ تو گئی مگر اس کے چہرے پر گھبراہٹ واضح تھی۔ ارسلان منڈیر پر سر ٹکائے، اس کا منتظر تھا رعنا کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ، آسمان کے چاند سے زیادہ روشن ہو گیا۔

"تم نے اپنی بھابھی سے بات کرنے کا وعدہ کیا تھا۔" ارسلان نے سنجیدگی سے کہا تو رعنا خاموشی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"ان سے کیسے بات کروں؟" رعنا نے پریشانی سے کہا۔

"جیسے مجھ سے کر لیتی ہو۔" ارسلان نے نرمی سے کہا۔

"اچھا! کیا تم نے اپنی ماں سے بات کر لی؟" رعنا نے اسے گھور کر پوچھا تو ارسلان نے گہری سانس لے کر نفی میں سر ہلایا۔

"وہ میری پسند کے بارے میں جانتی ہیں مگر ہمارے بڑوں کی ضد اور انا کی وجہ سے بات بڑھنے سے پہلے ختم ہو جاتی ہے۔" ارسلان نے سنجیدگی سے کہا۔

"دیکھو ارسلان! میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ یہ سب آسان نہیں ہوگا۔ ماریہ بھابھی بہت اچھی ہیں مگر وہ تم لوگوں کا نام بھی نہیں سننا چاہتیں۔" رعنا نے پریشانی سے کہا۔

"رعنا! ان کے درمیان جو بھی خلیج حائل ہے۔ اس میں پل ہم دونوں بنیں گے۔ بس میرے ساتھ رہنا۔"

ارسلان نے نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو رعنا نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"رعنا!"

اچانک ماریہ کی سنجیدہ آواز گونجی تو رعنا کو ایسا لگا جیسے وہ ہمیشہ کے لیے بت بن گئی ہے، ارسلان نے فوراً گردن گھما کر سیڑھیوں کے دروازے کی طرف دیکھا جہاں ماریہ کھڑی تھی۔

"ماریہ بھابھی!!" رعنا نے بمشکل کہا۔ ماریہ تیز قدموں سے آگے بڑھی اور رعنا کا ہاتھ پکڑ کر واپس لے جانے لگی۔ ارسلان بے بسی سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

"غضب خدا کا! تم اتنے مہینوں سے مجھے بے وقوف بنا رہی تھیں؟ سچ بتاؤ کب سے یہ سب کچھ چل رہا تھا؟"

لاؤنج میں غصے سے بھری ماریہ ادھر سے اُدھر چکر لگا رہی تھی، جبکہ رعنا شرمندگی سے سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔

"ماریہ بھابھی! میں آپ کو سچ بتانا چاہتی تھی مگر میں آپ سے ڈرتی تھی کہ کہیں میری وجہ سے آپ ہرٹ نہ ہوں۔" رعنا نے شرمندگی سے کہا۔

"اور جیسے اب سب کچھ جان کر مجھے خوشی ہوئی ہے؟" ماریہ نے ناگواری سے کہا۔

"ماریہ بھابھی! میں نہیں جانتی کہ کب اور کیسے میرا دل ارسلان کی محبت کا اسیر ہو گیا۔" رعنا نے مدھم آواز میں بتایا تو ماریہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔

"یہ سب جانتے ہوئے بھی کہ میں ارسلان کی فیملی کو پسند نہیں کرتی۔ پھر بھی تم نے ارسلان سے تعلق رکھا۔"

ماریہ نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔

"ماریہ بھابھی! ارسلان میں بہت سی خامیاں ہوں گی۔ وہ بہت پڑھا لکھا نہیں ہے، کسی بڑی پوسٹ پر نہیں ہے مگر ارسلان شریف اور اپنے قول کا پکا ہے۔ اس لیے تو وہ پچھلے کئی مہینوں سے اپنے گھر میں اکیلے محبت کے محاذ پر مورچہ لڑ رہا ہے، جبکہ میری تو ہمت نہیں پڑی آپ سے بات کرنے کی۔" رعنا نے

کہا تو ماریہ نے گہری سانس لی۔

"رعنا! میں اپنی بات پر قائم ہوں کہ میں اس طرح کے کسی معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گی۔ تمہارا ماسٹرز کا پہلا سال مکمل ہو چکا ہے کچھ مہینوں میں ہم ویسے بھی کویت شفٹ ہو جائیں گے۔ یہ گھر میں کرائے پر چڑھا دوں گی۔ تمہیں واپس گاؤں جانا ہوگا۔ تم چاہے محبت کی شادی کرو یا نہیں۔ یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ میں مزید تمہاری ذمہ داری نہیں اٹھاؤں گی۔"

ماریہ نے دوٹوک انداز میں کہا اور رعنا کے فق چہرے پر نگاہ ڈال کر وہاں سے چلی گئی۔ رعنا بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ ایک محبت نے سب خوابوں، سب خواہشوں کو داؤ پر لگا دیا تھا۔

☆☆☆

"ارشد! آپ جلد پاکستان آ جائیں! بہت سال ہو گئے جدائیاں کاٹتے ہوئے۔"

رعنا، چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے کسی گہری سوچ میں گم تھی، جبکہ گڑیا اس کے پاس بیٹھی ڈرائنگ بنا رہی تھی۔ ماریہ موبائل فون کان سے لگائے لاؤنج میں داخل ہوئی۔ رعنا نے چونک کر ماریہ کی طرف دیکھا جو رعنا کو مکمل نظر انداز کر کے فون پر بات کر رہی تھی۔ پچھلے ایک ہفتے سے ماریہ کا رویہ رعنا کے ساتھ ایسا ہی روکھا اور نظر انداز کرنے والا تھا۔

"رعنا کا پہلا سال مکمل ہو گیا ہے۔ بچے آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ بس میں نے فیصلہ کر لیا کہ آپ کے ساتھ رہنے کا۔"

ماریہ نے دوٹوک انداز میں کہا تو رعنا نے لب کاٹتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"رعنا کی شادی کریں یا اسے آگے پڑھنے دیں، یہ فیصلہ آپ لوگوں کا ہے۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

ماریہ نے کٹیلی نگاہ رعنا پر ڈالتے کہا جس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ کچھ دیر بعد ماریہ نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

"ماریہ بھابھی! آپ اپنی ضد اور غصے میں میرا مستقبل داؤ پر لگا رہی ہیں۔ آپ جانتی ہیں کہ ماسٹرز کرنا میری کتنی بڑی خواہش ہے۔"

رعنا نے تڑپ کر کہا۔

"یہ تمہیں محبت کی پینگیں بڑھانے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔" ماریہ نے ناگواری سے کہا۔

"ماریہ بھابھی! پلیز! آپ ایسا مت کریں۔ اگر آپ نے ارشد بھائی کے ساتھ یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا تو میری تعلیم، ادھوری رہ جائے گی مجھے گاؤں واپس جانا پڑے گا۔" رعنا نے پریشانی سے کہا۔

"ایک اور بات بھول رہی ہو کہ گاؤں میں تمہاری خالہ کا مڈل پاس بیٹا، تمہارا دولہا بننے کا منتظر ہے۔"

ماریہ نے طنزیہ انداز میں کہا کیونکہ رعنا کے رشتے کے لیے اس کی خالہ کافی عرصے سے کہہ رہی تھیں مگر ہر بار ماریہ ہی، کسی نہ کسی بہانے اس بات کو ٹال دیتی۔ رعنا کو گاؤں سے شہر بلانے کے پیچھے بھی یہی مقصد تھا مگر اب ماریہ، خود ہی رعنا کو خواہش کے زندان میں قید کرنا چاہ رہی تھی۔

"میں کبھی اس سے شادی نہیں کروں گی۔"

رعنا نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

"اونہہ، یہ بات اپنے بھائی اور باپ سے کہنا۔" ماریہ نے ناگواری سے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔ رعنا پریشان چہرے کے ساتھ گم صم بیٹھی رہی۔

☆☆☆

"ماریہ بھابھی کی ضد اور غصے کی وجہ سے میرا مستقبل خطرے میں پڑ گیا ہے۔"

رعنا اور ارسلان یونی ورسٹی کے کیفے ٹیریا میں بیٹھے تھے۔ رعنا کے چہرے پر پریشانی واضح تھی۔

"غلطی میری ہے، میری وجہ سے تمہیں یہ سب دیکھنا پڑ رہا ہے۔" ارسلان نے گہری سانس لے کر کہا۔

"اپنی محبت پر پچھتا رہے ہو؟" رعنا نے بے بسی سے پوچھا تو ارسلان نے نفی میں سر ہلایا۔

"محبت پر نہیں، تمہاری مشکل نے افسردہ کر دیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ماسٹرز کرنا تمہارا خواب ہے۔" ارسلان نے فکرمندی سے کہا۔

"ارشد بھائی کچھ دنوں تک واپس آ رہے ہیں مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اب کیا ہوگا؟"

رعنا نے لب کاٹتے ہوئے کہا تو ارسلان اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"ابا تو میرے ساتھ ہیں مگر اماں ابھی اس رشتے پر راضی نہیں ہیں۔" ارسلان نے اپنی گھر کی سرد جنگ کے بارے میں بتایا۔

"پتا نہیں، ان کے ماضی میں ایسا کیا ہوا تھا کہ یہ سب ایک دوسرے کے اتنے خلاف ہیں۔"

رعنا نے حیرانی سے پوچھا تو ارسلان نے بے ساختہ نگاہیں چرائی تھیں۔

"مجھے خود نہیں پتا۔" ارسلان نے مدھم انداز میں کہا۔

"مگر تم فکر مت کرو۔ میں اماں کو منانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تب تک اللہ کرے کہ ماریہ باجی کا دل بھی نرم پڑ جائے۔"

ارسلان نے جلدی سے کہا تو رعنا نے آمین کہتے ہوئے سر ہلایا تھا۔

☆☆☆

ماریہ کی گود میں گڑیا سر رکھے گہری نیند میں کھوئی ہوئی تھی۔ ماریہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے، ماضی کی ان یادوں میں کھوئی ہوئی تھی جس نے ہمیشہ اسے تکلیف اور اذیت سے دوچار کیا تھا۔

ماریہ بارہ سال کی تھی۔ جب ایک حادثے میں اس کے والدین کا انتقال ہو گیا تو اس کی کفالت کی ذمہ داری، خالہ اور خالو نے اٹھا لی۔ کیونکہ وہ دونوں بے اولاد تھے۔ ماریہ کے ددھیال میں قریب کا کوئی رشتہ نہیں تھا جو اس کی ذمہ داری اٹھاتا۔ ماریہ اپنی خالہ اور خالو کے زیر سایہ پرورش پانے لگی۔ دونوں نے ماریہ کو اپنی اولاد سمجھ کر بہت پیار دیا۔

خالہ اور خالو کے بعد پڑوس میں رہنے والی زرینہ اور اس کی فیملی ماریہ کے سب سے قریب تھے۔ زرینہ پڑھائی میں بہت کمزور تھی جبکہ ماریہ کا تعلیمی ریکارڈ شاندار تھا۔ ماریہ نے جہاں تک ممکن ہوا زرینہ کا ساتھ دیا مگر زرینہ نے بمشکل ایف۔ اے کیا اور پھر پڑھنے سے توبہ کر لی۔ تعلیمی مدارج طے کر کے جب ماریہ یونی ورسٹی آئی تو اس کی ملاقات جاوید سے ہوئی۔ جاوید کو بولڈ اور پراعتماد ماریہ اچھی لگی۔ ان دونوں کے درمیان بہت جلد دوستی سے محبت تک کا سفر طے ہوا جس کی واحد گواہ زرینہ تھی۔

ماریہ، اکثر زرینہ کو ساتھ لے کر جاوید سے ملنے جاتی۔ زرینہ کو اونچا لمبا اور خوبصورت جاوید پہلی نظر میں اچھا لگا تھا۔ وہ حیران تھی کہ جاوید جیسے خوب صورت مرد کو ماریہ جیسی عام سی لڑکی میں کیا نظر آیا ہے۔ بہت جلد زرینہ کو اندازہ ہو گیا کہ جاوید غربت کی چکی میں پسا، ایسا نوجوان ہے جس کے خواب تو بہت اونچے تھے مگر عملی طور پر اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔

زرینہ نے جاوید کی اس کمزوری کو بھانپ کر، اپنی امارت اور ماریہ کے لیے مالک ہونے کا قصہ اتنی ذہانت اور چالاکی سے جاوید کے ذہن میں اتارا کہ وہ ماریہ کو چھوڑ کر زرینہ سے منگنی کر بیٹھا۔ جاوید جو ایک چھلانگ میں غربت سے نکل کر امیر ہونا چاہتا تھا۔ اسے زرینہ کی صورت میں یہ خواب ممکن نظر آنے لگا کیونکہ زرینہ اپنے والدین کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی جس کے نام سارا کاروبار اور دس مرلے کا یہ عالی شان گھر بھی تھا جبکہ ماریہ تو اپنے خالہ خالو کی مہربانی سے پلی بڑھی تھی۔ ماریہ کے ساتھ شادی کر کے جاوید کے حالات ایسے ہی رہتے۔

جاوید اور زرینہ نے بہت چالاکی اور خود غرضی سے ماریہ کو دھوکے میں رکھ کر اچانک منگنی کا اعلان کر دیا۔ ماریہ کے لیے یہ دوہرا صدمہ تھا۔ ایک محبوب کی طرف سے، دوسرا دوست کی طرف سے۔ ماریہ کی ذہنی حالت اتنی خراب ہوئی کہ

مجبوراً کچھ عرصے کے لیے خالہ اسے لے کراپنی نند کے پاس کراچی چلی گئیں۔ ماریہ کے لیے یہ وقت مشکل تھا مگر اس مشکل وقت میں خالہ نے اس کی بہت دل جوئی کی۔ کچھ وقت لگا مگر ماریہ سنبھل گئی۔

اس دوران جاوید اور زرینہ کی شادی ہو گئی اور زرینہ رخصت ہو کر سسرال چلی گئی۔ ماریہ کراچی سے واپس آئی تو اس کے مزاج میں ایک ضد اور غصہ نظر آنے لگا تھا۔ ماریہ نے ماسٹرز مکمل کرتے ہی ایک کالج میں لیکچرار کی جاب شروع کر دی۔ خالہ اور خالو کی پوری کوشش تھی کہ ماریہ کی شادی کر دیں مگر ماریہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ ایک دن خالو دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے چل بسے تو خالہ اور ماریہ ایک دوسرے کا واحد سہارا رہ گئے۔ خالہ کے مسلسل بیمار رہنے کی وجہ سے ہی ماریہ ارشد سے شادی پر مانی تھی۔ ارشد کے والدین کو خالہ کافی عرصے سے جانتی تھیں۔ ارشد سے بڑا ایک بھائی اور ان سب سے چھوٹی ایک بہن تھی۔ جب ماریہ کی شادی ارشد سے ہو گئی اور ماریہ رخصت ہو کر گاؤں چلی گئی تو زرینہ اور جاوید خاموشی سے ساتھ والے گھر میں آ بسے۔

خالہ کے مرنے کے بعد ماریہ کو پتا چلا کہ یہ گھر ماریہ کے نام ہے۔ ماریہ اپنے خالہ اور خالو کی بے لوث محبت کی پہلے بھی قائل تھی مگر اس فیصلے نے ماریہ کو احساس دلایا کہ وہ دونوں اسے اپنی سگی اولاد ہی سمجھتے تھے۔ پہلے یہ گھر کرائے داروں کے پاس رہا مگر ارشد کے فوت ہو جانے اور بچوں کی پیدائش کے بعد، ماریہ نے کرائے دار نکال دیے اور خود پانچ مرلے کے اس گھر کو آباد کیا۔

ماریہ، بظاہر تو زندگی میں آگے نکل گئی مگر وہ اپنے ساتھ ہوئے دھوکے کی آگ میں جلتی تلخ ہو گئی تھی۔ جاوید اور زرینہ کی وجہ سے اس نے شادی بھی دیر سے کی، اس لیے اس کے بچے چھوٹے اور جاوید کا بیٹا جوان ماریہ کو ارشد کی صورت میں ایک بہترین ہم سفر ملا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ جاوید اور زرینہ کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا مگر وہ دونوں چاہتے ہوئے بھی وقت کو واپس نہیں لا سکتے تھے۔

اس لیے زرینہ، ماریہ کا سامنا کرنے سے گھبراتی تھی جبکہ جاوید، ماریہ کو دیکھتے ہی احساس جرم کا شکار ہو جاتا تھا۔

ماریہ کا رویہ ان دونوں کے ساتھ تلخ تھا۔ ایک عمر دھوکے کی اس لڑائی کو لڑنے والی ماریہ کو جب رعنا اور ارسلان کے درمیان بنے تعلق کی خبر ملی، اس کی سب محرومیاں اور دکھ سامنے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ ہر چیز، ہر احساس کو بھلائے، ارسلان کو محبت کے محاذ پر ویسی ہی شکست دینا چاہتی تھی جس کی تکلیف اس کے والدین کو پہنچے۔

ماریہ جو جاوید سے، سچی محبت کرنے کی مرتکب ہوئی تھی وہ ارسلان کی آنکھوں اور لہجے میں سچی محبت کے سب رنگ دیکھ چکی تھی۔ اس لیے اسے اندازہ تھا کہ اب کی بار اس کے ازلی دشمنوں کی شہ رگ پر اس کا ہاتھ تھا۔ وہ جب چاہے شہ رگ کو دبا کر اپنے دشمن کی چلتی سانسیں روک سکتی ہے۔

☆☆☆

"میں خود بہت حیران ہوں کہ ماریہ اتنی ضد کیوں کر رہی ہے۔"

ارشد کی حیران کن آواز پر رعنا نے سر اٹھا کر بھائی کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ ارشد کچھ دن پہلے واپس آیا تھا۔ ارشد کے آتے ہی ماریہ نے اپنی بات پر زور دینا شروع کر دیا تھا۔ پہلے ارشد کو لگا کہ شاید ماریہ جذباتی ہو کر یہاں سے جانے کی بات کر رہی ہے مگر یہاں آ کر، اسے اندازہ ہوا کہ ماریہ سنجیدہ تھی۔ وہ اب کسی بھی صورت میں اکیلی رہنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"بھائی! میری تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔ کیونکہ بڑے بھائی مجھے کبھی بھی ہوسٹل میں رہنے نہیں دیں گے اور شہر میں ہمارا کوئی رشتے دار بھی نہیں ہے۔ جس پر بھروسہ کر سکیں۔"

رعنا نے خوف زدہ لہجے میں کہا تو ارشد نے

رعنا کی اعلیٰ تعلیم کا خواب ان سب نے دیکھا تھا۔ ... رہ گیا۔

"ماریہ کچھ بھی سننے کو تیار نہیں ہے۔" ارشد نے فکر مندی سے کہا تو رعنا کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

"میں ماریہ کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ تم پریشان مت ہو۔" ارشد نے بہن کو تسلی دی مگر رعنا جانتی تھی کہ ماریہ کبھی نہیں مانے گی۔

☆☆☆

"اماں پلیز! آپ مان جائیں ورنہ رعنا ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلی جائے گی۔"

ارسلان آج پھر اپنا مقدمہ لے کر ماں کی عدالت میں کھڑا تھا۔

"ارسلان! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیوں ایک عام سی لڑکی کی خاطر اپنی ماں کو ناراض کر رہے ہو۔"

زرینہ نے بگڑ کر کہا۔

"میں آپ کو ناراض کرنا چاہتا تو یہ کون سی مشکل بات تھی مگر میں آپ کی رضامندی چاہتا ہوں۔" ارسلان نے تڑپ کر کہا۔

"میری رضامندی رعنا کے لیے کبھی نہیں ہوگی۔"

زرینہ نے سخت انداز میں کہا تو ارسلان نے افسردہ نظروں سے پہلے ماں اور پھر خاموش بیٹھے باپ کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے! آپ اپنی ضد اور انا کے ساتھ خوش رہیں۔ میں جا رہا ہوں۔" ارسلان نے نم آنکھوں کے ساتھ کہا اور غصے سے چلتا گھر سے باہر نکل گیا۔

"یہ کہاں چلا گیا؟" زرینہ نے فکر مندی سے جاوید کی طرف دیکھا تو وہ کندھے اچکا کر رہ گئے۔

"تم جانو اور تمہارا بیٹا۔" جاوید نے کہتے ہوئے ٹاک شو کی آواز تیز کر دی تھی۔

"ابھی واپس آ جائے گا۔" زرینہ نے خود کلامی کرتے ہوئے خود کو تسلی دینے کی ناکام کوشش کی تھی۔

☆☆☆

"کیا ہوا۔ گھنٹی کس نے بجائی تھی؟"

ماریہ نے حیرانی سے بیرونی دروازے کے پاس پریشانی سے چکر لگاتی رعنا کو دیکھ کر پوچھا تو رعنا ٹھٹک کر رک گئی۔

"ارشد بھائی ابھی باہر گئے ہیں۔ ان کی واپسی کا انتظار کر رہی ہوں۔"

رعنا نے اپنے آنسو چھپاتے ہوئے جلدی سے کہا تو ماریہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔

"ارشد کہاں گئے ہیں؟" ماریہ نے چونک کر پوچھا۔

"جاوید انکل آئے تھے۔ ان کے ساتھ گئے ہیں۔" رعنا نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

"کیوں؟" ماریہ کا چہرہ تن گیا۔

"ارسلان صبح کا نکلا ابھی تک گھر واپس نہیں آیا ہے۔ اسی کو ڈھونڈنے گئے ہیں۔" رعنا کہتے ہوئے رو پڑی تو ماریہ کچھ کہتے ہوئے رک گئی۔

"اونہہ! کسی کے معاملے میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟"

ماریہ نے منہ بنا کر کہا تو رعنا نے شکایتی نگاہ سے اسے دیکھا۔ ماریہ سر جھٹک کر واپس کمرے میں چلی گئی مگر کمرے میں جا کر بھی اسے سکون نہیں ملا۔

"مجھے کیا ضرورت ہے کسی کے لیے پریشان ہونے کی۔" ماریہ بڑبڑائی۔

کچھ دیر ایسے ہی گزر گئی تو ماریہ تھک ہار کر کمرے سے باہر نکلی۔ رعنا لاؤنج کے صوفے پر گم صم سی بیٹھی تھی، جبکہ ساتھ والے گھر کے صحن سے زرینہ کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے پاس محلے کی چند خواتین موجود تھیں جو اسے تسلی دے رہی تھیں۔

"کیا ہوا؟ زرینہ کیوں رو رہی ہے؟"

ماریہ نے فق چہرے کے ساتھ پوچھا۔

"ارسلان کی کوئی خبر نہیں مل رہی ہے۔ میری ابھی ارشد بھائی سے بات ہوئی ہے۔ بھابھی! ہمیں بھی زرینہ آنٹی کے گھر جانا چاہیے۔ پڑوسی ہونے کے

ناتے ہمارا فرض بنتا ہے۔" رعنا نے سنجیدگی سے کہا تو ماریہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"ہوں، چلو۔" ماریہ نے ایک نظر سوئے بچوں پر ڈالی اور کمرے کا دروازہ احتیاط سے بند کر کے رعنا کے ساتھ گھر سے باہر چلی گئی۔ زرینہ کے گھر کا بیرونی دروازہ کھلا تھا۔ زرینہ صحن میں رکھی کرسی پر بے حال بیٹھی رو رہی تھی۔ محلے کی کچھ عورتیں اسے چپ کروانے کی کوشش میں تھیں۔ ماریہ کو آتا دیکھ کر زرینہ روتے ہوئے چپ کر گئی اور پھر تیر کی تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس آئی۔

"آج تم بہت خوش ہو گی نا، دیکھو تمہارا بدلہ کیسے پورا ہوا اور......!"

زرینہ کے کچھ کہنے سے پہلے ماریہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر، پیچھے کھڑی عورتوں کی طرف اشارہ کیا۔ زرینہ نے مڑ کر محلے کی عورتوں کی طرف دیکھا اور پھر واپس ان کے پاس آئی۔

"آپ سب کا بہت شکریہ! جاوید آنے والے ہیں۔ آپ سب اپنے گھر واپس چلی جائیں۔" زرینہ نے جلدی سے کہا تو وہ عورتیں حیرانی سے اسے دیکھتی وہاں سے چلی گئیں۔

"ہاں اب بولو۔" ماریہ کہتے ہوئے اطمینان سے خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تم نے اپنا بدلہ بہت چالاکی سے آخر لے ہی لیا۔ میری زندگی کی جمع پونجی۔ دیکھو میں خالی ہاتھ رہ گئی ہوں۔" زرینہ روتے ہوئے زمین پر بیٹھ گئی۔

"میرا ارسلان مجھ سے ناراض ہو کر گھر سے گیا تھا۔ میں جانتی ہوں وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔" زرینہ نے روتے ہوئے کہا۔

"آنٹی! آپ حوصلہ کریں۔ ارسلان ضرور واپس آئے گا۔"

رعنا نے جلدی سے پاس آ کر روتی ہوئی زرینہ کو تسلی دی تو زرینہ نے چونک کر رعنا کے ہمدرد چہرے کی طرف دیکھا۔ کچھ لمحے [illegible] امید چہرہ اور عام سے لفظ اسے جادو کی طرح لگے تھے۔

"ہاں! تم کہو گی تو وہ ضرور لوٹ آئے گا۔" زرینہ نے نرمی سے رعنا کے رخسار پر ہاتھ رکھا۔

"ان شاء اللہ!"

رعنا نے پورے یقین سے کہا تو زرینہ روتے ہوئے بھی مسکرا دی۔ اس لمحے اسے احساس ہوا کہ سچی محبت وہ نہیں تھی جو جاوید اور اس نے اپنے اپنے مفاد کے لیے کی تھی۔ محبت وہ تھی جو ماریہ نے جاوید سے کی، اس لیے تو اس کے دھوکے کو کبھی معاف نہیں کر سکی۔

محبت تو وہ ہے جو رعنا اور ارسلان نے ایک دوسرے سے کی۔ دونوں ہی اپنے اپنے دائرے میں مجبور محبت کو نبھانے کی کوشش کرتے رہے، مگر کبھی اپنی محبت کو غرض اور ذاتی مفاد کے کسی رنگ میں نہیں ڈھلنے دیا۔ اگر دونوں اپنے اپنے گھر والوں سے بغاوت کرتے تو دونوں جاوید اور زرینہ کی طرح مفاد پرست اور خود غرض کہلاتے۔

"ماریہ! کیا تم مجھے معاف نہیں کرو گی؟" زرینہ نے سنجیدگی سے کچھ دور کرسی پر بیٹھی ماریہ کی طرف دیکھا۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔ اتنی عمر تو گزر گئی۔" ماریہ نے تھکے انداز میں کہا۔

"فرق پڑتا ہے! ہمارے سامنے روشن سویرا ہے۔" زرینہ نے رعنا کی طرف دیکھ کر کہا تو ماریہ خاموش نگاہوں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"اس روشن سویرے سے پہلے، دھوکے کی کالی رات میں نے کاٹی ہے۔" ماریہ نے نم لہجے میں لب کاٹے تھے۔

"معاف کر دو کہ تمہاری معافی سے مجھے سکون اور میرے گھر کو دائمی خوشیاں ملیں گی۔"

زرینہ نے، کہتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیئے تو ماریہ بے بسی سے لب کاٹنے لگی۔ رعنا حیرانی سے ان دونوں کو دیکھنے لگی، جن کی آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر ماضی کے کچھ بدنما رنگ واضح تھے۔ اس سے پہلے کہ زرینہ کچھ اور کہتی بیرونی دروازہ کھلا۔ ان

دونوں نے ایک ساتھ چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ارشد اور جاوید زخمی ارسلان کو سہارا دے کر اندر لا رہے تھے۔

"کیا ہوا میرے بچے کو؟" زرینہ تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھی اور ارسلان کے پاس پہنچ کر اسے اپنے گلے لگا کر رو پڑی۔

"اماں! میں ٹھیک ہوں۔ معمولی سا حادثہ ہوا ہے۔" ارسلان نے نقاہت سے کہا۔

"شکر ہے ارسلان کی جان بچ گئی۔ بائیک تو پوری تباہ ہو گئی ہے۔"

جاوید نے فکر مندی سے کہا اور ارسلان کو کرسی پر بٹھا دیا۔ ارسلان کے ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی جبکہ ایک ٹانگ بھی متاثر ہوئی تھی بازو پر کافی خراشیں آئی تھیں۔

"مگر حادثہ ہوا کیسے؟" زرینہ نے ارسلان کے زخم دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ارسلان شام کو کام سے واپسی پر ایک دوست سے ملنے گیا وہاں ایک تیز رفتار گاڑی نے ٹکر ماری۔ حادثہ شدید تھا۔ بائیک تو تباہ ہو گئی جبکہ ارسلان چوٹ لگنے کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا۔ ارسلان کے پرس کی تلاشی کے دوران جاوید بھائی کا نمبر ملا۔ جس پر کال کر کے اطلاع دی گئی۔ ہم تو اب ارسلان کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے کا سوچ رہے تھے۔" ارشد نے تفصیل سے بتایا۔

"ارسلان کی جان بچ گئی۔ اس سے بڑی کوئی بات نہیں ہے۔ ارسلان کو آرام کرنے دیں۔ ہم چلتے ہیں۔"

ماریہ نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ارسلان اور جاوید نے حیرانی سے اس کا پلٹ کر دیکھا تھا۔ ماریہ جاتے ہوئے زرینہ سے گلے ملی تو زرینہ خوشی سے کھل اٹھی۔

"یہ کیسے ہوا؟" ان کے جانے کے بعد بے اختیار جاوید کے منہ سے نکلا۔

"کئی سال پہلے میں نے دوستی کے نام پر جو دغا اپنی مخلص دوست کو دیا تھا۔ اس کی چبھن نے ہمیشہ مجھے بے چین رکھا مگر آج میں نے اپنی غلطی تسلیم کر کے ماریہ سے معافی مانگ لی ہے۔" زرینہ نے خوشی سے کہا۔ ارسلان مسکراتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا۔

"یعنی میرے ساتھ ہوئے حادثے نے آپ لوگوں کے تعلق پر جمی سرد برف بالآخر پگھلا دی ہے۔" ارسلان نے لڑکھڑا کر چلتے ہوئے کہا۔

دونوں ماں بیٹا مسکرا کر باتیں کرتے اندر چلے گئے۔ خالی صحن میں اداس کھڑے جاوید نے اس کرسی کی طرف دیکھا جہاں کچھ دیر پہلے ماریہ بیٹھی ہوئی تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ یہ معافی مجھے کبھی نہیں ملے گی۔" جاوید نے مایوسی سے خود کلامی کی اور تھکے قدموں سے اندر کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

صحن میں بکھرے پھیلاوے کو سمیٹتے ہوئے رات تیزی سے بیت رہی تھی۔ ثریا کو سلا کر ارشد کمرے سے باہر نکلا تو ماریہ اور رعنا صحن میں کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔

"تم دونوں کو یہی وقت ملا ہے باتیں کرنے کا؟" ارشد نے حیرانی سے پوچھا تو رعنا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"میں بھابھی کو آرام کرنے کا کہہ رہی تھی کہ باقی کام صبح کر لیں گے۔" رعنا نے محبت بھری نگاہ ماریہ پر ڈالی۔

"بس سب کام مکمل ہو گئے ہیں۔ امی، ابو کو پوچھ لیا تھا کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔" ماریہ نے ذمہ دار بہو کا کردار ادا کرتے ہوئے کہا۔

"جی وہ دونوں تو سو چکے ہیں۔ آپ بے فکر رہیں میں انہیں دیکھ لوں گی۔" رعنا نے جلدی سے کہا تو ماریہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ماریہ! تم نے جس طرح رعنا کی منگنی کی تیاری سے لے کر منگنی ہونے تک ساری ذمہ داری نبھائی، میں اس کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں۔"

ارشد نے متاثر انداز میں کہا۔
"بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ماریہ بھابھی! آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ حتیٰ کہ میری تعلیم مکمل ہونے تک باہر جانے کا فیصلہ بھی بدل دیا ہے۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"
رعنا نے ماریہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا تو ماریہ دھیرے سے مسکرادی۔
"میں جانتی ہوں کہ محبت سے دیکھے اور سینچے گئے خواب، جب ٹوٹیں تو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ اس کی چبھن اور اذیت ساری زندگی ساتھ رہتی ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہاری آنکھوں کے سنہرے خواب چکنا چور ہوں۔"
ماریہ نے معنی خیز انداز میں کہا تو رعنا نے بے ساختہ نگاہ چرائی تھی۔ جبکہ ارشد حیرانی سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔
"ستو! یہ کسوٹی جیسی گفتگو صبح کر لینا۔ میں تو سونے جا رہا ہوں۔" ارشد نے جمائی لی اور وہاں سے چلا گیا۔ رعنا اور ماریہ بھی اندر جانے کے لیے مڑیں جب ہی ساتھ والے گھر کے صحن سے ارسلان کی بے سری اور بھاری آواز ابھری۔
'سانولی سلونی سی محبوبہ، تیری چوڑیاں شور نہ کرکے"
دونوں چونک کر رک گئیں اور ایک ساتھ دیوار کی طرف دیکھا جہاں سے ارسلان کی آواز آرہی تھی۔
"لگتا ہے تم سے منگنی کی خوشی میں اپنے رہے سہے حواس بھی کھو بیٹھا ہے۔ بھلا یہ کوئی وقت ہے گانا گانے کا۔" ماریہ نے منہ بنا کر کہا اور بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی۔ رعنا شرماتی، لجاتی دیوار کی طرف بڑھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ دیوار کے ساتھ رکھی کرسی پر کھڑے ہو کر ارسلان سے بات کرے گی۔ رعنا جیسے ہی دیوار کے پاس پہنچی، اسی وقت زرینہ کی تیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔
"ابھی تو وہ سانولی سلونی محبوبہ آئی بھی نہیں اور تم دیوانے ہو کر گاتے پھر رہے ہو۔ جب وہ آجائے گی تو تمہارا کیا حال ہوگا۔"
زرینہ نے ارسلان کو جھاڑا تو وہ منمنانے لگا۔
"اماں! ناراض تو مت ہوں نا، میں کب اس کے لیے گا رہا ہوں۔ یہ دیکھیں ہینڈ فری لگائے گانے سن رہا تھا۔"
ارسلان نے ماں کو پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے وہاں سے چلے گئے تو رعنا کھسیانی ہو کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

اپنی پرانی بائیک پر آفس سے واپس آتے، جاوید نے اپنی گلی میں سامنے سے آتے ارشد، ماریہ، علی اور گڑیا کو دیکھا۔ ماریہ کے چہرے پر اندرونی خوشی تھی وہ ہنستے ہوئے آج بھی، پہلے کی طرح دلکش اور حسین لگ رہی تھی۔ جاوید کے دل میں ایک کسک اٹھی اور اس نے بے اختیار نگاہیں جھکالیں کہ نگاہ بھر کر دیکھنے کا حق برسوں پہلے وہ کھو چکا تھا۔
وہ تینوں پاس آئے تو ارشد نے خوش اخلاقی سے اونچی آواز میں سلام کیا تو جاوید نے مسکرا کر جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ اپنے گھر کے دروازے کے پاس رک کر جاوید نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ پرائیویٹ ٹیکسی میں بیٹھ رہے تھے۔ جاوید نے جب گردن موڑی تو اس کی آنکھ کے کونے میں ہلکی سی نمی تھی جہاں وفا کی کوئی دید، کوئی ساعت ازل کے لیے نقش تھی۔ یہ نمی اس خوشی اور اطمینان کی تھی کہ اس کی محبت کو، وہ رتبہ، وہ انمول ساتھ ملا ہے جو اس کا حق تھا۔
جاوید جیسے تو بہت سے عام مرد، زرینہ جیسی بہت سی عام عورتوں کے لیے ہوتے ہیں۔ بات تو انمول لوگوں کی ہوتی ہے، انمول احساس کی، جو ہر کسی کا مقدر نہیں بنتے۔

☆☆

"ممّا! ماموں کا فون ہے۔" نازیہ جلدی جلدی افطاری بنانے میں مصروف تھی۔ جب اس کے بڑے بیٹے نے موبائل کچن میں آ کر دیا۔ موبائل کان سے لگاتے ہی منجھلے بھیا کی آواز آئی۔

"ہاں چھوٹی کہاں ہو تم؟"

"گھر پہ بھیا۔" نازیہ نے بیسن گھولتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا ایسا ہے کہ چھوٹے کی طبیعت بھی خراب ہے اور تمہاری بھابھی نے بھی ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔ سو افطاری کے فوراً بعد تیار رہنا۔ میں تمہیں لینے آجاؤں گا۔"

منجھلے بھیا نے ہمیشہ کی طرح اپنی کہہ کر فون بند کر دیا۔ نازیہ جو آرام، سکون سے افطاری بنا رہی تھی۔ جلدی جلدی سب بنانے لگی۔

چاولوں کو دم لگا کر پکوڑے تلے اور ساتھ ہی سحری کا آٹا بھی گوندھنے لگی۔ افطار کا سب سامان ڈائننگ پر سیٹ کر کے ساس کو اپنے جانے کا بتایا۔ اور روزہ کھلنے تک اپنے اور چھوٹے کے کپڑے استری کیے۔

☆☆☆

نازیہ تین بھائیوں کی اکلوتی چھوٹی بہن تھی۔ چھوٹی اور منتوں مرادوں سے پیدا ہونے والی نازیہ کو اماں اور ابا مرحوم نے ہتھیلی کا چھالا بنائے رکھا۔ اس کی ہر خواہش منہ سے نکلتے ہی پوری کرتے۔ خاص طور پر ابا کی تو اس میں جان تھی۔ وقت گزرتے لگا اور نازیہ نے گریجویشن کر لیا۔

گریجویشن کے فوراً بعد بڑے اور منجھلے بھیا کی شادیاں رشتے داروں میں طے پائیں۔ نازیہ نے دونوں بھائیوں کی شادیاں خوب انجوائے کیں۔ ابا سے فرمائش کر کر کے ہر فنکشن کے قیمتی جوڑے بنوائے اور ہر فنکشن پر تتلی بنی پھرتی رہی۔ شادی میں ہی احمد حسن کی والدہ کو خوب صورت اور سادہ نازیہ اس قدر بھائی کہ وہ اگلے ہی ہفتے رشتہ لے کر آ گئیں۔

احمد حسن کی گورنمنٹ جاب تھی۔ تنخواہ بھی بندھی مگر کم تھی۔ اماں نے اس بات پر اعتراض کیا۔ لیکن ابا کو تو احمد کی شرافت اور سادگی اتنی بھائی کہ انہوں نے بھائیوں سے مشورہ کر کے ہاں کر دی۔ یوں نازیہ احمد حسن کی دلہن بن کر اس کے گھر آ گئی۔ احمد دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ دونوں بہنوں کی اماں (ساس) نے کم عمری میں شادیاں کر دیں۔ وہ اپنے گھروں میں خوش تھیں۔ ابا بھی جیسے نازیہ کا فرض ادا کرنے کے انتظار میں تھے۔

ادھر نازیہ نے گھر گرہستی سنبھالی ادھر چھ ماہ بعد ابا میاں کو پہلا اٹیک ایسا جان لیوا ہوا کہ وہ پھر جانبر نہ ہو سکے۔

ابا میاں کی وفات کے بعد نازیہ کو لگا کہ وہ اچانک کڑی دھوپ میں آ گئی ہے۔ اماں اور احمد کی دل جوئی کے بعد نازیہ کچھ سنبھلی۔ حسین کی آمد کے بعد اس کی زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آ گیا۔ حسین کے فوراً بعد احسن اور پھر چھوٹے علی کی آمد نے اس کی دنیا مکمل کر دی۔ پہلے تو وہ کئی کئی دن میکے جا نہ پاتی۔ اگر چلی بھی جاتی تو بھائیوں کی سرسری ملاقات اور بھابیوں کے مہنگائی کے رونے سے گھبرا کر جلدی اٹھ جاتی۔ حالانکہ بھائیوں کی آمدنی کم نہ تھی۔ سب کے ذاتی کاروبار تھے مگر پھر بھی یہ کیسی ناشکری تھی کہ جب بھی ملتیں، بھابیاں یہی رونا روتیں۔ اخراجات زیادہ ہیں۔ آمدنی پوری نہیں پڑتی وغیرہ وغیرہ۔

ایسے ماحول میں ہمیشہ اس کا دم گھٹنے لگتا۔ پھر آہستہ آہستہ ایسا ہونے لگا کہ وہ گھر سے کھانا کھا کر بس گھنٹے دو گھنٹے کے لیے ماں سے مل آتی۔ اس کی کوشش ہوتی کہ وہ کچھ بھی نہ کھائے پیے۔

اس بار رمضان اپنی تمام تر برکتوں کے ساتھ آیا۔ لیکن احمد حسن کی قلیل تنخواہ میں ساس کی بیماری۔ نندوں کی عیدیوں اور ماہ رمضان کے دوسرے اخراجات کی وجہ سے نازیہ کو بچوں کے کپڑے بنانا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ فکر کرنے کے بجائے وہ اللہ سے روز دعا کرتی کہ اللہ تو ہی ہے جو میرا واقف حال ہے۔ تیرے علاوہ میں کسی سے رجوع نہیں کرتی۔ کسی سے مدد نہیں مانگتی۔ اب بھی تو ہی ہے جو میری ضرورت پوری کرے گا۔ ہر نماز کے بعد دعا مانگ کر نازیہ کا جی ہلکا ہو جاتا کہ اللہ کوئی نہ کوئی سبب بنا دے گا۔

گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور ساتھ ہی نازیہ بھی خیالوں سے باہر آ گئی۔ تین سالہ علی اس کی گود میں سو گیا تھا۔ ڈاکٹر کا کلینک سامنے تھا۔ مجھلے بھیا نے کہا۔

"چلو نازیہ! تم بچوں کو سنبھالو۔ میں تمہاری بھابی کا چیک اپ کروا کے آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ بھابی کو لے کر چلے گئے اور نازیہ سات سالہ علی اور ڈیڑھ سالہ اطہر کو لے کر باہر نکلی۔ اور ویٹنگ لاؤنج میں ان کا انتظار کرنے لگی۔

ڈاکٹر کے ویٹنگ لاؤنج میں وہ ایک بچے کو سنبھالتی تو دوسرا صوفے سے اتر کر بھاگنے لگتا۔ دوسرے کو سنبھالتی تو تیسرا۔

تینوں کو سنبھالنے کے چکر میں نازیہ ہلکان ہو رہی تھی۔ خدا خدا کر کے بھائی اور بھابی باہر آئے۔ پھر اطہر کو چیک کروانے دوسرے ڈاکٹر کے کلینک چلے گئے۔ نازیہ پھر دونوں بچوں کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کا بیٹا علی موبائل لے کر صوفے پر بیٹھ کر کارٹون دیکھنے لگا پر بھتیجا احمد بھی کہتا۔

"پھوپھو پیاس لگی ہے۔ کبھی واش روم جانا ہے۔ کبھی بھوک لگی ہے۔" نازیہ بہلا بہلا کر تھک گئی۔ اتنے میں بھائی بھابی بھی اطہر کو چیک کروا کر آ گئے۔ تو نازیہ کی جان میں جان آئی۔ شاید اب بھائی گھر جانے کی بات کریں گے۔ لیکن بھائی نے کہا۔ "بچوں کے عید کے کپڑے لینے ہیں کیوں نہ شاپنگ کرتے جائیں۔"

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق نازیہ نے کہا۔

"جی جی بھائی جیسی آپ کی مرضی۔" اور بھائی کے ساتھ ایک بڑے شاپنگ سینٹر آ گئی۔ بھائی اور بھابی نے حسب معمول بچے نازیہ کے حوالے کیے

اور خود شاپنگ میں مصروف ہو گئے۔

نازیہ ایک بچے کو سنبھالتی تو دوسرا کسی گیلری میں نکل جاتا اور دوسرے کو سنبھالتی تو پہلا کسی دکان میں گھس جاتا۔

بے حد رش کی وجہ سے نازیہ بہت گھبرائی ہوئی تھی کہ اگر کسی بچے کو کوئی نقصان پہنچا تو بھائی کیا کہیں گے۔ بچے اس کی نظر بچا کر دکان میں ماں باپ کے پاس چلے جاتے تو بھائی باہر آ کر اسے ڈانٹتے۔

"نازیہ ان کو تو پکڑو ایک ذرا سے بچے تم سے نہیں سنبھالے جاتے۔" وہ روہانسی ہو کر کہتی۔

"جی جی بھائی! میں دیکھتی ہوں آپ فکر نہ کریں۔"

رات کے بارہ بجے ان کی شاپنگ ختم ہوئی نازیہ بھی اب نڈھال سی ہو رہی تھی۔ بھائی نے اذن دیا کہ اب گھر چلتے ہیں۔

لاشعوری طور پر نازیہ اس بات کی منتظر رہی کہ بھائی، بھابی اس کے لیے نہ سہی تو چھوٹے علی کے لیے کوئی سوٹ کوئی شرٹ کوئی کھلونا لے کر آئیں گے۔ لیکن جب گاڑی میں بھابی نے ایک ایک کر کے اس کو اپنی شاپنگ دکھائی تو وہ سب بہت اچھا ہے کہہ کر مسکرا دی۔

واپسی کا سفر بہت طویل اور تھکا دینے والا تھا۔ یہ نہ تھا کہ نازیہ کو کوئی لالچ تھا بھائی سے۔ بس ایک مان تھا جس کی وجہ سے اس نے امید باندھ لی۔ تھک کر گاڑی کی سیٹ پر سر رکھا تو اندھیرے میں ایک آنسو نکل کر گریبان کو بھگو گیا۔ گھر آ کر ایک عجیب سی بے چینی تھی جس کی وجہ سے اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔

بالآخر سحری کا وقت ہوا۔ نازیہ نے سحری بنائی۔ خود کھائی اور احمد حسن کو دی۔ روزہ رکھا اور فجر کی نماز ادا کی۔

احمد حسن نماز پڑھ کر آئے تو اپنے کمرے میں آرام کرنے چلے گئے۔ اور نازیہ سجدے میں گر گئی۔ اور اللہ سے دعا کرنے لگی۔

"اے میرے اللہ تو ہی میرا واقف حال ہے۔ تجھ ہی سے مدد مانگتی ہوں۔ بچوں کے کپڑوں کا کوئی آسرا کر دے۔"

دعا مانگ کر وہ پرسکون ہو گئی جیسے اللہ نے اس کی سن لی ہو اور بس اب اس کی درخواست پر عملدرآمد ہونے والا ہے۔

شام کو افطاری کا سامان سیٹ کرتے ہوئے نازیہ نے دیکھا کہ احمد حسین آج کچھ زیادہ خوش اور مطمئن لگ رہے تھے۔ رات کو کمرے میں آتے ہی انہوں نے پندرہ ہزار نازیہ کے ہاتھ پر رکھا کہ "یہ لو بچوں کے عید کے کپڑے لے لو۔"

نازیہ نے حیرت سے پوچھا "کہاں سے آئے" تو احمد نے جواب دیا۔ "ایک دوست کی کمیٹی کھلی ہے میں نے اس سے پندرہ ہزار ادھار لیے ہیں اور کہا ہے کہ ہر ماہ پانچ پانچ ہزار کر کے لوٹا دوں گے نازیہ نے بے اختیار آسمان کی طرف دیکھ کر شکر الحمدللہ کہا۔

ابھی عید کو ایک ہفتہ ہی گزرا تھا۔ کہ صبح صبح اماں کا فون آیا۔

"ہیلو نازیہ...... جی اماں۔"

"نازیہ بیٹا تمہارے مجھلے بھیا کی گاڑی کا بہت بڑا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ بس اللہ نے میرے بیٹے کی جان بچالی ہے۔ ورنہ گاڑی کا تو وہ حال ہے کہ دیکھنے والے حیران ہیں کہ اس کو چلانے والا زندہ کیسے رہا۔ بیٹا آ کر اپنے بھیا کی خیر خیریت پوچھ جانا۔"

نازیہ نے کہا۔ "جی اماں میں آؤں گی شام کو۔" اور پھر سوچنے لگی کہ بہنیں بیٹیاں گھروں کے لیے بوجھ نہیں ہوتیں۔ ایک وقت کا کھانا یا ایک جوڑا یا عید میں دیا گیا پانچ سو یا ہزار ان کی سال بھر کی ضروریات پوری نہیں کرتا لیکن یہ صلہ رحمی، یہ محبت ان کا حق اور ان کا مان ہوتی ہے جسے شاید کوئی سمجھنے کو تیار نہیں ہوتا۔

☆☆

سرِ محفل سجا کوئی معجزہ

نوشین فیاض

تیز چبھتی دھوپ ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ جاتی دھوپ کا رنگ اوڑھے درختوں کے پتے سنہری ہو رہے تھے۔ امرود اور انجیر کے درخت برسوں کی ایستادگی کے باوجود پورے قد سے کھڑے تھے۔ ان دونوں درختوں کے ساتھ بندھے جھولے میں دراز بوڑھا وجود آنکھیں بند کیے ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا تھا۔

سفید رنگ کا مرکزی دروازہ رنگ روپ کھو کر گویا جوانی بیت جانے کا عندیہ دے رہا تھا۔ یہ وہ دروازہ تھا جو بے وقت دستک پر شاذ ہی کھلتا تھا مگر آج لس کی چاہ سے بے نیاز چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ کبھی کوئی چڑیا بھولے بھٹکے کسی درخت پر لحہ بھر کے لیے رکتی اور پھر ویرانی سے گھبرا کر پھر سے اڑ جاتی۔

شام کچھ ساعت کی دوری پر تھی۔ مرکزی دروازے سے آتی روشنی میں ایک دھبہ نمودار ہوا۔ پیروں تلے خشک پتے چیخ اٹھے تو بوڑھے نے چونک کر گردن اٹھائی اور دروازے کی سمت دیکھا۔

"کون ہے؟"

"السلام علیکم!" وہ اندر داخل ہوئی۔

"وعلیکم سلام۔" جواب حسب توقع کھردرا تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ سماعتیں زخمی ہو جائیں۔ وہ مسکرائی۔

"کیا کام ہے؟"

"مجھے ایک کمرہ کرائے پر چاہیے۔"

بوڑھے نے اسی حالت میں لیٹے لیٹے اسے گھورا۔ "تو یہاں کیا کرنے آئی ہو؟"

"آپ کے اس بڑے سے گھر میں ایک کمرہ کرائے پر مل جائے تو مجھے بہت سہولت رہے گی۔"

"میں نے کہیں لکھ کر لگایا ہوا ہے، کمرا کرائے کے لیے خالی ہے یا میں نے کسی سے کہا کہ مجھے کرائے دار چاہیے؟" عمر کے اس پہر بھی اس کی آواز میں کئی رتوں کا دم خم سانس لے رہا تھا۔

وہ خفیف سا مسکرا کر دھانی رنگ اڑی کرسی پر اپنا ہینڈ بیگ لٹکا کر بیٹھ گئی۔ سفری بیگ اس نے قدموں کے پاس رکھ لیا۔ سفر نے اسے بے حد تھکا دیا تھا۔ بوڑھے نے اس کی اس حرکت کو دیکھا ضرور مگر نظر چرا کر انجان بن گیا۔ لڑکی نے یہ بھی دیکھ لیا تھا۔ اس کے لب آہستگی سے پھیل کر سکڑ گئے۔

"صرف ایک ماہ کے لیے چھت کی ضرورت ہے۔ میں اکیلی ہوں، آپ کے معمولات میں بالکل مخل نہیں ہوں گی۔"

"تو تمہارے گھر بار والے کہاں ہیں؟"

"ماں باپ رہے نہیں اور بہنیں دونوں شادی شدہ اور اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں۔ باقی اس دور پر آشوب میں دور پار کا رشتہ دار ضرورت میں کب رشتہ دار ہوتا ہے؟"

"تو جتنی تمہاری عمر ہے، تمہاری شادی ہو جانی چاہیے تھی۔"

"میری شادی ہو چکی ہے۔ ہم دونوں سرکاری نوکری کرتے ہیں۔ میرا تبادلہ اس شہر میں ہو گیا ہے۔ اب میرے شوہر بھی تبادلے کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ امید ہے ڈیڑھ دو ماہ تک کام بن جائے گا۔" اس نے جھوٹ کی آمیزش کے ساتھ سچ کہا تھا۔ بات مکمل کر کے اس نے نظر گھمائی۔ در و دیوار دیکھے تھے۔ باورچی خانے کی کھڑکی کی جالی ابھی تک

مکمل ناول

زنی ہوئی تھی۔ قطار میں بنے کمروں کے آگے پائیدان بھی سال خوردہ اور تھکن سے چور تھے۔ دروازوں کے درمیان دیواروں پر گیس لیمپ بھی دھے تھے۔ اس نے نظر جھکالی۔ مکینوں کا تعلق ظاہر سے واقعی نہیں ہوتا۔ اسے اس بات کا یقین ہو گیا تھا۔

"مگر یہاں کوئی کمرہ نہیں ہے اور میں کسی کو اجازت بھی نہیں دے سکتا کہ وہ میرے گھر میں کمروں کے سامان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا پھرے۔"

"میں کسی بھی قسم کے نقصان کی ذمہ داری قبول کرتی ہوں۔ گارنٹی کے لیے جو کہیں چیک بھی ادا کرنے کو تیار ہوں۔" وہ اسے یہاں پر رہائش کی اجازت دینے والا تھا اس بات کو جاننے کے لیے اسے کسی راکٹ سائنس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے اس کی جھجک ختم کرنے کے لیے اس نے تیزی سے جواب دیا تھا۔

بے تحاشا سفید رنگت والے چہرے کی جھریوں میں ایک لمحے کے لیے کمی ہوئی تھی۔ چہرہ پر سوچ انداز میں کھنچ سا گیا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے مگر۔"

"میں یہ باورچی خانے کے ساتھ والا کمرہ لے لیتی ہوں۔ مجھے آسانی رہے گی۔" اپنا بیگ اٹھا کر اس کی بات پوری سنے بغیر وہ اٹھ کر اس کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"تو ثابت ہوا، کچھ خواب پورے کرنے کی ذمہ داری وقت کی ہوتی ہے۔ پھر چاہے وہ ذہن کے طاق پر دھرے زنگ آلود ہو جائیں یا وقت کی دھند کے اس پار کھو جائیں۔" اس نے سوچا۔

☆☆☆

کمرے کی حالت بھی باہر سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ ہر شے دھول مٹی میں اٹی پڑی تھی اس کے باوجود ایک قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ کمرے میں پڑے سنگل بیڈ کے ساتھ رکھی چھوٹی میز پر اپنا بیگ رکھ کر کچھ دیر وہ وہیں کھڑی دیکھتی رہی اور پھر گہرا سانس بھر کر باہر نکل گئی۔

"کوئی کپڑا ملے گا، میں تھوڑی جھاڑ پونچھ کر لوں؟"

"میرے پاس کچھ نہیں ہے لڑکی! یہاں رہنا ہے تو اپنے کام خود دیکھو، بار بار مجھے تنگ نہیں کرنا۔"

درشتی سے کہہ کر انہوں نے منہ پھیر لیا تو ایک نرم مسکراہٹ چہرے پر لیے وہ واپس کمرے میں چلی گئی۔ یہ کیا کم تھا کہ اسے یہاں رہنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ واپس آ کر اس نے اپنے بیگ سے قدرے زیادہ استعمال شدہ، دوپٹہ نکالا اور جھاڑ پونچھ کر کے کمرہ اٹھنے بیٹھنے کے قابل کر لیا۔ ایک تو اتنا لمبا سفر اور پھر سفر میں ایک اور سفر اور پھر suffer سے وہ بے حد تھک گئی تھی۔

بڑی شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ کہیں سے ایک کپ چائے مل جائے۔ دل کی چاہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے دروازہ بند کیا اور بستر پر لیٹ گئی۔ وہ کبھی بھی ایسی گہری نیند نہیں سوئی تھی مگر جتنا وہ تھک چکی تھی، اسے سو کر ہوش نہیں رہا۔ اب بھی دروازے پر دستک نہ ہوتی تو وہ جانے کب تک ہوئی رہتی۔

"یہ لو کچھ کھا لو اور برتن دھو کر سونا۔ میں سونے جا رہا ہوں، بلا ضرورت باہر کا دروازہ کھولنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے فرماں برداری سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اور ہاں آئندہ اپنے کھانے پینے کا انتظام خود کرنا ہوگا۔" وہ جاتے جاتے پلٹے تھے۔ "میرا مطلب ہے کچن میں سب کچھ موجود ہے اور اگر کچھ چاہیے ہو تو بتا دینا، میں منگوا دوں گا۔ بس اپنا پکا لینا خود ہی۔ میں مہمان نوازیاں نہیں کر سکتا۔"

"جی میں کر لوں گی۔ تکلیف کے لیے معذرت خواہ ہوں۔"

اس کی پوری بات سنے بغیر وہ دروازہ اس کے منہ پر بند کر کے باہر چلے گئے تھے۔

اس نے ٹرے کو را اٹھایا۔ اشتہا انگیز پلاؤ جانے کہاں سے آیا تھا۔ کھانا کھا کر برتن دھونے وہ کچن میں چلی گئی۔

جو آنے والا ہے وہ غیر یقینی ہے مگر جو جا چکا وہ امر ہے۔ ماضی کبھی نہیں مرتا، مگر وہ ایسے زندہ نہیں رہتا جیسے وہاں تھا۔ پتھر کی سرمئی شیلف کے ساتھ ہی عہدِ رفتہ کی یاد تازہ کرتا برتنوں کا اسٹینڈ تھا۔ آج جب جدید باورچی خانوں سے اسٹینڈ نکل چکے تھے اور کیبنٹ آ گئے تھے، وہاں وہ سال خوردہ اسٹینڈ موجود تھا۔ دیوار پر ماچس رکھنے والا ریک بھی وہی تھا، نیلا بھالیہ اور اسی کچن میں ایک تھپڑ کی بازگشت بھی زندہ تھی۔ اس نے بے ساختہ ایک ہاتھ اپنے بائیں گال پر رکھا تھا۔ آج بھی اس کا گال تپ رہا تھا۔ آج بھی ابھی وہ رو دی تھی۔

آنسو صاف کر کے برتن احتیاط سے رکھ کر وہ واپس اسی کمرے میں آ گئی۔ زندگی کی پہیلی اس نے کبھی بوجھنے کی نہ کوشش کی تھی، نہ خواہش مگر اب یہ ریشم ایسا الجھا تھا کہ سلجھانے کی سعی میں وہ خود الجھ گئی تھی۔

وقتی طور پر وہ یہاں آ گئی تھی۔ تنہائی سے فرار اگرچہ یہاں بھی ممکن نہیں تھا مگر توجہ بٹ گئی تھی۔ پھر بھی وہ کب تک یہاں رہ سکتی تھی؟ وہ اکیلی کیسے زندگی کی بھول بھلیوں سے نکل کر منزل پر پہنچ سکتی تھی؟ وہ تو اپنے تئیں منزل پا چکی تھی مگر زندگی ہمیشہ چال چلتی ہے جو وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتی۔

اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ یہ اس کا خوف ہی تو تھا جو اس نے تنہا رہنے پر اس سنکی بوڑھے کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی تھی۔

رات کا نرم اندھیرا پھیل چکا تھا۔ رنگ اڑی کھڑکی کے پٹ بند کر کے وہ واپس پلٹ گئی۔ اس نے اپنے سفری بیگ میں سے ایک کتاب نکالی اور بستر پر لیٹ گئی۔ نظر کتاب کے صفحوں پر سفر کرنے لگی اور اس کا ذہن ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگا۔ ایک چہرے پر ذہن مرتکز ہوا اور آنکھوں سے گرم گرم آنسو بہنے لگے۔

☆☆☆

ساری شام سو کر گزارنے کے بعد ساری رات اس نے کتاب ہاتھ میں پکڑ کر نم آنکھوں کے ساتھ گزاری تھی۔ فجر سے ذرا پہلے نیند آنکھوں میں اتری تو پھر صبح پورا اجالا پھیلنے پر ہی آنکھ کھلی۔

بستر پر لیٹے کچھ دیر تو اسے یاد ہی نہیں آیا وہ کہاں ہے اور کیوں ہے۔ رفتہ رفتہ یادداشت بحال ہوئی تو گہرا سانس بھر کر گھڑی دیکھتی وہ اٹھ بیٹھی۔

صبح کے ساڑھے سات کا وقت تھا۔ بالوں سے پونی نکال کر دوبارہ چڑھاتے اس نے جوتوں میں پیر پھنسائے اور دوپٹہ پھیلا کر سر پر ڈالا۔ دروازہ کھول کر باہر نکلی تو منظر کل سے مختلف نہیں تھا۔ وہی میلا اجالا اور بکھرا بکھرا منظر۔ اس منظر کے عقب سے ایک منظر اور نکلا تھا۔

دھلی نکھری روش اور درختوں کی بانہوں پر ان گنت سبز پتے، گلاب پر پھول ہی پھول اور ان کی خوشبو سے مہکتا آنگن۔ باورچی خانے سے اٹھتی چائے کی خوشبو ہمیشہ اس کے حواس گم کر دیتی تھی۔ سر جھٹک کر وہ سوچوں کے گرداب سے نکلی اور نپے تلے قدم اٹھاتی باہر آ گئی۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام۔ ناشتہ بنا لو اپنا یا رات کے چاول پڑے ہیں، وہی گرم کر کے کھا لو۔"

"ٹھیک ہے۔ اور آپ کے لیے کیا لاؤں؟"

ایک گہری نظر اس کے چہرے پر ڈال کر انہوں نے منہ پھیر لیا۔

"میں صبح صبح ناشتہ نہیں کرتا۔"

"جی ٹھیک۔" وہ باورچی خانے کی طرف مڑی۔

"ستو لڑکی.. نام کیا ہے تمہارا؟"

"قصہ۔" اس کے منہ سے بے اختیار پھسلا تھا۔ پھر اس نے واضح طور پر اس جھریوں بھرے چہرے پر دراڑیں پڑتی دیکھی تھیں۔ رخ بدل کر وہ آہستہ روی سے باورچی خانے میں چلی گئی۔ اس نے فریج کھولا مگر اس میں کوئی پھل نہیں تھا۔ ناشتے کی فی الحال کوئی طلب نہیں ہو رہی تھی، اس لیے دو کپ چائے بنا کر اس نے ٹرے میں رکھے اور باہر آ گئی۔

"انکل! چائے لے لیں۔" ایک کپ ان کے سامنے رکھتے اس نے دانستہ ان کی طرف دیکھنے سے احتراز برتا۔ جانے انکل کہنے پر ان کا ردعمل کیا ہوتا لیکن انہوں نے خاموشی سے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

الائچی کی بھینی خوشبو کے ساتھ، تیز گرم چائے کا پہلا گھونٹ ہی انہیں جتلا گیا کہ کچھ بھی اتفاق نہیں ہے۔ کوئی بھی پہلی بار بناتے ان کی پسند کی چائے کیسے بنا سکتا تھا؟ وہ بھی اس قدر پرفیکٹ مٹھاس اور رنگت والی۔

"چائے ٹھیک نہیں بنی؟" اس کے لہجے میں ایک خوف، ایک اشتیاق تھا۔ ان کی خاموشی اسے واہمے میں مبتلا کر گئی تھی۔

"ہوں۔" کہہ کر وہ چائے پینے لگے اور صبا کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ انہوں نے اس کے ہاتھ سے چائے پی لی تھی۔

دوپہر تک اس نے تمام کمروں کی صاف صفائی کر لی تھی۔ گرد و غبار صاف ہونے کے باوجود ہر شے بتا رہی تھی کہ ایک عمر، ایک عرصہ بیت چکا ہے۔ بظاہر انکل خاموشی سے لیٹے ہوئے تھے مگر وہ بند آنکھوں سے بھی، اس کی قدموں کی چاپ سن کر اندازہ کر سکتے تھے کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔ سارے کام نمٹا کر وہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔

"میں ضروری کام سے بازار تک جا رہی ہوں۔ ایک آدھ گھنٹے تک آ جاؤں گی۔ کچھ منگوانا ہے

آپ نے؟"
ان کا نفی میں ہلتا سر دیکھ کر اسے ایک بے نام دکھ نے گھیر لیا تھا۔ گھر میں بہت کچھ نہیں تھا۔ بہت کچھ ایسا جو کبھی اس گھر کا حصہ تھا یا کسی روایت سے جڑا تھا۔ تو کیا انہوں نے سب فراموش کر دیا تھا؟ یہ سوچنا ہی تکلیف دہ تھا۔ بھاری دل کے ساتھ وہ گھر سے باہر نکل گئی۔

وہ ریٹائرڈ پروفیسر تھے۔ شریکِ حیات بھی اسسٹنٹ پروفیسر ہوا کرتی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد احساس ہوا کہ وہی تھیں جنہوں نے اس گھر کے ساتھ انہیں بھی سمیٹ رکھا تھا۔ ان کی زندگی میں لگتا تھا سب خودکار طریقے سے ہو رہا ہے لیکن جب ان کی وفات کے بعد ایک کے بعد ایک ملازم آتا اور جاتا رہا تو انہیں احساس ہوا کہ یہ سارا انتظام ملازم نہیں وہ چلا رہی تھیں۔ سمیعہ نے انہیں جس طرزِ زندگی کا عادی بنا دیا تھا، وہ مہیا کرنا کسی ملازم کے بس کی بات نہیں تھا۔ اب یہ لڑکی آئی تھی اور اس میں سمیعہ کی جھلک دکھائی دیتی تھی لیکن اپنا پتا نہیں دیتی تھی کہ یہ تھی کون۔

اس کے جانے کا یقین کر کے وہ پھرتی سے اٹھے۔ یوں جیسے ابھی اس کے لوٹ آنے کا احتمال ہو۔ اپنے کمرے سے سال خوردہ پی ٹی سی ایل کا فون سیٹ نکال کر انہوں نے بیڈ کی میز سے ایک ڈائری نکالی اور نمبر ملا دیا۔

☆☆☆

سہ پہر ڈھلے جب وہ واپس پہنچی تو چل چل کر اس کے پیروں میں اور شاپر اٹھا اٹھا کر اس کے ہاتھوں میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اسے اس سب کی عادت تھی۔ ابتسام نے کبھی اس کے لیے مدد جیسا کوئی تکلف نہیں کیا تھا۔ تنور میں بجھتی آگ جیسی دھوپ سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اگرچہ تیز نہیں تھی مگر حرارت بہت تھی۔
کچھ دیر آرام کرنے کی خواہش کو مشکل سے سلا کر وہ منہ ہاتھ دھو کر فوراً باورچی خانے میں چلی گئی

تھی۔ چاول بھگو کر کباب کا مسالہ تیار کرنے لگی۔ دو افراد کے کھانے کے لیے کتنا زیادہ کھانا بنایا جا سکتا تھا۔ جھٹ پٹ سلاد اور رائتہ بنا کر اس نے کباب تلے اور ساتھ ہی ساتھ چاول بھی بگھار لیے۔ باورچی خانے کی دیوار کے ساتھ پڑی میز کو اچھی طرح صاف ستھرا کر کے وہاں کھانا لگایا اور ایک بھرپور نظر میز پر ڈال کر باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ دل کی دھڑکن معمول سے کچھ زیادہ تیز تھی۔
وہ کوئی پرانا انگلش اخبار منہ کے آگے کیے لیے یکسر نظرانداز کیے بیٹھے تھے۔
"انکل! کھانا کھائیں گے؟ اصل میں مجھ سے اکیلے نہیں کھایا جاتا۔" اپنی پیشکش پر ان کے متوقع برے ردعمل کے پیشِ نظر اس نے گھبرا کر وضاحت بھی کر دی تھی۔
اخبار لپیٹ کر پہلو میں رکھا اور وہ ایسے اٹھ کھڑے ہوئے جیسے وہ پہلے سے اسی پیشکش کے منتظر تھے۔
میز پر کھانا دیکھ کر انہوں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ خاموشی سے کھانا کھا کر وہ اٹھ گئے تو گنتی کے چار برتن دھو کر، اس نے چائے بنائی اور ایک ٹرے میں رکھ کر ان کے پاس لے گئی۔ اخبار سامنے میز پر پڑا تھا اور وہ آنکھیں بند کیے کرسی میں دھنسے بیٹھے تھے۔
ہوا رکی ہوئی تھی اور ایک حبس کی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ مینائیں پھدکتی ہوئی ایک سے دوسرے درخت پر جا رہی تھیں۔ کوؤں نے الگ راگ چھیڑ رکھا تھا۔ اسے یاد آیا، امی کہتی تھیں جب کوا بولتا ہے تو کوئی مہمان آتا ہے۔ ایک پھیکی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیلتے پھیلتے سکڑ گئی۔ چائے میز پر رکھ کر اخبار اٹھا کر وہ بھی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔
"تمہیں اپنا کوئی کام نہیں ہے؟ میری تنہائی میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دی میں نے تمہیں۔ جو چار دن یہاں ہو، ڈھنگ سے رہو ورنہ اپنا ٹھکانا کہیں اور کر لو۔"

تھی کہ اس کی چھوٹی چھوٹی بے وہ نہیں جانتی ان کو کس وہم میں مبتلا کرتی ہیں۔ بیٹھے بیٹھے خود وہ ایک دم الرٹ ہو کر ایسے کھڑی ہوئی جیسے پرائمری اسکول کی بچی استاد کی آواز پر حواس کھولی
"بس... سوری۔ سوری۔ میں بس.. ایسے ہی بس۔" اس کے الفاظ گم ہو گئے تھے ایسی غیر متوقع عزت افزائی پر۔
وہ ایسی بدحواس ہوئی تھی کہ میز پر سے اپنا چائے کا کپ اٹھائے بنا ہی اندر دوڑ لگا گئی تھی۔
بھربھری مٹی کی چٹان کی دراڑوں میں آنسوؤں کا پانی بہنے لگا تھا۔ یہ لڑکی کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ اس کے ایک ایک قدم پر گئے گزرے زمانے لوٹ کر آنے لگے تھے۔
میز پر کھانا لگانے کا انداز کہہ رہا تھا یہ سلیقہ اس گھر سے چرا لیا گیا ہے۔ چائے کا ذائقہ بتا رہا تھا کہ وہ غیر نہیں کوئی شناسا ہے۔ کوئی محرم ہے جو سب راز جانتا ہے۔ مگر وہ تھی کون؟
آنسوؤں کا ذائقہ چائے کی پیالی میں گھل گیا تھا اور فضا میں حبس کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ اندھیرے کمرے میں برسنے والی برسات اور تھی، لان میں کرسی پر نیم دراز وجود کی آنکھ سے ٹپکنے والے آنسو کوئی اور تھے۔ وہ دونوں انجان تھے کہ ان کے بیچ غم آزمانا ایک ہی تھا۔

☆☆☆

وہ کب سے دروازے پر لگی گھنٹی کا بٹن دبا کر کھڑا تھا مگر وہ دروازہ جسے کبھی دستک کی ضرورت نہیں پڑی تھی، اندر سے بند تھا۔ ایک تو آج گرمی کی انتہا تھی اور دوسرا اسے امید نہیں تھی، دروازہ بند بھی مل سکتا ہے۔ وہ جھنجھلایا ہوا تھا۔ سارے اخلاقی سبق بھلائے وہ گھنٹی بجائے جا رہا تھا۔
"کون ہے؟" دروازے کی دوسری سمت سے ہموار آواز سنائی دی۔
"دروازہ کھولیں۔ میں وجاہت حسن ہوں۔"

"کون وجاہت حسن؟"
"اقبال صاحب کا بیٹا۔ اب اگر مزاج پر گراں نہ گزرے تو باقی انٹرویو پنکھے کی ہوا میں بیٹھ کر لے لیں؟"
"لیکن ان کا تو کوئی بیٹا نہیں ہے۔" بلا ارادہ ہی اس کے ہونٹوں سے پھسلا تھا۔ سرزنش کرتے اس نے زبان دانتوں تلے دبائی تھی۔ سوچنا موقوف کر کے اس نے دروازہ کھول دیا۔
وہ ایک پچیس چھبیس سال کی لڑکی تھی۔ یقیناً وہ ابھی نہا کر آئی تھی اور اسی وجہ سے دروازہ دیر سے کھلا تھا۔ اس کے سیاہ گیلے بال چہرے سے چپکے ہوئے تھے۔ یہ بالکل بھی کوئی فلمی اور خوب صورت منظر نہیں تھا۔ لڑکی سے نظر ہٹا کر اس نے بابا کی مخصوص جگہ پر دیکھا۔ وہ وہاں نہیں تھے۔
"بابا کہاں ہیں؟"
"کون بابا؟" وہ جانے کس دھیان میں تھی۔
"ظاہر ہے میرے بابا۔ اب آپ کے بابا کا تو پوچھنے سے رہا۔ میں نے کون سا رشتہ بھجوانا ہے۔"
وہ اس کی بات پر پہلو بدل کر رہ گئی۔ اگر وہ اس گھر کے مالک کا بیٹا نہ ہوتا تو وہ دروازہ ہی نہ کھولتی۔ کیسا بے باک تھا۔
"گھر پر نہیں ہیں۔ بازار تک گئے ہیں۔"
"بابا اور بازار......" وجاہت کو حیرت ہوئی تھی۔ کتنا وقت ہو گیا تھا انہیں اس گھر سے کہیں باہر نکلے۔ حجام گھر آ کر حجامت بنا دیتا تھا۔ اخبار والا تازہ اخبار روز وقت پر گھر پہنچا جاتا تھا۔ کام والی آ کر کام کر جاتی تھی۔ ساتھ کے گھر میں ایک بیوہ رہتی تھی جو اجرت پر ان کا کھانا بنا دیا کرتی تھی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اتنے عرصے بعد کون سا ایسا کام تھا جو بابا کو بازار کے راستے پر لے گیا تھا۔ دھلے دھلے شفاف منظر پر نظر جمائے وہ وہیں سوچ میں گم تھا۔
پیچھے دروازہ کھلا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دروازہ بند کر دے یا وہیں کھڑی اس کے جانے کا انتظار کرے۔ وہ اس کی پریشانی سمجھ گیا تھا۔

”میں کوئی چور لٹیرا نہیں ہوں، اطمینان رکھیں اور دروازہ کھلا رہنے دیں۔ آپ سے پہلے مجھے بھی یہ دروازہ بند نہیں ملا۔“

اثبات میں سر ہلانے کے باوجود اس نے دروازہ بند کر دیا۔ تب تک وہ اندر جا چکا تھا۔ اس کا رخ لان میں پڑی کرسیوں کی طرف تھا۔ پنکھا چلا کر اس کا رخ اپنی طرف موڑ کر کرسی درخت کے سائے میں کر کے وہ وہیں بیٹھ گیا۔ آئرہ اسے وہاں بیٹھتا دیکھ کر باورچی خانے میں چائے بنانے چلی گئی۔ وہ حیران تھی کہ اگر اقبال صاحب کا کوئی بیٹا تھا تو اسے کیوں پتا نہیں تھا؟ اسے تو ان کی صرف ایک بیٹی کا پتا تھا۔ وہ چائے بنا کر لائی تو وجاہت حسن غنودگی میں تھا۔ جیسے اتنی گرم ہوا میں کب فطرت نے ٹھنڈک کی طلاوت کی اسے پتا ہی نہیں چلا۔ درخت اپنی شاخیں لہرا لہرا کر جھوم رہے تھے۔ اپنے سیاہ اڑتے دوپٹے کو بمشکل قابو کرتے اس نے میز پر چائے رکھی اور آواز دے کر واپس جانے کے لیے مڑی۔

”اتنی گرمی میں چائے کون پیتا ہے؟“

”آپ کے بابا۔“ لبوں کا کونہ دبا کر اس نے مسکراہٹ روکی۔

”تو یہ بابا کے لیے رکھیں۔ میں سادہ پانی پی لیتا ہوں۔“

”میں لا دیتی ہوں۔“ وجاہت جانے کے لیے اٹھا تو وہ فوراً بول پڑی۔ چائے کا کپ اپنے لیے رکھ کر اس نے فریج میں سے آلو بخارے کا شربت نکالا اور ٹرے میں گلاس کے ساتھ رکھ کر لے آئی۔

”شکریہ۔“

بنا کچھ کہے وہ واپس چلی گئی اور وجاہت گرد و پیش پر نظر دوڑاتے، شربت کی ٹھنڈک وجود میں جذب کرنے لگا۔

ایل کی شکل کی پکی روش دھلی اور نکھری ہوئی تھی۔ لان بھی جیسے کسی نے بڑی محنت سے صاف کیا تھا البتہ پودوں کو تراش خراش کی ضرورت تھی۔ جہاں جہاں تک نظر جا رہی تھی ایک آباد گھر کا منظر اسے سکون دے رہا تھا۔ اس گھر میں عورت کے وجود کا بھرپور احساس سانس لے رہا تھا۔ اس لڑکی کو دیکھ کر ہی اسے بابا کی تشویش بے جا لگی تھی مگر اس گھر میں اس کی موجودگی کے اثرات دیکھ کر اسے احساس ہوا تھا کہ بابا اس لڑکی کو لے کر ٹھیک پریشان تھے۔

اس کے شربت ختم کرنے سے پہلے بابا بھی آ گئے تھے۔

”السلام علیکم بابا جان۔“

”وعلیکم السلام۔ کب آئے؟“ میز پر ایک عدد شاپر رکھتے وہ اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گئے۔ تھکن ان کے چہرے سے مترشح تھی۔

”جب آپ سیریں کرتے پھر رہے تھے۔“ کہتے ہوئے مسکرا کر اس نے شربت گلاس میں ڈال کر ان کے آگے رکھا۔

”بس یار کہاں کی سیریں۔ جوان جہان لڑکی ہے اکیلی باہر نکلتی ہے تو ڈر لگتا ہے۔“

شربت کا گلاس انہوں نے ایک ہی سانس میں خالی کیا تھا۔ کمرے کی کھڑکی سے آئرہ نے وجاہت کو اپنے جوٹھے گلاس میں شربت ڈالتے اور انہیں اس گلاس میں شربت پیتے دیکھا تھا۔ اس نے آنکھیں مسلیں۔ اس نے بالکل ٹھیک دیکھا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو کسی کے گلاس میں پینا تو در کنار، خود گلاس کو بھی دو بار دھلوائے بغیر پانی نہیں پیتا تھا۔

”سب بدل گیا کیا؟“ اس نے خود سے پوچھا اور کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئی۔

”کتنے دن کے لیے آئے ہو؟“

”ہمیشہ کے لیے۔“ کھڑکی سے اسے ہٹتے دیکھ کر وجاہت نے نگاہ کا زاویہ بدلا۔

”اگر اس لڑکی کے لیے کہہ رہے ہو تو تمہیں بتا دوں، یہ شادی شدہ ہے۔“ اس کی طرف جھک کر انتہائی رازدارانہ انداز میں انہوں نے شرارت سے کہا۔

”مگر لگتی نہیں۔“ اس نے بھی اسی شرارت سے جواب دیا۔ ”لگتے تو تم بھی... زیادہ... کیا ہوتا ہے؟ لگتے تو تم بھی...“

”آپ بھی کس معاملے میں مجھے گھسیٹ لیا [illegible] کرنے کے لیے آیا ہوں اور یہ مدت کم زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔“ اس نے خفگی سے جواب دیا۔ بابا نے ہزار بار انہیں اپنے گھر آ کر رہنے کا کہا تھا لیکن وہ یہاں سے کہیں جانا نہیں چاہتے تھے۔ ہاں جو اگر ان کے پاس رہنے آ جاتا تھا۔

”کیا تم نے کچھ غور کیا؟ ایسا نہیں لگتا یہ کوئی جاننے والی ہے۔“

”لگتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ کوئی جاننے والی ہے اور آپ اسے نہیں جانتے تو یہ کیسے اتنا کچھ جانتی ہے اور یہ بھی کہ اس طرح شناخت چھپا کر کیا کرنا چاہتی ہے۔“

”یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ یہ کون ہے اور کیا چاہتی ہے۔“

انہیں وہ لڑکی گھر کے اندر داخل ہونے سے ہی کھٹک گئی تھی۔ کوئی بھی خاص طور پر ایک لڑکی کہیں کسی گھر میں داخل ہوتے سو بار سوچتی ہے اور یہاں وہ کتنے آرام دہ انداز میں نہ صرف داخل ہوئی بلکہ یہاں رہنے میں بھی اسے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ کمرے میں کتاب لے کر بیٹھی آئرہ کو ذرا اندازہ نہیں تھا کہ وہ انہیں کتنی الجھن میں ڈال چکی ہے۔

☆☆☆

آج یا کل میں رمضان کا چاند نظر آنے والا تھا۔ رمضان میں بازار نکلنے کا تصور ہی سوہان روح تھا سو دوپہر میں وہ بازار جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ کھانا پکانے کے لیے بہت سی چیزیں آنے والی تھیں۔ وہ چادر اوڑھ کر باہر نکلی تو وجاہت حسن اسے مرکزی دروازے کے قریب ہی مل گیا۔ نظر انداز کرتی وہ منہ ڈھانپ کر باہر نکل آئی۔ اسے اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ اس کے ساتھ جا رہا تھا یا اپنے کسی کام سے جا رہا تھا۔ بارہ پندرہ منٹ میں اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔

”اگر آپ اپنے کسی کام سے جا رہے ہیں تو پلیز فاصلہ رکھ کر چلیں۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ آپ میرے ساتھ ہیں۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔ گویا خوف ہو کوئی سن لے گا۔

”مگر میں یہی چاہتا ہوں کہ لوگ یہ سمجھیں آپ میرے ساتھ ہیں۔“ جتنے دھیمے پن سے اس نے کہا تھا وجاہت نے اتنی ہی تیزی سے اس کی بات کا جواب دیا تھا اور پھر ذہن میں کسی منظر کے ابھرنے پر ایک دم خاموش ہو گیا۔ اسے ایسے لگا جیسے اس نے بات درمیان میں روک دی ہے۔

”آپ کے اکیلے آنے سے بابا کو مسئلہ ہے۔ انہیں پریشانی سے بچانے کے لیے۔“ جھکے سر کے ساتھ چلتے اس نے وضاحت دی۔ وہ اس طرح نکلی تھی کہ اسے گاڑی نکالنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔

وہ خاموشی سے چلتی رہی۔ نزدیکی مارکیٹ سے پھل، سبزیاں اور دوسرے مسالہ جات کی خریداری کے دوران وہ بالکل خاموشی سے اس کے ساتھ رہا۔ جہاں جہاں ادائی کرنی ہوتی، وہ اسی خاموشی سے نکال کر پیسے دیے جاتا اور اس کے ہاتھ بڑھانے سے پہلے سامان پکڑ لیتا۔ پتا نہیں کیوں اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی اور اندر کہیں کسی کونے میں آنسو گر رہے تھے۔ کوئی تھا جو اس کے ساتھ تھا اور اس کا بوجھ بھی اٹھا رہا تھا اور یہ کوئی وہ نہیں تھا جسے ہونا چاہیے تھا۔

”ویسے تمہارا شوہر کرتا کیا ہے؟“ اس کے ساتھ چلتے وہ پوچھ رہا تھا۔

”واپڈا میں ملازم ہیں۔“

”یعنی گالیاں کھانے والے کام کرتا ہے اور تم کیا کرتی ہو؟ بابا بتا رہے تھے تمہارا یہاں تبادلہ ہوا ہے۔“

اس نے کڑی نظروں سے اسے گھورا تھا۔ ”میں جو بھی کرتی ہوں، تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟“

”میں تو بس جنرل نالج کے لیے پوچھ رہا تھا

اور دیکھو تم شادی شدہ ہو، میں محبت شدہ۔ میں جس سے محبت کرتا ہوں وہ بھی مجھ پہ جان چھڑکتی ہے اور اس سال میں ہماری شادی ہو جائے گی۔ اس لیے اپنا تو معاملہ بالکل صاف سیدھا ہے۔ تم دل پہ مت لینا۔"

اس کی بکواس پر اس کا خون کھول کر رہ گیا تھا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے، تم بے حد گھٹیا بکواس کرتے ہو؟"

"ارے واہ۔۔ تم سے تو بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ جیسے مجھے ابھی تم سے پتا چلا بکواس بڑھیا بھی ہو سکتی ہے۔"

اسے بے اختیار ہنسی آئی تھی لیکن سختی سے منہ بھینچ کر چلتی رہی۔

گھر آ کر سامان سمیٹتے وہی جاں گسل درد ایک بار پھر، رگ و پے میں جنوری کی سرد ہوا کی طرح اترنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں کی طمانیت اور ہونٹوں کی پُرسکون گنگناہٹ بھاپ میں تحلیل ہوتے وجاہت حسن نے بغور دیکھی تھی۔ مگر یہ اس کا سر درد نہیں۔ اس نے سوچا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ اس کے سر کا درد نہیں بلکہ دل کا درد بننے والی تھی۔

ایک ہی دن وہاں گزار کر اسے احساس ہو رہا تھا کہ واقعی وہ بھید جاننے والی تھی۔ پانی کا گلاس دینے تک وہ اس گھر کے مروجہ اصولوں پر چلتی تھی۔ آنٹی زندہ تھیں تو وہ ہمیشہ چینی پلیٹ میں شیشے کا گلاس ڈھک کر دیتی تھیں اور اسی طرح پسند کرتی تھیں۔ یہ بھی اسی طرح کرتی تھی۔ کھانے پینے کے اوقات کے ساتھ ساتھ میز پر برتنوں کا سلیقہ اس کے ہمراز ہونے کی چغلی کھاتا تھا مگر وہ کسی پکڑ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ بابا کے کمرے میں ان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جب اسی شام رمضان کا چاند نظر آ گیا۔

"جا کر پوچھ لو، کہیں صبح روزہ رکھنا ہو۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو لا دو۔"

بابا جان کے کمرے سے باہر نکلا تو وہ اپنے زیرِ تعمیر کمرے میں نماز ادا کر رہی تھی۔ کچھ دیر وہ کھڑکی سے اس کے ہیولے کو تکتا رہا اور پھر واپس بابا جان کے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

عشاء کی نماز کے بعد وہ گھر آیا تو اس کا فون بج رہا تھا۔ فون لے کر وہ چھت پہ چلا گیا۔ اسے احساس نہیں ہوا کہ وہ دانستہ ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں سے اپنے کمرے میں کتاب پکڑ کر بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھی وہ واضح دکھائی دے رہی تھی۔ اس لڑکی نے آج اسے کئی بار حیران کیا تھا۔ صبح جب وہ اٹھا تو وہ چہرے پہ پریشانی لیے شیلف کے سامنے کھڑی تھی۔

"گیس نہیں آ رہی اور مجھے سحری کے لیے روٹی بنانی ہے۔ کوئی سلنڈر وغیرہ ہے یہاں؟"

"سلنڈر کا تو بابا ہی بتا سکتے ہیں کیونکہ مجھے تو اس کا نہیں پتا۔ میں بازار سے روٹی لا سکتا ہوں۔"

گھڑی پر نگاہ کرتے اس نے ایک بار پھر چولہا جلانے کی کوشش کی۔

"میں روٹی لے کر آتا ہوں۔ تب تک اوون میں سالن گرم کر لو۔"

تھی چھوٹی سی بات تھی لیکن سحری کے بعد جب وہ فجر پڑھ کر گھر واپس آیا تو وہ جتنی شکر مندی دکھا رہی تھی، اس نے وجاہت حسن کو بہت حیران کیا تھا۔ بازار سے روٹی لا کر دینا کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی۔ یوں بھی اس نے بھی تو روزہ رکھنا ہی تھا۔

اس نے آج ہی جوائننگ دی تھی اور وہ اندازہ کر سکتا تھا، سرکاری دفاتر میں جس طرح لوگ اپنی مرضی سے کام کرتے ہیں، اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہو گا۔ واپسی پر وہ تھکی ہوئی تھی اور کچھ روزہ بھی تھا۔ عصر کے بعد بھی وہ کمرے سے نہیں نکلی تو اس نے ازخود افطاری کا انتظام کر لیا تھا۔ جن دنوں وہ پاکستان سے باہر تھا، اپنی خوش خوراکی کے باعث اس نے تقریباً سب کچھ ہی بنانا سیکھ لیا تھا۔ اس کے دوست احباب سب کہتے تھے کہ اس کی بیوی بڑی خوش رہے گی۔

پھل نکال کر اس نے فروٹ چاٹ بنائی اور فرائز کے لیے آلو کاٹ کر فریج میں رکھ دیے۔ جس وقت وہ اوون سے پکوڑے نکال رہا تھا، وہ انہیں بنانے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ بدحواس سی اٹھ کر آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار ٹھہرا ہوا تھا۔

"میں ابھی بابا سے کہہ رہا تھا، تمہیں جگا دوں۔"

"آئی ایم سوری۔ وہ آج پہلا دن تھا، بس تھک گئی تھی۔"

"ظاہر ہے کیریئر بنانے کے لیے بھاگ دوڑ تو کرنی پڑتی ہی ہے۔" اس نے سرسری سا کہا تھا۔

"ضروری نہیں ہر لڑکی کو کیریئر نامی بلا کا خبط ہو۔ میرے اندر اس کیریئر کا کیڑا نہیں ہے۔"

آج کے دن میں اس نے وجاہت حسن کو دوسری بار حیران کیا تھا۔ پھر ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ بابا کے ساتھ ان کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا، وہ آ کر کہنے لگی۔

"وہ۔۔ صبح سحری میں گیس چلی گئی تھی۔ میں کہہ رہی تھی کہیں صبح بھی۔۔"

"میں سلنڈر بھروا لایا تھا۔ سیڑھیوں میں پڑا ہے باہر۔"

"تو اسے اٹھا کر باورچی خانے میں رکھ دیتے تو آسانی رہتی مجھے۔"

"زیادہ بھاری نہیں ہے اگر ضرورت پڑی تو تم خود اٹھا کر رکھ لینا۔"

وہ کہنا تو کچھ کہہ کے مڑ گئی تھی لیکن ابھی جب وہ فون لے کر سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا وہ بجلی کی تیزی سے اس کی طرف آئی تھی۔

"سلنڈر اٹھا کر کچن میں رکھ دینا۔"

اس نے سلنڈر اٹھایا اور باورچی خانے میں رکھ دیا۔

"اتنا سا تو تھا۔۔۔ آسانی سے اٹھا سکتی تھیں تم۔"

"تو تم نے بھی تو آسانی سے اٹھا کر رکھا ہے۔ ویسے بھی جو میرے کرنے والے کام ہیں، میں کر رہی ہوں۔"

یہ جو دل ہوتا ہے ناں۔۔ اندر کہیں سب جانتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے۔ کہاں رکنا ہے، ٹھہرنا ہے اس کے باوجود کسی ضدی بچے کی طرح من مانی کرتا چلا جاتا ہے۔ تو اس وقت وجاہت حسن کے دل کو معلوم تھا اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے، بات کو طول نہیں دینا چاہیے لیکن وہ کھڑا رہا۔

"مثلاً؟ کون سے کام تمہارے کرنے والے ہیں اور کون سے میرے؟"

"کیا تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں؟ ٹھیک ہے، تم نے افطاری بنا کر مجھ پر احسان کر دیا لیکن خود سوچو لڑکی ہو کر میں اس طرح کے مردوں والے کام کرتی اچھی لگوں گی؟" اس کی سنجیدگی میں ایک شرارت سی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

ایک یہ لڑکی تھی۔۔ ایک انیسہ۔ اس کا اور انیسہ کا موازنہ بنتا نہیں تھا لیکن وہ بے اختیار ہی موازنہ کرتا چلا جا رہا تھا۔

اس روز کالج کے گراؤنڈ میں سرمئی اجالا پھیلا ہوا تھا۔ آسمان پر بادلوں کے خیمے تھے۔ سورج کو جیسے بے وقت چھٹی مل گئی تھی۔ سرسبز و شاداب گھاس پر لڑکے لڑکیاں ٹولیوں کی صورت بیٹھے ہوئے تھے۔

"زندگی کوئی ریاضی کا سوال تو نہیں کہ اس کو ایک ہی کلیہ یا فارمولے کے تحت گزارا جائے۔ یہ تو ہر ایک کے لیے ایسے ہی مختلف ہے جیسے ہم سب ایک دوسرے سے۔ سب کے لیے الگ فارمولے ہیں جو ہمیں خود اپنے لیے وضع کرنے چاہئیں۔"

ساتھ بیٹھی لڑکیوں سے بات کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ اس کی بات پر کینٹین کی طرف جاتے وجاہت حسن کی پاس پر بجتی دھن بند ہو گئی تھی۔ وہ رک گیا تھا۔ پتا نہیں بات خاص تھی، آواز خاص تھی کہ وہ وقت خاص تھا جس میں اس نے یہ بات اس آواز میں سنی تھی۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں اس نے ہزار بار سوچا تھا کہ چلا جائے یا ٹھہر جائے۔ اگر

رکے تو کس لیے؟ وہ ٹھہرا کہ نہیں اس کا وقت ضرور ٹھہر گیا تھا۔

ہونٹوں پر بجتے والی دھن اب اندر کہیں بج رہی تھی اور اس کا دل اس دھن پر رقصاں تھا۔ جیسے کسی کافی، کسی قوالی پر ملنگ اپنا آپ بھول کر رقص کرتے ہیں، بالکل ویسے ہی۔ گڑیا جیسی دکھنے والی وہ لڑکی بہت الگ، بہت مختلف لگ رہی تھی۔ بارش کی ننھی منی بوندوں نے ہمت کر کے مٹی کی پیاس پر خود کو نثار کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک شور اٹھا۔

"بارش شروع ہو گئی ہے۔"

جس کو جہاں راستہ ملا وہ اس طرف اٹھ کر بھاگنے لگا۔ وہ تینوں لڑکیاں اٹھ کر اس کی طرف مڑیں اور اس سے کچھ دور جا کر کھڑی ہو گئیں۔ منچلے لڑکوں کا ایک گروہ بارش میں رقص کرنے لگا تھا۔ کسی نے فون پر گانا چلا دیا۔ برآمدوں میں کھڑے طالب علم پرجوش ہو کر تالیاں بجا رہے تھے اور اسے لگ رہا تھا یہ سب اس لمحے کی خوشی کو منا رہے ہیں جو آیا تو محض ایک لمحے کے لیے مگر زندگی بھر کے لیے ٹھہرنے والا تھا۔

اس سب شور شرابے میں ایک وہ تھا جو سرشار سا مجسمہ بن کر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ٹھہرا ہوا شوخ تبسم، گئے لمحے کی واردات کا پتا دیتا تھا۔ اس نے جینز کی جیبوں میں اڑسے ہاتھ باہر نکالے تو بے دھیانی میں اس کا پین نیچے گر گیا۔ وہ اٹھانے کے لیے جھکا نہیں۔ جانے کیوں دل میں ایک وہم تھا کہ اگر اس سے نگاہ ہٹی تو منظر بدل جائے گا اور وہ کہیں وقت کی دھند میں کھو جائے گی۔

"آپ کا پین نیچے گر گیا ہے۔"

اس نے اسے بولتے ہوئے سنا۔ ساتھ کی لڑکیوں کو کچھ کہہ کر وہ اس کی طرف آئی۔ اس کے پیروں میں جھک کر پین اٹھایا اور اب وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"اگر خود پر اپنا اختیار نہ رہے تو اکثر یہ اختیار کسی اور کے پاس چلا جاتا ہے اور [illegible] رلاتا ہے۔" اس کی آنکھوں میں جھانکتے کہہ کر وہ واپس چلی آئی۔

"یہ کون تھا؟" سبز اور آتشیں گلابی بالوں والی حبہ جو کہ پنکی فیمنسٹ کے نام سے مشہور تھی، اس نے پوچھا تھا۔

"مجھے کیا معلوم کون ہے۔" اس نے لاپروائی سے جواب دیا تھا جبکہ دل خوش فہم کہتا تھا اس کا دھیان ابھی بھی اسی کی طرف تھا۔

محبت کا اگر کوئی لمحہ تھا تو اس کے لیے وہی تھا جب اس نے اس لڑکی کو سرمئی اجالے میں بیٹھے دیکھا تھا۔ یونہی چلتے چلتے جیسے انسان کو کسی لمحے احساس ہوتا ہے کہ یہ وقت وہ پہلے بھی جی چکا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ بہت خوب صورت تھی۔ بس وہ تھی اور اس کے لیے یہی وجہ کافی تھی کہ وہ اسے دیکھتا رہے۔

مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والی انیہ مختار ایسی زار کی دھند میں لپٹی، ان کے لیے الجھی ہوئی وہ ڈور تھی جو ہزار تلاش کے باوجود بھی اپنا سرا نہیں دیتی تھی۔

وجاہت حسن کی زندگی ہمیشہ ایک سیدھی لکیر میں چلی تھی۔ اسے ان الجھنوں اور زندگی کی پیچیدگیوں کا نہ تجربہ تھا نہ ہی علم۔ وہ بس اس کے ساتھ اپنی کہانی کی پپی اینڈنگ چاہتا تھا۔ ایسی اینڈنگ جس "میں وہ دونوں "ہنسی خوشی رہنے لگے اور یہ وجاہت حسن کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اب وہ پاپا کے آفس جا رہا تھا۔ مما کتنی بار اس سے شادی کے موضوع پر بات کر چکی تھیں اور وہ انیہ سے لیکن وہ لڑکی جانے کیا چاہتی تھی۔

وہ مانتا تھا کہ شروع شروع میں اسے انیہ کی خود داری میں کشش محسوس ہوئی تھی۔ جہاں لڑکیاں اپنا مطلب نکالنے کے لیے چند تحائف کے لیے لڑکوں کے ساتھ گاڑیوں میں گھومتی اور ہوٹلنگ کرتی پھرتی تھیں، وہ اپنی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے خود جان کھپاتی تھی۔ گزرے چار سالوں میں وجاہت نے اسے جان توڑ محنت کرتے دیکھا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس نے بوجھ بانٹنے کی کوشش کی اور وہ آسانی سے کر سکتا تھا۔ انیہ نے ہر بار اسے روک دیا۔ مالی مدد تو بڑی بات وہ تو اس کے محبت سے دیے گئے تحائف تک قبول کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔

"میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔" وہ تن کر جواب دیتی تھی۔

یہ سب اچھا لگتا تھا لیکن کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تھا وہ اسے کوئی تحفہ دے اور انیہ اسے محبت سے قبول کرے جیسے کوئی بھی، عام لڑکی کر سکتی تھی۔ چار سالہ تعلق کے بعد بھی وجاہت حسن کے پاس کوئی ایک ایسا لمحہ نہیں تھا جس میں اس لڑکی نے کوئی پھول جیسی یاد اس کے ہاتھوں میں تھمائی ہو۔ کوئی ایسا لفظ نہیں تھا جو دھنک بن کر تخیل کو رنگ سکتا ہو۔

وجاہت کے ذہن میں محبت کا ایک خوب صورت اور رنگین تاثر تھا جو انیہ مختار کی نگاہ میں، فضولیات اور واہیات سوچ لیے مشتمل تھا۔ وہ شادی کے بعد کی مضبوط محبت پر یقین رکھتی تھی۔

وہ اپنی جگہ بالکل ٹھیک تھی۔ اس نے پہلے اپنے باپ کے ہاتھوں ماں کو پٹتے دیکھا تھا۔ پھر باپ کے بعد ان کے حصے کا زہر تلخیہ نے اگلنا شروع کر دیا تھا۔ کہنے کو وہ اس سے تین سال بڑا تھا لیکن نہ تو اسے کسی ذمہ داری کا احساس تھا نہ ہی کوئی لحاظ۔

نشے کی عادت اس نے باپ سے چرائی تھی تو باقی کی عادتیں، از خود اس کے اندر آ گئی تھیں۔

پیسوں کے لیے وہ ماں کو بھی گالیوں سے نوازتا اور خود انیہ پر ایسے رکیک الزامات لگاتا کہ اس کا صبر جواب دے جاتا۔

ایک طرف وہ اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کی کوشش کر رہی تھی تو دوسری طرف، جانے ان جانے میں تمام مردوں سے بیزار ہوتی جا رہی تھی۔ شاید اس میں ایک ہاتھ اس کی فیمنسٹ دوستوں کا بھی تھا۔ جب اس کے حوصلے ٹوٹنے لگتے وہ اس کی ہمت بنتی تھیں۔

"ارے ہم کیا مردوں کے بغیر سروائیو نہیں کر سکتے؟ تم دیکھنا ایک دن ایسا آئے گا جب ان کے سروں پہ پیر رکھ کر ہم اپنے حصے کا مقام حاصل کر لیں گے۔"

وہ ان کی باتوں سے متفق تھی لیکن جب وجاہت کی بات آئی تو وہ کوئی فیصلہ لینے کے قابل نہیں تھی۔ یونہی سرسری سا ذکر کیا تھا اس نے شادی کا۔

"یہ شادی وادی سب چونچلے ہوتے ہیں۔ شادی سے پہلے تو یہ لڑکے قدموں میں بچھنے کو تیار ہو جاتے ہیں لیکن بعد میں پتا کیا ہو گا؟ تمہارا بیک گراؤنڈ اور خود تم ہزار رنگ کی کسوٹیوں پر پرکھی جاؤ گی اور تم ہر امتحان میں پورا اترنے کی کوشش کرتی اپنا آپ کھو دو گی۔ تم اپنی محنت سے اتنی آگے آ گئی ہو تو تھوڑا اور کیوں نہیں؟ اسے کہو انتظار کرے جب تک تم وہ سب حاصل نہ کر لو جو تمہارا حق ہے تاکہ کل کلاں کو وہ تمہیں نیچا نہ دکھا سکے اور اگر اس کے بغیر بھی رہنا پڑے تو تمہیں کوئی مشکل نہ ہو۔"

یہی وجہ تھی اب اگر وجاہت نے شادی کا کہا تو اس نے صاف جواب دیا تھا۔

"میری ماں ہمیشہ میرے باپ کی محتاج رہی اور باپ کے بعد بھائی کی۔ میں مردوں کے اس معاشرے میں اپنی خود کی شناخت چاہتی ہوں۔"

اور یہ اس کی ضد ہی تھی کہ اب وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھی پوسٹ پر کام کر رہی تھی۔ اس سال چند ماہ بعد شادی کا پروگرام بھی اسی کا ترتیب دیا ہوا تھا اور اب......

اب آئرہ نام کی یہ لڑکی نظر آئی تھی جسے دیکھ کر گمان ہوتا تھا وہ کسی اور سیارے سے ہے۔ دل بے ساختہ اس کی اور کھنچا چلا جاتا تھا۔

انیہ اسے اپنے کسی متوقع بین الاقوامی دورے کے بارے میں بتا رہی تھی لیکن فون پر بات کرتے ہوئے وجاہت کا دھیان انیہ کی باتوں کی طرف نہیں تھا۔ دھیان کا پرندہ تو کتاب گود میں رکھے نیند میں

ڈولی اس لڑکی کے گرد چکر کاٹ رہا تھا۔

☆☆☆

دوپٹہ بیڈ پر ڈالے وہ اگلے دن کے لیے کپڑے استری کر رہی تھی۔ دن اگرچہ آج کا بھی آسان نہیں تھا لیکن بہر حال وہ پچھلے دن سے کم تھکی ہوئی تھی۔ آفس سے واپسی پر الارم سیٹ کر کے وہ سو گئی تھی۔ اس لیے خوش اسلوبی سے سارے کام نمٹانے کے بعد بھی تھکی ہوئی نہیں تھی۔

دفعتاً اسے کسی کی نظروں کا احساس ہوا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا لیکن کوئی دکھائی نہیں دیا۔

تب کھلے دروازے سے سامنے چھت پر پڑی۔ فون کان سے لگائے جانے وہ اپنے دھیان میں کھڑا تھا۔ اس نے دوپٹہ اٹھا کر سر پر ڈالا۔ پتا نہیں کیوں وہ اس کی باتوں پہ حیرانی سے اسے دیکھتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ اتنی گہری نظر سے دیکھتا تھا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی سنسنانے لگتی۔ شام میں جب وہ افطاری کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ فریج سے پھل نکالنے کھڑا ہو گیا۔ اسے اس کی موجودگی سے عجیب کوفت ہو رہی تھی۔

”کیا کرنے لگے ہو؟“

”روزہ ہے تو ظاہر ہے، کھانے تو نہیں لگا۔ افطاری کے لیے فروٹ چاٹ بنانے لگا ہوں۔“

”تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے کیا؟ جو تمہارے کام کرنے والے ہیں، تم وہ کرو جا کے۔ میں بنا تو رہی ہوں افطاری۔ ایسے ہی عورتوں کی طرح باورچی خانے میں گھس کر کھڑے ہو جاتے ہو۔“ اسے جلی کٹی سنا کر سکون جیسے اندر تک اترتا تھا۔

اس کی بات پر چاقو ٹوکری میں چھوڑ کر شیلف سے ٹیک لگا کر سینے پر بازو لپیٹے وہ اس کی جانب جیسے بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ ”یہ عورتوں والے کام کون سے ہوتے ہیں، ذرا بتانا مجھے؟“

”پلیز . . “ ایک دم اسے رونا آنے لگا تھا۔ گزرے چھ سالوں نے اس کی زندگی کا ہر لفظ ایک نیا دیا تھا۔ اگرچہ وہ شروع سے جانتی تھی، دنیا کے لیے ان باتوں کے یہ معنی نہیں پھر بھی... پھر بھی وہ اپنی بات سمجھا نہیں پائی تھی۔

ابتسام کے ساتھ اس نے چار سال گزارے تھے اور ابتسام نے اس کی زندگی کو ہی ایک اور رنگ میں رنگ دیا تھا۔ اب وہ اس سے دور تھی تو اپنے ذہن میں موجود رنگوں کے معنی کو دنیا کے معنوں سے ہم آہنگ کرنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔

بنا کچھ کہے وہ باہر چلا گیا تھا۔ پھر افطاری کے بعد وہ اس سے پوچھنے آیا تھا کہ بازار سے کچھ منگوانے کی ضرورت تو نہیں۔

وہ نہیں جانتا تھا، ابتسام نے اسے گزرے چار سالوں میں کیسی ٹریننگ دی تھی۔ ابتسام کے ساتھ کہنے کو اس کی لومیرج تھی لیکن یہ وہ ہی جانتی تھی کہ اس شادی میں ابتسام کی طرف سے لو ہو تو ہو اس کی طرف سے صرف مجبوری تھی۔ ابتسام اس کے لیے زہریلے ماحول سے نکلنے کا ایک ذریعہ تھا۔

جس وقت اماں کی وفات ہوئی، وہ بارہ تیرہ سال کی تھی۔ پھوپھی کے مسلسل دباؤ ڈالنے پر ابا معافیہ کو بیاہ کر لے آئے تھے۔ معافیہ کی اپنی دو بیٹیاں تھیں۔ رشنا اس سے بڑی اور ثمرا اس سے چھوٹی۔

رشنا نے نفرت کے سارے سبق معافیہ سے ایسے پڑھے تھے کہ اسے کچھ سکھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ معافیہ کی دیکھا دیکھی وہ اسے گالیاں دیتی اور موقع ملنے پر ٹھکائی بھی کر دیتی تھی۔ اس کے اندر نفرت ہی نفرت بھرتی جا رہی تھی۔ شروع شروع میں اس نے ابا سے شکایت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن معافیہ میٹھی بن کر اسے ایک طرف کر دیتی۔

”بچیاں ہیں لڑ پڑتی ہیں۔ پیار بھی اتنا ہی کرتی ہیں ایک دوسرے سے۔“

یہ بات سمجھ میں اسے آج تک نہیں آئی تھی کہ ابا نے کبھی اپنی سمجھ سے سارے معاملات کیوں نہیں دیکھے تھے۔ انہیں کیوں معافیہ کے سفید جھوٹ دکھائی نہیں دیتے تھے۔ یہ جس پیار کی بات معافیہ کرتی تھی، انہیں بھی اس کی غیر موجودگی کیوں محسوس نہیں

ہوئی تھی۔ اس کے اندر آگ ہی آگ بھرتی جا رہی تھی۔ معافیہ اور رشنا کی چڑ میں وہ ہر وہ کام کرتی جس سے اسے منع کیا جاتا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ معافیہ نے اس کی یہ خامی بڑی جلدی پکڑ لی تھی۔ تب ہی تو وہ اس سے اپنا مطلب حاصل کرنے کے لیے الٹی پٹی پڑھاتی تھی۔ جیسے میٹرک کے پیپروں کے بعد اس نے اٹھتے بیٹھتے اسے کالج میں داخلے کے فضائل گنوانے شروع کر دیے تھے۔ اپنی ناسمجھی میں اس نے آگے پڑھنے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ وہ ان کے لیے ایک نوکرانی کی حیثیت اختیار کرتی چلی گئی۔ یہ نہیں تھا کہ سب اتنا آسان تھا۔

کام وہ کرتی تھی لیکن بے چاری بن کر نہیں۔ معافیہ کا خون کھولا کر تڑپا کر، اسے اچھی طرح جلا کر وہ کام کی طرف آتی تھی۔ اب تو معافیہ کی مار بھی اس پر اثر نہیں کرتی تھی۔ لیکن ایک ہی سال میں وہ اس ہر وقت کی چخ چخ سے تنگ آ گئی تھی۔ پھر ایک عجیب بات ہوئی۔

یہ اس دن کی بات تھی جب رشنا نہانے کے بعد جان بوجھ کر اس کے شیمپو کی بوتل کھول کر غسل خانے کے فرش پر الٹا گئی تھی۔ وہ اس سے لڑنے کے لیے کمرے میں گئی تھی۔ رشنا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اپنے بال بکھرائے کھڑی تھی اور ثمر ٹیوشن جانے کے لیے تیار ہوتی چہرے پر کریم لگا رہی تھی۔ اس کی نظر آئینے پر پڑی اور وہ وہیں رک گئی۔ ان کے اجلے رنگوں نکھرے عکس کے پیچھے وہ کسی بدنما دھبے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ پتا نہیں کب سے اس نے بال کنگھی نہیں کیے تھے۔ بال سر پر اکٹھے ہوئے اون کے الجھے ہوئے دھاگے کی طرح لگ رہے تھے۔ وہ بڑی خاموشی سے واپس پلٹ گئی تھی۔

ساری دوپہر اس نے اماں اور ابا کے اس مشترکہ کمرے میں گزاری تھی جس میں اس نے کبھی صورت بھی معافیہ کو گھسنے نہیں دیا تھا۔ ثمرا اسے رات کا کھانا بنانے کے لیے کہنے آئی تھی۔

”میں نہیں بنا رہی۔ رشنا سے کہو، آج وہ بنا لے۔“

معافیہ نے آ کر دروازہ پیٹا۔

”وہ سارا دن ذلیل ہو کر آئی ہے۔ پہلے کالج اور پھر اکیڈمی۔ تیری طرح ویلی بیٹھی روٹیاں نہیں توڑتی۔“

ہاں یہ ٹھیک تھا۔ گالیاں اور کوسنے دیتے معافیہ اسے راستہ دکھا گئی تھی۔ رات کو ابا کے آنے پہ وہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔

”میں نے آگے پڑھنا ہے۔“

ایک بار تو معافیہ بھی اس مطالبے پہ حیران ہوئی تھی۔

”ڈیڑھ سال گزار کر پڑھائی کا خیال کیسے آ گیا؟ اور پیسے کیا درختوں پر لگتے ہیں جو...“

”میں اپنے ابا سے بات کر رہی ہوں۔“ اس نے معافیہ کی بات کاٹی۔ ”اور جب رشنا کی کالج اور اکیڈمی کی فیس جا سکتی ہے تو میری صرف اکیڈمی کی کیوں نہیں؟ میں نے میٹرک پہلی بار میں پاس کر لیا تھا۔ رشنا کی طرح دو سال نہیں لگائے۔“

ابا چاہے معافیہ کی باتوں میں آ کر اس کو دو ہاتھ جڑ دیتے تھے مگر یہاں تو سارا معاملہ ہی صاف تھا۔ اس جگہ رشنا اور اس نے شاید پہلی بار کسی بات پر اتفاق کیا تھا اور وہ یہ کہ انہیں ایک اکیڈمی میں ساتھ نہیں پڑھنا۔

دھلے نکھرے کپڑوں میں وہ خود بھی تر و تازہ نظر آتی تھی۔ اب کی بار وہ پہلے کی طرح ناامید یا مایوس نہیں ہوئی تھی۔ کچھ دیر کے لیے ہی سہی کم از کم وہ اس جہنم سے تو نکل سکتی تھی۔ اس نے خود پر توجہ دینا شروع کی تو گھر کے بہت سے معاملات میں اس کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ معافیہ بہت بگڑی تھی۔ ایک تو بے دام غلام ہاتھ سے گئی، اوپر سے فیس کا خرچ الگ۔ اسے البتہ اب کسی کی پروا نہیں تھی۔

وہ ذہین تھی، محنتی تھی۔ گزرے سال کا ازالہ کرنے کے لیے اس نے ایک ساتھ دو کلاسوں کے پیپر دیے تھے اور پاس بھی ہوئی تھی۔ بی اے میں اس نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ جن دنوں اس کے بی اے کے پیپر ہونے والے تھے، خالہ، جبین باجی کی شادی کے لیے اسے لینے آ گئیں۔ یہ اس کی زندگی میں ایک اور ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہونے والا تھا۔

خالہ سے اسے ہمیشہ اماں کی خوشبو آتی تھی۔ معافیہ کی جلی کٹی باتوں کے باوجود وہ پر تھوڑے عرصے بعد چکر ضرور لگاتی تھیں۔ وہ برملا کہتی تھیں۔

''میرا اگر کوئی بیٹا ہوتا چاہے کچھ سال چھوٹا ہی ہوتا میں تجھے اپنی بیٹی بنا کر اپنے پاس لے آتی۔''

اب بھی جبین کی شادی سے پندرہ دن پہلے ہی وہ اسے اپنے پاس لے گئی تھیں۔ شادی کی ساری تقریبات کے لیے انہوں نے اس کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک کپڑے بنوائے تھے۔ پیپرز سے فراغت اور کچھ دن معافیہ کی بک بک سے چھٹکارا...... وہ تتلی بن کر اڑی پھری تھی۔ وہ خوش تھی، شوخ تھی۔ مایوں پہ ہی وہ جبین کی سسرال سے آنے والے سعید کے دل میں اتر گئی تھی۔ خود اسے بھی جلد ہی اس بات کا ادراک ہو گیا تھا تو پہلی پہلی بار چاہے جانے کی سرشاری نے زندگی کو دھنک کے رنگوں سے رنگ دیا تھا۔

''لڑکی! تم تو بہت آگے جا رہی ہو۔'' ولیمے والے دن جبین نے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا۔ ''سعید رشتہ بھیجنے کی بات کر رہا تھا۔ تیاری پکڑ لو میری سسرال کو اپنی سسرال بنانے کی۔''

اس خوشی کی مدت بڑی تھوڑی تھی۔ حسب وعدہ سعید نے رشتہ بھیجا تھا لیکن اسے قبول رشتا کے لیے کیا گیا تھا۔ معافیہ نے جانے ابا سے کیا کہا تھا اور کیا نہیں کہ اس کے باہر نکلنے اور فون پر بات کرنے تک پہ پابندی لگ گئی تھی۔

رشتا کو سعید کے سنگ رخصت ہونے میں تین ہفتے بھی نہیں لگے۔ معافیہ نے علی الاعلان اپنی جیت کا جشن منایا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کا انتظام کرنے کی دھمکی بھی لگائی تھی۔ وہ چلتی پھرتی آگ میں تبدیل ہوئی تھی۔

یہ نہ بھی ہوتا تو اب اس نے اس جہنم سے نکلنے کی ٹھان لی تھی۔ اس سے پہلے کہ معافیہ اس کے لیے اپنے بھائی کے نشئی بیٹے کا رشتہ لاتی، اس نے ابتسام کو تلاش کر لیا تھا۔ ابتسام کے والدین دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور سب بھائی بہن اپنے اپنے گھروں میں آباد تھے۔ خود وہ نوکری کی تلاش میں پھر رہا تھا۔ مقابلے کے امتحان کے لیے وہ ایک دوست کے گھر ٹھہرا ہوا تھا جہاں وہ اسے پہلی بار ملی تھی۔

وہ خود جانتی تھی کہ اسے ابتسام سے محبت نہیں ہے اور یہ سب غلط ہے لیکن اگر وہ یہ قدم نہ اٹھاتی تو معافیہ، اسے ایسی جگہ پھینکتی جہاں اس کے لیے روز الگ سے جہنم دہکایا جاتا تھا۔ اگر کوئی کہے کہ اس نے ابتسام پر ڈورے ڈالے تھے تو بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ اس کی خوب صورتی اور جاں نثاری کے آگے ابتسام نے سوچ سے بھی پہلے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔

شادی کے لیے بھی کوئی اتنا تردد نہیں کرنا پڑا تھا۔ جتنا وہ معافیہ سے تنگ تھی اس سے بھی زیادہ وہ اس سے عاجز تھی۔ یوں سادگی سے شادی ہو کر جب اس نے ابتسام کے گھر قدم رکھا تو اسے اندازہ ہوا زندگی سوچ سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ اس نے ابتسام کے محبت میں مبتلا ہونے کا انتظار نہیں کیا تھا اور اس سے پہلے ہی، پوری طرح اس کی دسترس میں آ گئی تھی۔ سو زندگی ایسی ہی بے رنگ ہو سکتی تھی۔ چند دنوں میں ہی مالی معاملات نے پریشان کرنا شروع کر دیا تو ابتسام کے ساتھ اس نے بھی نوکری ڈھونڈنی شروع کر دی۔

سوچا تھا نوکری ہو گی تو ابتسام قدر کرے گا لیکن یہاں وہ بالکل روایتی مرد ثابت ہوا تھا۔ اسے اس کی نوکری سے آنے والی تنخواہ، دکھائی نہیں دیتی تھی لیکن اس سے کام میں ہونے والی کمی بیشی بہت واضح دکھائی دیتی تھی۔

اسے اعتراض رہتا کہ اب اس کا دھیان ''باہر'' رہتا ہے اور وہ گھر پر توجہ نہیں دیتی۔ روزمرہ کا سودا لانا بھی اسی کی ذمہ داری تھی۔ وہ اگر کبھی اس سے کچھ لانے کا کہہ دیتی تو وہ فوراً بات منہ پہ دے مارتا تھا۔

''باہر آتی جاتی ہو تو لے آیا کرو۔ یہ گھریلو عورتوں والے نخرے نہ کیا کرو۔''

بہت جلد وہ اس سے اکتا گئی تھی لیکن اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اسے یہ رشتہ نبھانا ہی تھا سو ہار کر جو ہو سکتا تھا، وہ اس رشتے کو بچانے کے لیے کوشش کرتی رہی۔ نو سے چار نوکری کے بعد گھر کے کام اور ابتسام کی ضروریات نے اسے زندگی سے تھکا دیا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ ایک دو بچے ہو جائیں تو شاید حالات بدل جائیں لیکن قسمت میں لکھا ہی نہیں تھا۔

شادی کے چار سال گزر جانے کے بعد ابتسام کو احساس ہوا تھا کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتا اور جس سے وہ محبت کرتا ہے، اس کے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔ اس کے سارے رونے، قربانیاں، لڑائیاں.. سب بے کار گیا اور ابتسام اپنی محبت کو بیاہ کر گھر لے آیا۔

وہ اس کے ساتھ اس گھر میں نہیں رہ سکتی تھی اور اپنا گھر اب خالی ہو چکا تھا۔ ابا کی وفات کے بعد معافیہ نے ثمر کی شادی کر دی اور خود اپنے بھائی کے پاس چلی گئی۔ ہاں ایک نیکی وقت نے اس کے ساتھ یہ کی تھی کہ ابا نے اپنی زندگی میں معافیہ کے علم میں لائے بغیر اپنا گھر اس کے نام کر دیا تھا۔ معافیہ کے جانے کے بعد سے اس گھر کا ایک حصہ کرائے پر تھا اور ماہانہ ایک معقول رقم مل جاتی تھی۔

وہ اسلام آباد سے یہی سوچ کر نکلی تھی کہ اپنے گھر چلی جائے گی لیکن اسے خود نہیں علم ہوا کہ گھر کے بند دروازے کو کھولنے کے بجائے وہ اس کھلے دروازے کی طرف جا نکلی جو کبھی خوابوں کی نگری ہوا کرتا تھا۔

☆☆☆

یہ انٹرنیشنل ٹرپ اس کی زندگی میں سنگ میل ثابت ہو سکتا تھا۔ پاکستان میں موجود دور جن برانچز میں محض سات لوگوں کو اس ٹرپ کے لیے چنا گیا تھا جن میں سے ایک وہ تھی۔ وہ وجاہت سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن پچھلی بار بات ہونے پر وہ ذہنی طور پر غیر حاضر لگ رہا تھا، اس لیے سرسری تذکرے کے علاوہ وہ بات نہیں کر سکی تھی۔ وہ جانتی تھی اسے اس کا یہ جاب کرنا ناپسند ہے۔ اس نے کتنی بار اسے روکنے کی کوشش بھی کی تھی۔

''تمہیں جاب کی ضرورت ہی کیا ہے؟ میں اتنا تو کماتا ہی ہوں کہ تمہارے اخراجات کے ساتھ ساتھ نخرے بھی اٹھا سکوں۔''

''بس یہ سمجھ لو، میں اپنے آپ پہ ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ میں خود بھی کچھ ہوں۔''

وہ جانتی تھی اب بھی وہ ناراض ہو گا۔ وہ اس سے تفصیل میں بات کرنے کے لیے ملاقات کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اس سے کہہ نہیں سکتی تھی اور دوسرا وہ جانے کہاں مصروف تھا۔ آج چھٹی تھی اور یقیناً اس نے فری ہی ہونا تھا۔ گھڑی دیکھتے اس نے وجاہت کا نمبر ملایا۔

آزرہ کپڑے دھو رہی تھی۔ گو کہ کپڑے زیادہ نہیں تھے لیکن صرف وجاہت حسن کی ضد میں اس نے اسے بھی کام میں گھسیٹ لیا تھا۔ کسی وقت اسے محسوس ہوتا تھا، وہ ابتسام کی بے توجہی کا بدلہ اس سے لے رہی ہے۔

''یہ کپڑے اوپر لے جاؤ بلکہ ایسا کرو الگنی پر پھیلا بھی دینا۔'' اپنے کپڑے الگ کر کے اس نے ٹوکری میں انڈیل کے اور اس کے کپڑے ڈال کر اس کے سامنے ٹوکری رکھی۔ ہاں تو وہ کیوں مفت میں نوکرانی بنی رہے۔

''تم پاگل ہو گیا؟ میں کیوں کپڑے پھیلانے لگا بھلا؟'' اسے شاک لگا تھا۔

''کیوں مردانہ انا پہ چوٹ لگتی ہے؟ بتاتی

چلوں یہ تمہارے اور انکل کے کپڑے ہیں۔میرا احسان مانو کہ دھو دیے۔اب دل چاہے تو پھیلا لو ورنہ پڑے رہنے دو۔میں انکل کے ڈال دوں گی۔"

مزے سے جواب دے کر وہ واپس مڑ گئی تو بادل ناخواستہ اس نے ٹوکری اٹھالی۔

چھت پر پہنچتے تک جیب میں پڑا فون بجتے بجتے بند ہو گیا تھا۔انیہ کال کر رہی تھی۔بے وقت کی کال پہ وہ حیران ہوا تھا۔فون کندھے اور چہرے کے درمیان رکھتے اس نے کال بیک کی۔گزشتہ سے پیوستہ وہ اسے اپنے بین الاقوامی دورے کے بارے میں بتا رہی تھی۔وہ جانتا تھا اس کے روکنے پر وہ رکنے والی تو ہے۔یوں بھی وہ اس سے اجازت طلب نہیں کر رہی تھی، اپنا پروگرام بتا رہی تھی۔

سو بلا حیل وحجت وہ اس کی ہر بات پر آمین کرتا چلا گیا۔کچھ یوں بھی کپڑے الگنی پر پھیلاتے اسے اب حرج آ رہا تھا اور ہنسی بھی۔

فون بند کر کے انیہ حیران ہونے کے ساتھ خوش بھی تھی کہ اس نے زیادہ سخت ردِعمل نہیں دیا تھا۔یہ سچ تھا کہ گزرے سالوں میں وہ جس طرح اس کا سایہ بن کر رہا تھا، وہ نہ صرف اس کی عادی ہو گئی تھی بلکہ پورے دل سے اسے چاہتی بھی تھی۔یہ بس ایک آخری مرحلہ تھا۔اس کے بعد وہ خود کو ذہنی طور پر شادی کے لیے تیار کر چکی تھی۔

انیہ کا فون بند کر کے وہ نیچے اترا تو وہ گیلے پائنچے ٹخنوں سے اوپر کیے فرش دھو رہی تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟ فضہ تو نہیں ہے۔اب روزے میں جھوٹ مت بولنا۔" اندر جاتے جاتے اس کے اندر شرارت جاگی تو وہ اس کی طرف آ گیا۔

"جو بھی ہے، تمہیں کوئی مسئلہ؟"

"یہ تم روزے میں بھی انگارے چباتی رہتی ہو..نام ہی پوچھا ہے، کون سا پرپوز کر دیا ہے۔"

اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہوا تھا۔وہ تیزی سے مڑی اور پانی کے پائپ سے الجھ کر نیچے گر گئی۔یہ بھی شکر تھا کہ فرش پر گرنے کے بجائے وہ لڈکے پائپ پر گری تھی۔اب جانے یہ شرمندگی کا احساس تھا یا واقعی اسے چوٹ آئی تھی۔وہ وہیں بیٹھی رونے لگی تھی۔

"اچھا چلو، اٹھو یہاں سے۔اندر جا کر بیٹھو۔" وہ اس کے پاس بیٹھا فکرمندی سے کہہ رہا تھا۔

"میرا نام آئرہ ہے۔" آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اٹھتے اس نے کہا تو بے اختیار وجاہت کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ رینگ گئی۔مزید شرارت کا ارادہ بڑی مشکل سے ترک کیا تھا۔

وجاہت حسن نے اس روز نہ صرف وائپر لگایا بلکہ اس کے روکتے روکتے بھی اس کے کپڑے الگنی سے اتار کر تہہ لگا کر دیے تھے۔

"میں انہیں استری بھی کر کے دے سکتا ہوں۔" مسکراہٹ دبائے اسے غصہ دلانے کی کوشش کرتا وہ اتنا پیارا لگ رہا تھا کہ بے دھیانی میں اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

"آئندہ ہاتھ مت لگانا میرے کپڑوں کو۔"

"شکریہ کہتے ہیں لڑکی۔"

آئرہ کو چوٹ تو کچھ خاص نہیں لگی تھی لیکن اس کے سامنے گرنے سے ہونے والی شرمندگی کو چھپانے کے لیے وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی۔اس روز افطاری بھی اسی نے بنائی تھی۔اسے اتنی پروا کرتے دیکھ کر دل نے بے ساختہ رب سے گلہ کیا تھا۔کیا تھا اگر ابتسام بھی اس جیسا ہوتا۔

☆☆☆

اسے گئے ہوئے دو دن ہو گئے تھے۔آئرہ کو ایک طرح کا خالی پن محسوس ہونے لگا تھا۔وہ ایک جیتا جاگتا انسان تھا جو قدم قدم پر اپنی بھرپور موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔اب اس کی غیر موجودگی کا احساس ہونا تو ضروری تھا۔یونہی بے دلی سے چیزیں ایک سے دوسری جگہ رکھتے، اس نے اپنا سامان کھولا اور پھر فون آن کر کے ہاتھ میں لیے کتنی دیر بیٹھی رہی۔

ایک نمبر پر نظریں جمائے وہ پتھر ہو چلی تھی۔محبت اور حفاظت کا کیسا خوب صورت رشتہ تھا جو اس کے ساتھ اور اب اتنے دن ہوئے اس نے ایک پیغام بھی نہیں بھیجا تھا۔کیا وہ اسے فراموش کر گیا تھا؟ کیا ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔اسے کال کرنے اور اس کی آواز سننے کی شدید ترین خواہش کو دباتے وہ رو پڑی تھی۔روتے روتے جانے کتنی دیر گزر گئی۔

فون ایک طرف ڈال کر اس نے مختصر سامان میں سے ایک سال خوردہ میرون رنگ کی ڈائری نکالی اور ایک اور نمبر نکالا۔اب بھی یہی سوال سامنے تھا کہ فون کرے یا نہ۔اس نے پہلے کبھی اس نمبر پر فون نہیں کیا تھا اور اب جانے یہ نمبر چل بھی رہا تھا کہ بند ہو گیا تھا۔سوچ سوچ کر اس نے نمبر ڈائل کیا۔دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔

"ہیلو۔" ایئر پیس میں ریشا کی آواز ابھری۔اب جب کال وصول کر لی گئی تھی تو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔"ہیلو۔"

"وعلیکم السلام ...مم..میں۔" اس کی آواز حلق میں ہی پھنس کر رہ گئی اور اتنی باریک سی نکلی کہ خود وہ بھی پہچان نہیں پائی کہ یہ اس کی اپنی آواز ہے۔

دوسری طرف اسے پھر بھی پہچان لیا گیا تھا۔

"تم...تم کہاں ہو؟ مجھے پتا چلا، تم گھر سے بھاگ گئی ہو؟ کس کے ساتھ ہو؟ تمہارا طلاق نامہ میرے گھر آیا پڑا ہے۔"

کیا کیا تھا اس آواز میں؟ الزام؟ خوشی؟ حیرت؟ اطلاع؟

اس نے بے یقینی سے فون کو دیکھا اور اتنی دیر تک دیکھتی رہی کہ لائن کٹ گئی اور آواز بند ہو گئی۔وہ وہیں سن ہو کر بیٹھی رہی۔افطار کا وقت آیا، گزر گیا۔شام ڈھل گئی اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔بتیاں گل کیے وہ وہیں بیٹھی اندھیرے میں فون کو گھورتی رہی۔

عشاء کا وقت گزر گیا مگر وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی۔اس کا کمرہ بھی اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔بابا نے دو چار بار ادھر جھانکا مگر کچھ دکھائی نہیں دیا تھا۔اس کے بغیر ہر شے لاوارث نظر آ رہی تھی۔کچھ دنوں سے اس نے جیسے ہر شے پر اپنا تسلط جما لیا تھی۔رات کے کھانے کا وقت بھی نکل چکا تھا اور باورچی خانے میں چولہا ٹھنڈا پڑا تھا۔جب انتظار کی سکت ختم ہو گئی اور دل میں وسوسے آنے لگے تو انہوں نے ہمت کر کے اس کے کمرے کا دروازہ کھولا۔بتی جلائی تو وہ ایک مجسمے کی طرح ساکت وصامت بیٹھی تھی۔یکبارگی دل ہول کر رہ گیا۔

"کیا ہوا ہے؟"

جواب ندارد۔

"طبیعت ٹھیک ہے؟"

پھر ایک خاموشی۔

"آج روزہ نہیں رکھا تم نے؟ رات کے کھانے کے لیے کچھ منگوانا ہو تو بتا دو۔میں باہر جا رہا ہوں اپنے لیے کھانا لینے۔"

انہیں لگا تھا شاید اس بات سے اسے وقت کا احساس ہو مگر وہ اب بھی اسی خاموشی سے بیٹھی تھی۔

ناچار قدم بڑھا کر وہ اس کے پاس آ کر کھڑے ہوئے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔وہ جیسے کسی نیند سے جاگی تھی۔خالی خالی نظروں سے تکتے ایک دم سارے احساسات زندہ ہوئے اور سب سے پہلے زیاں کا احساس جاگا۔وہ بیٹھے بیٹھے ان سے لپٹ گئی اور بری طرح رونے لگی۔ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے اور سچ بات تو یہ کہ وہ بری طرح گھبرا گئے تھے۔

وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔وہیں اس کے پاس بستر پر بیٹھ کر انہوں نے اسے رونے دیا۔کافی دیر رو چکنے کے بعد اس نے اچانک آنکھیں ایسے پونچھ لیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"میں کھانے کا انتظام کرتی ہوں۔" سیکنڈوں میں وہ دوپٹہ سنبھالتی کمرے سے باہر نکل گئی اور وہ وہیں حیران پریشان بیٹھے رہ گئے۔

کھانے کے بعد وہ کمرے میں سونے کے

لیے چلے گئے مگر ان کا دھیان اس کی طرف ہی تھا۔ برتن دھونے کے بعد وہ کمرے میں سونے کے لیے نہیں گئی بلکہ وہیں لان میں جھولے پر بیٹھی رہی۔ وہ جب تک جاگتے رہے، وہ اسی جھولے پر بیٹھی نظر آتی رہی۔

☆☆☆

آسمان پر چاند اپنی پوری قوت کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔ ہوا کی شرارت سے پتے سرسرا رہے تھے۔ ایسے میں ریلنگ کے ساتھ، دیوار پر بیٹھے وجاہت کی نگاہ سوگوار اور بھیگی آنکھوں والی آئزہ پر مرکوز تھیں۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی تھی۔ بابا جان نے اسے فون کرکے بتایا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے لیکن وہ بتا نہیں رہی۔

ترجیحی بنیاد پر کوشش کے باوجود وہ آ نہیں سکا تھا۔ آج وہ آیا تو آئزہ عصر کی نماز پڑھ رہی تھی۔ نماز کے بعد اس کی موجودگی محسوس کرکے اس نے چہرے کو ڈھانپا اور دعا سلام کیے بغیر باورچی خانے میں چلی گئی۔ وہ اس رویے پر حیران تھا۔ اتنا سا تعلق تو ہو ہی سکتا تھا کہ وہ اس سے سلام لے لے۔ وہ اس کے پیچھے باورچی خانے میں چلا گیا۔

"تم باہر جا کر بیٹھو پلیز۔" منہ پر دوپٹہ کیے ہونے کے باوجود اس نے رخ موڑ لیا تھا۔

"تمہیں مجھ سے کیا مسئلہ ہے اور چہرہ کیوں چھپا رہی ہو؟"

"کوئی مسئلہ نہیں۔ کہا تو ہے باہر جاؤ یہاں سے۔"

اس کی آواز کا بھیگا پن کہہ رہا تھا، یہاں سے مت جاؤ۔ وجاہت حسن نے پوری شدت سے اس پکار کو سنا تھا۔ وہ اس کے عین سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"تمہیں ہوا کیا ہے، یہ بتاؤ پہلے۔ پھر میں جا رہا ہوں۔"

"عدت میں ہوں.. طلاق دے دی ہے ابتسام نے مجھے۔ سن لیا؟ جاؤ یہاں سے اب۔" وہ چیخ اٹھی تھی۔

حیرت کا ایک پہاڑ تھا جو اس پہ ٹوٹا تھا۔ ابھی تو اسے یہ یقین نہیں تھا کہ وہ شادی شدہ ہے اور اب وہ طلاق کی کہانی سنا رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا اعتبار نہ کیا جائے لیکن اعتبار نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اور اگر آئزہ جیسی پیاری روحوں کے ساتھ بھی یہ ہونے لگے تو زندگی میں خوشی کی کیا گارنٹی رہ جائے۔ اس نے شاک کی کیفیت میں سوچا تھا۔

وہ رونے لگی تھی۔

"تم چپ کرو اور بتاؤ مجھے، کیا ہوا ہے؟"

درد کے کھاتے کھولنا اور پھر چن چن کر دکھ نکال کر سامنے رکھنا آسان تو نہیں تھا۔ وہ کتنی ہی بار روئی تھی۔

اور اب وہ بتانے کے بعد بھیگی آنکھیں لیے دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی تھی۔ وجاہت کی نظر اس کے چہرے پر تھی۔ معلوم نہیں کیوں اس نے دل میں بڑی شدت سے اس لڑکی کے آنسو سمیٹ لینے کی خواہش کو سر اٹھاتے محسوس کیا تھا۔

اس لمحے میں اس نے بے اختیار انیہ کو بھلا دیا تھا۔ دنیا میں درد کے رشتے سے زیادہ گہرا اور خوب صورت کوئی رشتہ نہیں ہوتا اور یہ رشتہ جلدی بنتا بھی نہیں۔ یہ وہی لمحہ تھا جب وجاہت حسن نے محسوس کیا کہ جو تعلق، وہ انیہ سے اتنے سال میں نہیں بنا پایا ان جانے میں اس لڑکی سے بن گیا ہے۔

"اب کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"اب کیا ہو سکتا ہے؟" اس نے جواباً سوال داغا۔

"اگر تم مناسب سمجھو تو بتاؤ، تم ہو کون۔ میں ہی نہیں بابا جان بھی جانتے ہیں کہ تمہارا یہاں آ کر کرائے کے لیے کمرہ طلب کرنا بے وجہ نہیں تھا بلکہ اختیاری عمل تھا۔ تمہارے رکھ رکھاؤ سے ہر چیز واضح ہوتی ہے لیکن میں تو میں انکل بھی کسی آئزہ کو نہیں جانتے۔"

"میرا گھر یہیں قریب ہی ہے۔ پچھلی گلی میں۔ جب میں چھوٹی تھی تو اماں یہاں آتی تھیں

آنٹی کے ساتھ گھر کا کام کاج کروا دیتی تھیں۔ آنٹی کچھ پیسے دے دیتی تھیں اور کھانا وغیرہ بھی مل جاتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اماں کے ساتھ میں بھی آ جاتی تھی۔ کچھ عرصہ انکل کے پاس پڑھتی بھی رہی ہوں میں۔ ہمارا گھر تب کچا ہوا کرتا تھا۔ یہاں ٹائل لگے ہوئے تھے پھر درختوں کی گھنی چھاؤں تھی۔ لان ایک قسم کی فیسی نیشن تھی۔ باورچی خانہ اور یہ اور بہت.. ہر ہر چیز سے میں دیوانہ وار محبت کرتی تھی۔ یہ ایک بے ساختہ عمل تھا۔

ایک دن یہاں باورچی خانے میں برتن دھوتے ہوئے مجھ سے ایک مگ ٹوٹ گیا تھا۔ انکل نے بہت زور کا تھپڑ مارا تھا مجھے۔ مجھے اکثر وہ تھپڑ تکلیف دیتا تھا۔ ایک مگ ہی تھا جو ٹوٹا تھا...... سچ کہوں تو اگر یہ تھپڑ نہ ہوتا تو ہو سکتا ہے، میں سب بھول بھال جاتی۔ تو جب میں یہاں آئی تو ارادہ تو اپنے گھر جانے کا ہی تھا لیکن یہ دروازہ کھلا ہوا تھا اور میں بے اختیاری اندر آ گئی۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بتا رہی تھی۔

"لیکن تم نے غلط نام کیوں بتایا؟ بابا جان تو تمہارا نام بھی نہیں جانتے۔"

"میں اپنا نام نہیں چھپا رہی تھی۔ اصل میں اماں بتایا کرتی تھیں کہ ان کی بیٹی تھی نغمہ نام کی جو بہت چھوٹی عمر میں فوت ہو گئی تھی۔ تو اس دن اچانک ہی یاد آ گیا۔ مجھے لگا اگر میں اپنا یہ نام بتا دوں تو یہ ایک طرح کا جذباتی دباؤ ہو گا۔ باقی اور کوئی بات نہیں تھی۔"

اس کے چہرے پر اب اضطراب کی جگہ سکون سا تھا۔ وجاہت حسن نے خود کو اتنا بے بس کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ دسترس میں آ سکتی تھی.. وہ اس کے سارے زخموں کا مرہم بن سکتا تھا۔ ذہن پتا نہیں کیا کیا تانے بانے بننے لگا تھا۔ ایک جال تھا جو اسے جکڑتا جا رہا تھا اور وہ کچھ کر نہیں پا رہا تھا۔

"تم نے کچھ سوچا ہے، تم کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"میں.. ابھی تو عدت ہے اور یوں بھی جاب اسی کی وجہ سے کی تھی۔ سب سے پہلے ریزائن کروں گی۔ بس ابھی تک اتنا ہی سوچا ہے۔"

وہ سادگی سے بتا رہی تھی اور وجاہت حسن کو لگ رہا تھا اس نے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔ اس کے چہرے پر نظر جمائے وہ کتنی ہی دیر دیکھتا رہا۔ گہری سانس بھر کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو نیچے چلتے ہیں۔"

☆☆☆

پچھلے تقریباً دو گھنٹوں سے اسپیکرز پر ایک ہی گانا چل رہا تھا اور وہ بیڈ پر پیر لٹکائے لیٹا ہوا گزرے چھ سالوں کو سوچ رہا تھا۔ انیہ پہلی نظر کا فیصلہ تھی اور اس ایک نظر کی پاس داری کے لیے اس نے چھ سال گزار دیے تھے۔ وہ باقی زندگی بھی گزار سکتا تھا اگر آئزہ آ کر اس کے ہیپی اینڈنگ والے خواب کو تہس نہس نہ کر دیتی۔ انیہ کے ساتھ گزرے سال اس کے ذہن کے پردے پر فلم کی طرح چل رہے تھے اور اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ ایک بے روح تعلق کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

پتا نہیں کیوں کئی بار تو اسے لگا شاید اس نے ہی اپنی ترجیحات تبدیل کر لی ہیں ورنہ انیہ شروع دن سے وہی تھی۔ اس نے کبھی کوئی دل گدگداتا لمحہ اس کی ہتھیلی پر نہیں رکھا تھا۔ اس کے لہجے میں کبھی بھی محبت کی حلاوت تھی ہی نہیں۔ وہ ایسی ہی تھی جیسی آج اور حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اسے کبھی اعتراض بھی نہیں ہوا تھا... بدلا تھا تو وہ خود۔

چاچو سکندر کی شادی کر رہے تھے اور ہمیشہ کی طرح ماما کو اس کی شادی کی فکر پہلے سے زیادہ لگ گئی تھی۔ آج بھی جب وہ گھر آیا تو ماما اسی موضوع کو لے کر شروع ہو گئی تھیں۔

"وجی! بہت ہو گیا۔ تم ملواؤ اس لڑکی سے تاکہ ہم کوئی فیصلہ کر سکیں اور اگر تم خود فیصلہ کر چکے ہو، تب بھی اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کا تو سوچو۔"

سال ڈیڑھ سال پہلے جب ماما ہر تھوڑے دن بعد اپنے فون میں جمع کی ہوئی لڑکیوں کی تصاویر کھول

کر بیٹھ جاتی تھیں تو انہیں حوصلہ دینے کے لیے اور چپ کروانے کے لیے ابا نے انہیں بتایا تھا کہ لڑکی وہ پسند کر چکا ہے۔ وہ لڑکی کون ہے، کیا کرتی ہے اس کے بارے میں اس نے اس وقت کوئی بات نہیں کی تھی اور بعد میں بھی ان کے استفسار پر وہ ایک ہی بات کہتا آیا تھا۔

"ابھی میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔ جب کرنی ہوگی میں بتا دوں گا۔"

اس کی زندگی کی کہانی اس کے اپنے ہاتھ میں تھی اور وہ عرصہ ہوا، اس کا اختتام لکھ کر ایک طرح سے قلم توڑ چکا تھا۔ اس کہانی میں یہ کہیں بھی نہیں تھا کہ ایک دن اس کا دل بدل جائے گا اور وہ انیہ کو بالکل مائنس کر کے کسی اور کے بارے میں سوچنے لگے گا۔

"کیا بات ہے شہزادے.. کوئی روزوں کا احترام نہیں خوب گانے وانے سنے جا رہے ہیں؟"

وقار دروازے میں کھڑا کہہ رہا تھا۔ اسے شرمندگی ہو رہی تھی۔ ریموٹ پکڑ کر اس نے موسیقی بند کی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی وجاہت نے اسے فون کر کے بلایا تھا۔ کم از کم اس وقت وہی ایک بندہ تھا جو اس کی بات سن سکتا تھا، سمجھ سکتا تھا اور کوئی قابل عمل مشورہ دے سکتا تھا۔ جب تک بابا چائے کے لوازمات لے کر آئی، وہ اسے آدھی کہانی سنا چکا تھا۔

"تو اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"انیہ چھ سال سے میرے لیے بیٹھی ہے.."

"چھ سال سے انیہ نہیں تم اس کے لیے بیٹھے ہو۔ اب آگے بتاؤ۔" چائے کا کپ منہ سے لگاتے ہوئے اس نے تصحیح کی۔

"یار! مجھے لگتا ہے میرا اور انیہ کے درمیان کبھی کچھ تھا ہی نہیں۔ یعنی میں اسے پسند کرتا تھا یا محبت کرتا تھا لیکن یار، پتا نہیں کیوں اب ایسے لگتا ہے جیسے اس تعلق میں کہیں کوئی خوشی نہیں تھی۔ یعنی اسے دیکھ کر اس کے ساتھ وقت گزار کر مجھے اچھا لگتا تھا لیکن.. مجھے لگتا ہے جیسے وہ سب فیک (مصنوعی) تھا۔ جیسے میں خوش ہونے کا ڈرامہ کر رہا تھا جبکہ درحقیقت میں خوش نہیں تھا اور میں ہی نہیں، وہ بھی خوش نہیں تھی۔ ہم کبھی دوسرے لو برڈز کی طرح ایک دوسرے کے لیے نہ کبھی جذباتی ہوئے اور یار...... مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ بالکل بے روح تعلق تھا، ہے انیہ کے ساتھ۔ میں مان لیتا ہوں ہمیشہ ایسا نہیں لگ رہا تھا.. اگرچہ شروع سے ایسا ہی تھا لیکن میں مان لیتا ہوں ایسا نہیں تھا۔ اب مگر ایسا ہی ہے۔ مجھے نہیں لگتا ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے سوٹ ایبل ہیں۔ میں آزرہ جیسی لڑکی کے ساتھ خوش رہ سکتا ہوں۔"

الجھی الجھی بے ترتیب باتوں کے بعد وہ خاموش ہو گیا تھا۔

"آزرہ جیسی یا آزرہ کے ساتھ؟"

گہرا سانس لے کر اس نے وقار کا چہرہ دیکھا اور چند ثانیے سوچنے کے بعد جواب دیا۔ "آزرہ کے ساتھ۔"

"تو پھر مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ میری کمٹمنٹ ہے۔ اتنے سال اسے اس دھوکے میں مبتلا رکھا۔ آئی ایم فیلنگ گلٹی۔"

"مسئلہ پتا کیا ہے، یہ جو ہم لوگ ٹی وی سیریل دیکھتے ہیں، مووِیز دیکھتے ہیں یا کالج یونی ورسٹی میں دوستوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں... ہر ہر جگہ محبت کی بات ہوتی ہے۔ ہم موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کب ہم بھی محبت میں مبتلا ہوں گے۔ یوں کہہ لو کہ یہ جو نوجوانی کی محبت ہے.. یہ ایک طرح سے اس عمر کی تھرل ہے۔ ہم حقیقی طور پر محبت کرتے ہی نہیں۔ تمہیں انیہ اچھی لگی اور تم نے اس کی طرف پیش قدمی کی۔

اب اس بندی کے پاس تمہیں اختیار تھا وہ تمہیں مسترد کر سکتی تھی لیکن اگر تمہیں قبول کرنے کی وجہ نہیں تھی تو تمہیں مسترد کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں تھی۔ مجھے ایسے لگتا ہے جیسے اس نے تمہیں ایک آپشن کی طرح سنبھالا ہوا ہے کہ اگر تم سے بہتر مل جائے تو ٹھیک ورنہ تم تو موجود ہی ہو۔ اب اگر تمہیں لگتا ہے کہ تمہارا یہ تعلق بے روح ہے یا شروع سے رہا ہے تو ختم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ تمہاری کوئی منگنی یا نکاح نہیں ہوا۔ لوگ شادیاں توڑ دیتے ہیں۔"

وجاہت کو آزرہ کی بات یاد آئی کہ ابتسام نے اسے اس لیے طلاق دی تھی کہ وہ کسی اور سے محبت کرنے لگا تھا۔

"یوں بھی تم نے بہت انتظار کر لیا۔ اب اگر وہ لڑکی ساری زندگی ایک لبرل فیمنسٹ بن کر گزارنا چاہے تو تم تو اس کے لیے عمر بھر نہیں بیٹھے رہو گے۔ ہاں ایک بات ہے کہ تمہیں ایک بار ساری فیلنگز ایک طرف رکھ کر غیر جانب داری سے سوچنا چاہیے کہ تم کیا چاہتے ہو؟ تمہارا دل کیا چاہتا ہے۔ اگر تم آزرہ کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہو تو انیہ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا۔"

وہ جانتا تھا وہ کیا چاہتا ہے اور اس کا دل کیا چاہتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اندر کہیں وہ فیصلہ کر چکا ہے بس انیہ کے ساتھ زیادتی نہ ہو اس گلٹ نے اسے وقتی طور پر روک رکھا ہے۔ اس وقت بڑی شدت سے دل میں آزرہ کو دیکھنے کی خواہش اٹھی تھی۔

☆☆☆

مٹھی میں جگنو سا جانے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ کوئی اس وقت انیہ سے پوچھتا۔ اس نے اپنے پورے سسٹم سے ٹکر لے کر، زندگی کو اس طرح گزارنے سے انکار کر دیا تھا جیسے اسے ماحول دیا جا رہا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والی انیہ اپنی محنت کے بل بوتے پر اس وقت ایک غیر ملکی سیمینار میں اس طرح سے سراہی جائے گی۔ اپنی تعریف کے بری لگتی ہے سو وہ بھی خوش تھی جب اسے ٹریڈیشن بریکر کہا گیا اور پاکستان کا روشن مستقبل کہہ کر پکارا گیا۔ اس کی کڑی محنت رنگ لے آئی تھی۔ نہ صرف وہ اپنی ماں کے لیے فخر تھی بلکہ پورے معاشرے کے لیے ایک مثال کی طرح دیکھی جا رہی تھی۔ اپنی اس کامیابی پر وہ بے حد مسرور، سیاہ لباس میں جگمگاتے سراپے کے ساتھ ہوٹل کے لیے نکلنے والی تھی جب اپنے نام کی پکار پر اسے رکنا پڑا۔

"مس انیہ۔"

وہ پیچھے مڑی۔

"کیا آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے؟" یہ وسیم عباسی تھا جس سے کچھ دیر پہلے ہی اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ کمپنی کی مصر میں بننے والی برانچ کا یہاں کا ہیڈ تھا۔ اس کی ساحر شخصیت نے اسے پہلے ہی خاصا متاثر کیا تھا۔ اس کی ذات میں ایک ایسا رکھ رکھاؤ تھا جیسے کسی شاہی خاندان سے تعلق ہو۔ انگلیوں میں دبے سگار اور وجود سے اٹھتی کلون کی مہک دیوانہ کر دینے کی حد تک حواس پر چھائی جا رہی تھی۔

"ملاقات ہو بھی چکی اور میرا خیال ہے اسے بھی ملاقات ہی کہتے ہیں۔" وہ خوش دلی سے گویا ہوئی۔ اس کا شوخ لہجہ اس کی اندرونی خوشی کی عکاسی کر رہا تھا۔

"نہیں یہ نہیں۔ یہ تو ایک آفیشل ورک تھا۔ میں چاہتا ہوں کہیں پر مل کر بیٹھتے ہیں۔ کھانا وغیرہ کھاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔"

انیہ بچی نہیں تھی کہ اس کی بات کا مطلب نہ جان سکتی۔ ایک لمحے کے لیے، اس نے انکار کرنے کا سوچا لیکن اسے خود بھی حیرت ہوئی جب اس نے اس پیشکش کو قبول کر لیا۔

"میں یہاں دو دن مزید ہوں۔ کل لنچ پہ ایک میٹنگ ہے، اس کے علاوہ سارا وقت فری ہوں۔"

"تو بس پھر کل ڈنر پہ ملتے ہیں۔ آپ اپنا ہوٹل بتائیں، میرا ڈرائیور آپ کو پک کرنے آ جائے گا۔"

تفصیلات طے کرتے فون نمبرز کے تبادلے ہوئے اور وہ ہوٹل کی جانب سفر کرتے سوچ رہی تھی کہ وہ کیا شے تھی، جس نے اسے اس شخص کو انکار کرنے سے روک دیا اور اندر کہیں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ وہ اسے انکار کرتی ہی کیوں؟

وجاہت حسن کی وجہ سے انکار کرنے کا کوئی

تک نہیں بنتا تھا۔ وہ اپنی پرواز بلند رکھنا چاہتی تھی اور پتا نہیں کیوں، اس کے دل میں یہ خیال بڑی شدت سے پختہ تھا کہ وجاہت حسن اس کے پر نہیں بنے گا بلکہ وہ اس کے پیروں میں زنجیر بن جائے گا۔

وہ مانتی تھی کہ اپنی محبت میں وہ یک طرفہ نہیں تھا۔ بہت بار ایسا ہوا کہ اس نے بھی وجاہت حسن کو دل کے قریب محسوس کیا تھا لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کے لیے وہ اپنی قسمت کے دروازے خود بند کر لیتی۔ اس نے ہمیشہ ہر شے پر کامیابی کو ترجیح دی تھی۔ اب بھی اس نے یہی کیا تھا۔

یہاں اس نے خود کو ایک اور رعایت دے لی تھی کہ اس نے کبھی وجاہت کو امید نہیں بندھائی تھی بلکہ وہ تو صرف ردعمل دیا کرتی تھی۔ اپنا دامن آسانی سے چھڑایا جا سکتا تھا۔

ویسے بھی وہ اچھا سمجھے یا برا، اسے کیا فرق پڑنے والا تھا۔ وسیم عباسی کی جادوئی شخصیت کے سامنے وجاہت حسن کو رکھنا گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف تھا۔ اسے اپنی زندگی میں بہترین کی خواہش اور حصول کے لیے کوشش کا حق حاصل تھا اور وہ یہی کوشش کرنا چاہتی تھی۔

ہوٹل کے پرتعیش کمرے میں سونے کے لیے لیٹتے ہوئے دل، میں اتنی ساری سوچوں میں ایک سوچ یہ بھی تھی کہ وہ کیوں اتنی آگے کا سوچ رہی ہے؟

☆☆☆

آرزہ باورچی خانے میں افطاری کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ پسینہ پسینہ ہوتا ذرا دور سے چمکتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بابا جان کے ساتھ مختصر لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہوا تو نہیں تھی لیکن موسم کھلا کھلا سا تھا اور یہاں تازہ ہوا میں پیڑوں کی سنگت میں بڑا خوش گوار سا احساس جاگتا تھا۔

بابا جان اس کے اس طرح اچانک آنے پر حیران ہوئے تھے۔ وہ چار ماہ بعد آیا تھا۔ لیکن وہ خود کو وقت دینا چاہتا تھا۔ اسے خود بھی اندازہ تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ یہ سب اس پر گزر رہا ہے یہ وقتی کیفیت ہے یا دلدل ہے۔ اس سے نکلا جا سکتا ہے یا اسی میں غرق ہونا ہے۔ یہ محبت ہے یا ترحم۔ دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ جو بھی نام دے لے، جو بھی کہہ لے زندگی اس کی قربت ہے۔ خوشی اس کی موجودگی ہے اور راحت اس کی ہنسی ہے۔

''رمضان کا آخری عشرہ شروع ہونے والا ہے انکل! آپ نے ابھی تک کپڑے نہیں بنوائے۔''

افطاری کے لیے میز تیار کر کے اب وہ ان کے پاس بیٹھی پوچھ رہی تھی۔

وجاہت نے ابرو اچکا کر ان کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو، دیکھ لیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا تھا۔

''اس عمر میں کیا فرق پڑتا ہے، میں کیا پہنتا ہوں کیا نہیں۔ نیا لباس پہنوں یا پرانا، مجھے کس نے دیکھنا ہے۔''

ان کے لہجے میں محض ایک خالی پن تھا۔ آرزہ کو یاد تھا آنٹی کی زندگی میں وہ کیسے ٹپ ٹاپ سے رہا کرتے تھے۔ وہ سوچا کرتی تھی جو شخص ادھیڑ عمری میں اس قدر شان دار دکھائی دیتا ہے اس کا بچپن بھی یقیناً بہت باکمال ہوگا لیکن انہیں اس طرح دیکھ کر اسے جو تکلیف ہوئی تھی، وہ بیان نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو لگا تھا جیسے سارے الفاظ کھو گئے ہوں اور وہ کچھ کہنے کے قابل نہ رہی ہو۔

''سب کچھ دوسروں کے لیے تو نہیں کیا جا سکتا ناں۔ ہم جو پہنتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں.. دراصل ہم اسے محسوس کرتے ہیں بلکہ ہمیں نہیں دوسروں کی قربت کو بھی محسوس کرتے ہیں۔ ارد گرد جیسے لوگ رہیں گے ہم ویسا ہی محسوس کریں گے۔ عید تو نام ہی خوشی کا ہے اور اگر اس خوشی کے لیے آپ نیا لباس پہنیں گے تو آپ اچھا محسوس کریں گے اور آپ کو دیکھ کر ہمیں بھی اچھا لگے گا۔''

اس نے بے دھیانی میں ''ہمیں'' کہہ دیا تھا۔ انہوں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ وجاہت نے پچھلی بار جانے سے پہلے انہیں بتا دیا تھا کہ اس کے ذہن میں کچھ اور ہی کہانی سنا رہا تھا اور اب اس نے طلاق دے دی ہے اور پھر اب اس کا

''کہنے پر وجاہت کے لبوں پر جو ایک مبہم مسکراہٹ ابھری تھی۔ جیسا ان کے ذہن میں برا لگا تھا، کرایا تھا بھی تو کیا برائی تھی؟

''ہم... ایسا کرو، تمہیں عید کے لیے کچھ خریداری کرنی ہو تو وجاہت سے کہنا، تمہیں بازار لے جائے گا۔ میں اب جا کر لیٹنے لگا ہوں۔ تم لوگ کھانا کھا لینا۔ میں تھوڑی دیر میں کھانا کھا لوں گا۔''

آرزہ کے ساتھ ساتھ وجاہت بھی ان کی بات پر حیران ہوا تھا۔ اس نے انہیں بتایا تو تھا کہ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہو گئی ہے۔

رات کھانے کے بعد یہی بات اس نے ان سے کی تو انہوں نے تحمل سے اسے جواب دیا تھا۔

''طلاق ہی ہوئی ہے کوئی مر نہیں گیا۔ تمہیں پتا ہے زندگی میں سب سے بڑی شے کیا ہے؟ کسی اپنے کا ساتھ... وہ اس وقت اکیلی ہے۔ سر پر کوئی تحفظ نہیں۔ کوئی ہم عمر بہن بھائی یا سہیلی نہیں۔ وہ مر جائے گی۔ اس کی عمر کم ہے، اس روگ کو پالنے کے لیے۔ اسے احساس ہونا چاہیے کہ زندگی ختم نہیں ہوئی ہے، زندگی کا ایک باب ختم ہوا ہے۔''

وہ جو کہنا چاہتے تھے، کہہ سکے یا نہیں لیکن جو وہ کہنا چاہتے تھے، وجاہت سمجھ گیا تھا۔

☆☆☆

سانپ کی طرح بل کھاتی لمبی چمکتی سڑک کے کنارے چلتے اس کے اندر اندھیرے ہی اندھیرے تھے۔ سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ وہ کافی دیر سے بے سمت پیدل چل رہی تھی اور اب اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ ہمیشہ سے ہی بے سمت چلتی رہی ہے۔

جس وقت اس کی عمر کی لڑکیاں آنکھوں میں رنگ کی پٹی باندھے تتلیوں کے تعاقب میں نکلتی ہیں یا کسی اندھے کنویں میں اترنے لگتی ہیں وہ مضبوطی سے جم کر اپنے ایک خواب کی تعبیر کے لیے کوشاں رہی۔ اسے اپنا مستقبل بنانا تھا۔

اپنی جانب بڑھتے ہاتھوں کو دھتکارتے اس نے وجاہت حسن جیسے سچے اور مخلص شخص کے ساتھ بھی اپنے بوجھ نہیں بانٹے۔ وجاہت کی سوچ پر اس کے ہونٹوں پر بڑی زہر خند مسکراہٹ آئی تھی۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے اس نے خود ہی اس شخص کو میسج کر کے کہا تھا کہ وہ اس کا انتظار نہ کرے، وہ اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہے اس نے وجاہت حسن کو مسترد کر کے نئے افق تلاشنے کی خواہش کی تھی۔

وسیم عباسی کے ڈرائیور کے آنے تک وہ جھلملاتے سرخ رنگ کے ملبوس میں نک سک سے تیار کسی شہزادی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ گزرے سالوں میں اس نے خود کو سنوارنے کا جو ہنر سیکھا تھا آج پورے کا پورا، خود پر آزما لیا تھا اور آئینہ کہتا تھا کہ اگر آج کی رات فیصلہ کن رات ہو تو دنیا کی کوئی شے اسے مات نہیں دے سکتی۔ ہوٹل کی لابی میں وہ اس کا ہی منتظر تھا۔ شہر کے مہنگے ترین ریستوران کے خوابناک ماحول میں کھانا کھانے کے بعد وہ فوراً ہی وہاں سے نکل آئے تھے۔

''میں کچھ دیر آپ کے ساتھ تنہائی اور پرسکون ماحول میں گزارنا چاہتا ہوں.. اگر آپ کو اعتراض نہ ہو۔''

اور اسے اعتراض کیسے ہو سکتا تھا؟ کم از کم اس وقت تک تو اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ اسے لے کر اپنی عارضی سکونت کے ٹھکانے پر آ گیا تھا۔ ہوٹل کا یہ پرتعیش اور شان دار سوئٹ اس کے اعلیٰ ذوق کا مظہر تھا۔ جانے کیوں اس آرام دہ ماحول میں وہ بہت بے آرام ہونے لگی تھی۔ کانچ کے گلاسوں میں سنہری مشروب انڈیل کر اس نے ایک گلاس اس کی جانب بڑھایا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل ڈوب کر ابھرا تھا۔

''سوری آئی ڈونٹ ڈرنک۔''

کندھے اچکا کر اس نے اپنا گلاس لیا اور اس

کے برابر بیٹھ گیا۔

اس کے بعد ہونا تو بہت برا چاہیے تھا۔ وہ بنا سوچے سمجھے جو حرکت کر بیٹھی تھی اس کے بعد برے سے برے انجام کی ذمہ داری بھی اسی کی بنتی تھی لیکن یہ اس کی خوش قسمتی کہ وسیم عباسی زور زبردستی کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ انیہ نے اپنا جسم بچا لیا تھا لیکن اس شخص نے اس کی روح تک چھلنی کردی تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے، میں نہیں جانتا ایک خوب صورت اور جوان لڑکی اس مقام تک کس کس کی "محنت" سے پہنچی ہوگی؟"

پگھلا ہوا سیسہ تھا جو اس کے کانوں میں انڈیلا گیا تھا۔

"جس آسانی سے تم میرے ساتھ آنے کے لیے تیار ہوگئی تھیں اس کے بعد یہ سب کیا قیمت بڑھانے کے لیے ناز نخرے ہیں؟ میرے ساتھ ڈیل کرو، میں تمہیں آسمان کا سب سے درخشاں ستارہ بنا دوں گا اور یہ میں صرف کہہ نہیں رہا، تم اچھی طرح جانتی ہو۔ میں تمہیں تمہاری مرضی کے ملک میں سیٹل کروا سکتا ہوں اور جو جو کچھ تم چاہو۔"

اس کے بالوں کو چھوتے ہوئے مخمور لہجے میں وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا لیکن انیہ کے لیے بہتر یہی تھا کہ کان بند کر لے، ورنہ ایک عرصہ ان سب لفظوں نے بچھو بن کر اسے کاٹنا تھا۔ اتنے سالوں کی پاکیزگی کس نے دیکھی تھی؟ اس نے کبھی کسی سے ہاتھ تک نہیں ملایا تھا، بلکہ ہاتھ تو کیا اس نے تو لہجے میں بھی مٹھاس نہیں سموئی تھی۔ اپنے پندار کی کرچیاں سمیٹتے وہ وہاں سے نکل آئی تھی۔

"مان بھی لوں کہ تم یہاں تک اپنی صلاحیت کے بل پر آئی ہو تو ایک بات کی یقین دہانی کروا دوں زیادہ دیر یہاں تک نہیں سکو گی۔ میں نہیں تو کوئی اور ہوگا اور ہر شخص میری طرح اصولوں پر چلنے والا نہیں ہوتا۔"

بار بار وہی باتیں سوچ کے اس کا سر پھوڑے کی طرح [illegible] وجود کے ساتھ

پیروں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تو وہ وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی۔ کندھے سے لٹکتے بیگ کو اتار کر قریب رکھا تو اس میں پڑے فون کا خیال آیا۔

حبہ کا نمبر ملاتے اس کے ذہن میں صرف یہ تھا کہ شاید وہ بہتر محسوس کرے، لیکن وسیم عباسی کی اوچھی حرکت اور پیشکش بتانے کے بعد اسے حیرت ہوئی تھی جب اس نے بڑے عام سے انداز میں اس کا رد عمل پوچھا۔

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟"

کیا یہ بات پوچھنے والی تھی کہ اس نے کیا جواب دیا ہوگا۔ "وہی جو دینا چاہیے تھا۔ میں خود اگر یہاں تک پہنچ سکتی ہوں تو مجھے تمکین کرنے کے لیے بھی کسی کی ضرورت نہیں۔"

"چیزیں ایسے کام نہیں کرتیں انیہ! تم نہیں جانتیں اس بندے کو..."

"تم جانتی ہو؟" اس نے بے صبری سے بات کاٹی تھی۔ حبہ نے ہی اسے یہاں اس کمپنی میں جاب کے لیے بھیجا تھا۔ ایک مشکل ترین انٹرویو کے بعد وہ اپنی اہلیت کے بل بوتے پر آگے بڑھتی گئی تھی۔

"ہاں۔ میں جانتی ہوں اور شاید ہی کوئی ایسے جانتا ہو جیسے میں جانتی ہوں۔ میری بات سنو انیہ! وہ ٹھیک کہہ رہا ہے، وہ تمہیں آسمان کا سب سے روشن ستارہ بنا سکتا ہے اور ایک بات تمہیں میں بھی بتانا چاہوں گی کہ قسمت کا ستارہ ہر وقت عروج پر نہیں ہوتا۔ آج اگر اس نے تمہیں یہ کہا ہے تو ہو سکتا ہے کل تم اسے کہو... لیکن تب تک وقت بدل چکا ہوگا۔ جذباتی ہونے کے بجائے ٹھنڈے دل سے سوچ کر فیصلہ کرنا۔"

انیہ کو اپنے کانوں پہ اعتبار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ آتی جاتی گاڑیوں کی لائٹس کے پیچھے بھاگتی نگاہ کہیں خلا کے پار رک گئی تھی۔ یہ حبہ تھی... وہ حبہ جسے لڑکوں سے انتہا کی نفرت تھی۔ اس کے بارے میں طنزیہ طور پر "پکی فیمنسٹ" کہا جاتا تھا اور اسے کبھی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ وسیم عباسی کے بعد حبہ کا رویہ

اس کے لیے ایک ہی دن میں دوسرا شاک تھا۔

"نا، مجھے یقین نہیں ہو رہا، یہ تم مجھ سے کہہ رہی ہو۔"

"ایک بار مجھ پر بھی ایسا وقت آیا تھا لیکن میں فیمنزم کے چکر میں گنوا بیٹھی۔ انیہ اوپر جانے کے لیے سیڑھیوں کی ضرورت نہ بھی پڑے تو ایک جگہ ٹکنے کے لیے سہاروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ورنہ دوسرے لوگ آپ کو دھکا دے کر نیچے گرا دیتے ہیں اور آپ کی ساری محنت اکارت چلی جاتی ہے۔ وہ بندہ اسی نیچر کا ہے کہ اگر تم نے اسے انکار کر دیا ہے تو تیار رہو، کل کا دن تمہارے لیے کیا لے کر آتا ہے۔ وہ تمہیں واپس نہیں آنے دے گا یہاں تک کہ تم مجبور ہو کر خود اس کے پاس جاؤ گی اور پھر تمہاری ڈیل کے بعد بھی یہی کچھ ہوگا۔"

اس کی ریڑھ کی ہڈی سنسنا اٹھی تھی۔ حبہ جیسے کسی اندھے کنویں سے بول رہی تھی۔ ایک دم انیہ کو اس کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہونے لگی تھی۔

"تمہارا پاسپورٹ کہاں ہے؟ اور تم کہاں ہو؟"

☆☆☆

بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر مہندی اور چوڑیوں کے ساتھ گلاب اور بیلے کے گجرے پڑے تھے۔ ان کی خوشبو مشام جاں معطر کرتی کہیں روح میں بسیرا کرنے کی سعی کر رہی تھی۔ بستر پر کتاب ہاتھ میں لیے آرزو کی نگاہ ان چیزوں سے ہٹ نہیں رہی تھی تو کتاب کیسے پڑھی جاتی۔

وجاہت کی اتنی کوششوں کے بعد بھی وہ اس کے ساتھ عید کی شاپنگ پر جانے کے لیے راضی نہیں ہوئی تھی۔

"مجھے کچھ چاہیے ہوگا تو مجھے بازار کا راستہ آتا ہے۔" وہ بھی ضد کی پکی تھی۔

آج چاند رات تھی۔ شہر در شہر رونقیں ہوں تو ہوں اس کی قسمت میں اندھیرے تھے سو کمرے میں اندھیرا کیے وہ لیٹی ہوئی تھی جب وہ ایک بار پھر آ دھمکا۔

"تمہیں اپنے گھر میں کوئی کام نہیں ہے؟"

"میرے گھر میں صرف میں نہیں رہتا۔ جو رہتے ہیں وہ کر رہے ہیں کام۔ چلو آؤ، کہیں باہر چلتے ہیں۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے، میرا نہیں۔ گھڑی دیکھ رہے ہو؟ جاؤ یہاں سے۔ میں کہیں نہیں جا رہی۔"

"کچھ نہیں خریدیں گے بس باہر کا ایک چکر لگا کر آتے ہیں۔"

کتنی مزاحمت کی جا سکتی تھی؟ اس نے انکل کو طلاق کا خود بتایا تھا اور نوکری چھوڑنے کا بھی۔ طلاق والی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر انہوں نے اس کی نوکری چھوڑنے والی بات کو سراسر حماقت قرار دیا تھا۔

"رزق چل رہا ہے چلنے دو۔ یوں بھی اکیلی ہو۔ گھر بیٹھی رہو گی تو سوچیں چاٹ جائیں گی۔ باقی جیسے تمہاری مرضی۔ میں تو اسے بے وقوفی ہی کہہ سکتا ہوں۔"

بات تو ان کی بھی ٹھیک ہی تھی۔ نئی جگہ پر نوکری کے سو جھمیلے تھے لیکن جیسے ہی وہ گھر پہنچی، ایک بار پھر رائیگاں کا دکھ آنکھ سے پانی بن کر بہنے لگتا۔ اب تو ویسے بھی کتنے دنوں سے وہ گھر ہی تھی۔ سوچ تو یہ بھی تھا کہ وہ خود اس ماحول سے کچھ دیر کے لیے نکلنا چاہتی تھی۔ شاید دنیا کے کسی ہنگامے میں وہ خود کو کھو دے تو سارے درد ختم ہو جائیں۔

باہر عید کی گہما گہمی تھی۔ چاند رات پورے عروج پر تھی۔ بازاروں میں کپڑے، جوتے اور دوسری اشیائے ضروریہ کی دکانوں پر رش لگا ہوا تھا۔ بارونق بازاروں سے ہوتے ہوئے وہ اسے لے کر رنگ روڈ کی طرف چلا گیا۔ گاڑی کے پرسکون ماحول میں دھیمی آواز میں کوئی بڑی پیاری دھن گونج رہی تھی۔

اپنی اپنی جگہ دونوں ہی مختلف احساسات میں گھرے جا رہے تھے کہ سفر ختم نہ ہو لیکن مسافتیں

کتنی ہی پیاری کیوں نہ ہوں جب تک منزلیں متعین نہ ہوں بے سود رہتی ہیں۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

گاڑی روک کر اسے اترتے دیکھ وہ ایک بار گھبرا گئی تھی۔ یہ کوئی رہائشی علاقہ تھا اور وہ بالکل نہیں جانتی تھی کہ وہ شہر کے کس گوشے میں موجود ہے۔

"یہ میرا گھر ہے۔ تھوڑی دیر میں واپس چلتے ہیں، مجھے بس ایک چھوٹا سا کام یاد آ گیا ہے۔"

وہ باقاعدہ منصوبہ بندی سے اسے یہاں تک لایا تھا۔ لہجہ سرسری بناتے وہ لڑکا اتنا بڑا جھوٹا لگ رہا تھا کہ گم حواسوں کے ساتھ بھی آئرہ نے محسوس کر لیا تھا۔ "میں یہیں انتظار کروں؟"

"پاگل ہو؟ اندر میری ماما ہیں، میری بہن ہے۔ تمہیں کوئی کھا نہیں جائے گا بلکہ الٹا تمہیں کچھ کھلا کر ہی بھیجیں گے۔"

بادل نخواستہ وہ بھی گاڑی سے اتر کر اس کے پیچھے اندر چلی گئی۔

عید کی تیاریوں میں مگن ماما اسے دیکھ کر بہت حیران ہوئی تھیں۔ وجاہت نے جب اپنی پسند کا بتایا تھا تو انہیں یقین نہیں ہوا تھا لیکن پھر اس کے بعد اس کی ٹال مٹول سے وہ عجیب احساسات سے دوچار ہوئی تھیں۔ انہیں لگتا تھا کہ شاید انہیں ٹالنے کے لیے اس نے جھوٹ کہا ہے، اتنی بار کہنے پر بھی وہ اس لڑکی کے بارے میں کچھ بتانے پر راضی نہیں تھا اور اب اچانک اسے گھر لے آیا تھا۔ جھینپی جھینپی اور کچھ کچھ خوفزدہ آئرہ انہیں پہلی نگاہ میں پسند آئی تھی ورنہ وہ سوچتی تھیں جانے کیسی لڑکی ہو جسے وجاہت نے پسند کیا ہے۔ ماما نے تو دوستی کا نشہ میں ذرا دیر نہیں لگائی تھی۔ تھوڑی سی دیر میں ہی وہ اسے اپنے کمرے میں لے گئی تھیں۔

"کوئی نہیں آئے گا یہاں.. بھائی کے علاوہ۔" وہ شوخ ہوئی۔ "آپ نقاب کھول لیں اور ایزی ہو کر بیٹھ جائیں۔"

نقاب پنیں اتار کر وہ بیگ میں رکھنے لگی۔ ابھی وہ اس کی شوخی کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کی اگلی بات پر وہ سن ہو گئی تھی۔

"بھائی سے پہلی بار آپ کہاں اور کیسے ملی تھیں؟ بھائی نے تو آج تک کچھ نہیں بتایا سوائے اس کے کہ آپ ان کی زندگی میں موجود ہیں۔"

آئرہ کو جھٹکا لگا تھا اس کی بات پر۔ وہ اسے کیا سمجھ رہی تھی۔ "میرا خیال ہے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"کیا مطلب غلط فہمی؟" اپنے شاپنگ بیگز اور جانے کیا کیا اس کے آگے ڈھیر کرتی وہ رک کر اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ "بھائی نے آنے سے پہلے فون کیا تھا کہ وہ آپ کو لے کر آ رہے ہیں۔ سچ کہوں تو جب سے بھائی نے بتایا کہ وہ کسی کو پسند کرتے ہیں نہ۔"

محبت کا لفظ اس نے جس طرح روکا تھا، آئرہ پہلو بدل کر رہ گئی تھی۔ "ہم لوگ انتظار ہی کر رہے تھے کہ کب وہ ہمیں آپ سے ملوائیں۔ آپ کو پتا ہے ہماری فیملی بہت اوپن مائنڈڈ ہے۔ ماما کو آپ پسند نہ بھی آتیں تو وہ کبھی اس رشتے سے منع نہ کرتیں۔ پتا نہیں بھائی نے آپ کو ملوانے میں اتنے سال کیوں لگا دیے۔ آپ بھائی کے ساتھ پڑھتی تھیں ناں؟"

آئرہ جتنی دیر وہاں رہی دھڑکنوں کو سنبھالنے میں لگی رہی۔ پتا نہیں وہ لڑکا کیا کر رہا تھا۔ اس کی ماما نے اس سے مل کر بہت خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"بھئی۔ ہماری چاند رات تو اب ہوئی ہے، جب یہ چاند ہمارے گھر میں نکل آیا ہے۔"

ان کا والہانہ انداز دیکھ دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔ چاہ کر بھی وہ ان کی غلط فہمی دور نہیں کر پائی کہ یہ اس شخص کی کارستانی تھی جو ان کی محبتوں کے مظاہرے اور آئرہ کے جھینپنے سے لطف اندوز ہوتا زیر لب مسکرا رہا تھا۔ اس گھر میں داخل ہوتے وقت وہ جتنا ڈری ہوئی تھی یہاں سے اس سے زیادہ محبت سمیٹ کر لے جا رہی تھی۔

اصولاً اسے وجاہت سے پوچھنا چاہیے تھا کہ اس نے اپنے گھر والوں کے بارے میں کیا کہا تھا لیکن

دل ایک دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔ اسے گھر چھوڑنے جانے سے پہلے وجاہت نے اس کے لیے چوڑیاں، مہندی اور پتا نہیں کیا کیا لے لیے تھے۔

"پلیز۔"

"جان اتنی بڑی خوشی دی ہے تو میری چھوٹی سی خوشی کے لیے رکھ لو۔"

اس کا لودیتا لہجہ اور نگاہوں کی تپش کچھ بھی کہنے سے روک رہی تھی اور وہ رک گئی تھی۔

☆☆☆

دل اس کی طلب میں بے تاب سے رہتا

وہ چاند جو آنگن میں اترتا بھی نہیں ہے

اس عمر کے صحرا سے تیری یاد کا بادل

ٹلتا بھی نہیں اور برستا بھی نہیں ہے

کچھ چیزیں واضح ہونے میں اتنا وقت لگا دیتی ہیں کہ ان کی چاہت کے دیپ جو دل میں خون سے جلے ہیں وہ بجھ جاتے ہیں۔

تیز موسیقی کے شور میں میز کے سامنے بیٹھے وجاہت کے لیے بھی وہ لمحہ آ گیا تھا جس کی خواہش میں ایک عمر اس نے انتظار کیا تھا۔

انیہ اس کے سامنے بیٹھی تھی اور زندگی میں پہلی بار وجاہت کو گوشت پوست سے بنی ایک عام لڑکی لگی تھی جس کے احساسات ہوتے ہیں اور جو محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ایک بار تو وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ وہ جیسے کسی گڑیا سے جیتی جاگتی لڑکی میں تبدیل ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کے تنے ہوئے نقوش میں ایک نرمی اور ملاحت تھی۔ وہ مسکراہٹ تھی جو زخم بھر دینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

دوستوں کے ساتھ ایک چھوٹی سی عید ملن پارٹی کے لیے وہ اسلام آباد گیا ہوا تھا جہاں اسے انیہ کا فون آیا تھا۔ وہ جس دن اسلام آباد کے لیے نکل رہا تھا اسی دن انیہ نے اسے بتایا کہ وہ پاکستان واپس آ گئی ہے۔ اس کا آفیشل ٹرپ تو غالباً دو ماہ کا تھا لیکن ابھی تو ایک مہینہ بھی پورا نہیں ہوا تھا۔ جلدی جلدی میں ان کی تفصیل سے بات نہیں ہو سکی تھی اور اب وہ فون پر کہہ رہی تھی۔

"مجھے تم سے ملنا ہے۔ کب تک مل سکتے ہو؟"

یہ ایسے ہی تھا جیسے سورج مغرب سے نکل آئے۔ ہمیشہ وہ ملاقات پر اصرار کرتا تھا اور انیہ اپنی سہولت کے مطابق اسے ٹائم دے لیتی تھی۔ اگر کبھی ملنے کا کہتی بھی تو وہ یقیناً کسی کام سے ملنا ہوتا تھا لیکن اب کی بار اس کے لہجے میں ایک تپش تھی جو وجاہت کا خون جلانے لگی تھی۔ تو اس کا حیران ہونا بنتا تھا۔

اب وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی ایک بالکل مختلف لڑکی کے روپ میں تھی۔ وجاہت کو خود کو یقین دلانا پڑا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے جس سے وہ اتنے سال رابطے میں رہا ہے اور گاہے گاہے ملتا بھی رہا ہے۔ وہ جاب چھوڑ چکی تھی یہ ایک اور نئی خبر تھی۔

"میں اب اپنی زندگی میں سیٹل ہونا چاہتی ہوں۔ میں اب یہ باہر کے دھکے نہیں کھا سکتی مزید۔"

تو اگر یہ لمحہ کچھ عرصہ پہلے تک ان کے بیچ آیا ہوتا تو وہ خود کو دنیا کا خوش نصیب انسان سمجھتا لیکن اب بہت کچھ بدل چکا تھا۔ حتیٰ کہ اس کا دل بھی۔ اس کے اور انیہ کے درمیان ایک لمحہ آ کر ٹھہر گیا تھا۔

وہ لمحہ جب چاند رات کو آئرہ کو گھر چھوڑنے جاتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

"آئرہ! مجھ سے شادی کرو گی؟"

اس وقت سے پہلے ہی اس کا اور انیہ کا تعلق ٹوٹ چکا تھا یا شاید کبھی جڑا ہی نہیں تھا لیکن اب جب وہ آئرہ کی آنکھوں کو زبردستی اپنے خواب دے چکا تھا تو قدم پیچھے کھینچ لینا موت کے مترادف تھا۔

وہ خاموش تھا جیسے اس کی گویائی کہیں رہن رکھی ہو۔

انیہ نے زندگی کے سارے سبق بہت جلدی سیکھ لیے تھے۔ اس نے وجاہت حسن کو بھی پہلے ہی پڑھ لیا تھا یہی وجہ تھی کہ اس کی سچائی دیکھتے اس نے اسے اپنے پاس رکھا تھا۔

ٹھیک ہے زندگی کا ایک اہم سبق اس نے دیر

سے سیکھا کہ اس معاشرے میں عورت کا مقام تب ہی معتبر ہوسکتا ہے جب اس کے نام کے ساتھ کسی مرد کا مضبوط حوالہ جڑا ہو۔

اس رات جب حبہ سے اس کی بات ہوئی تھی حبہ کے کہنے پر اس نے سب سے پہلے ہوٹل جا کر اپنا سامان لیا اور کسی کو بتائے بغیر پہلی فلائٹ پکڑ کر پاکستان واپس آ گئی تھی۔ گزرے دنوں میں اس نے استعفیٰ دے کر کمپنی سے جان بھی چھڑا لی تھی۔ اس کا خیال تھا وہ وجاہت سے شادی کا کہے گی، اسے نوکری سے استعفیٰ دینے کا بتائے گی تو وہ خوش ہوگا لیکن یہاں ایک خاموشی تھی اور یہ خاموشی اسے الجھن میں مبتلا کر رہی تھی۔

''میں شادی کے لیے تیار ہوں۔ جب کہو ہم شادی کر لیں گے۔''

پھر وہی وقت کی بے مہری...... کہیں یہ بات وہ پہلے کہہ دیتی... لیکن نہیں کہی تھی اور اب اس بات کی وہ اہمیت بھی نہیں رہ گئی تھی۔

''میں تمہیں بتا دوں گا۔'' کوشش کے باوجود وہ اپنے لہجے سے پریشانی کا عنصر غائب نہیں کر سکا تھا۔

''تم کچھ پریشان لگ رہے ہو، خیریت ہے؟''

اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ یہ لڑکی اس کی زندگی کا سب سے بڑا امتحان بننے والی ہے۔ اس نے سوچ رکھا تھا جب وہ اس سے ملے گا، اسے بتا دے گا کہ وہ اپنے لیے نئی راہ چن چکا ہے لیکن اب وہ جس طرح اس سے ملی تھی، اسے اپنے حواس ساتھ چھوڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ بڑی شدت سے اس نے خواہش کی تھی کہ کاش وہ پہلے جیسے ہی ہوتی بے نیاز اور سرد مہر۔

☆☆☆

سارے موسموں کا تعلق دل کے موسم سے ہوتا ہے، اس سے پہلے اسے معلوم نہیں تھا۔ عید کا دن توقع سے زیادہ گرم تھا۔ انکل اپنے کمرے میں قیلولہ کرنے کے لیے جا چکے تھے۔ وہ بھی کتاب لے کر بستر پر بیٹھ گئی۔ صبح سے کتنی بار رو چکی تھی وہ۔ اب بھی آنکھوں میں پانی آ رہا تھا۔ دھندلی نظر سے اس نے کھڑکی کے پار اسے دیکھا۔

جانے وہ کس وقت سے کھڑکی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ نظر چرا کر اس نے دوپٹہ اوڑھا اور رسم دنیا نبھانے کے لیے عید مبارک کہہ کر اس کے لیے شیر خورمہ لینے باورچی خانے میں چلی گئی۔ وہ اس کے پیچھے ہی چلا آیا۔

تمہاری دید پہ آنکھوں کی عمر یاد ہیں ہم
تمہارے نام پہ دھڑکن چلے، اجازت ہے؟

دھیمے لہجے میں کہتے اس کی نگاہیں آئرہ پر رکی تھیں اور آئرہ کی دھڑکن رک گئی تھی۔ ہاتھ کانپے اور پیالی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

''بہت نکمی لڑکی ہو بھئی تم تو۔'' وہ اندر چلا آیا۔ برخلاف توقع جواب نہیں آیا تھا۔

''اسی لیے کہتا ہوں، مجھ سے شادی کر لو، میں تو یہ چھوٹے موٹے نقصان برداشت کر سکتا ہوں۔ مجھے منع کر کے میرا دل اور جانے کس کا گھر برباد کرو گی۔''

گزری رات اس نے پوچھا تھا ''آئرہ! مجھ سے شادی کرو گی؟''

اور وہ ''نہیں'' کہہ کر گاڑی سے اتر گئی تھی۔

ابتسام کے بعد جو دل نے حد بندی کر دی تھی، اسے لگا تھا وہ ساری زندگی کسی پر اعتبار نہیں کر سکے گی لیکن یہاں تو جیسے اس کے بھی دل میں پہلے سے جگہ خالی تھی کہ وہ بنا دستک دیے دھڑنے سے آ کر براجمان ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کے جذبوں کی پذیرائی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ایک طلاق یافتہ لڑکی تھی اور وجاہت حسن اتنا مکمل شخص تھا کہ وہ اس کے ساتھ گرہن کی صورت نہیں جڑنا چاہتی تھی۔

''اب تو میرے گھر والوں سے بھی مل چکی ہو تم اور میں تم پہ پہلے سے نثار ہو رہا ہوں۔''

وہ شوخ ہو رہا تھا اور اس کے اندر خاموشی تھی۔ دل جیسے سوگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ اسے بتا رہا

جو گزر گیا وہ راستہ تھا۔ ابھی بھی پھولوں کے کھل سکتے ہیں۔ وہ جتنا بکھری ہوئی تھی وہ چاہتی تھی کوئی خالص رشتہ اس کے پاس ہو۔ چاہے وہ ماں باپ، بہن بھائی کا ہوتا یا کسی محبت کا۔ آسرے کی ضرورت بڑی شدت سے تھی اور وہ شخص سہارا بن بھی رہا تھا۔ اس تپتی دوپہر میں دل کے آنگن میں ان گنت پھول کھلے تھے۔

جس بھری شام میں اس گھر سے اپنا سامان اٹھا کر نکلتے ہوئے اس نے خزاؤں کو پہلے سے زیادہ شدت سے خود پہ حملہ آور ہوتے دیکھا تھا۔ انکل پوچھ رہے تھے۔

''مجھے کوئی مسئلہ نہیں تم یہیں رہتی رہو۔'' وہ جانتی تھی جانے کتنے سالوں سے وہ اکیلے پن کے برزخ میں گرفتار تھے۔ وہ ان کی زندگی میں زبردستی داخل ہوئی تھی لیکن اپنے شوق کی تکمیل کے لیے سب کچھ پہلے جیسا کرتے ہوئے وہ انہیں گئے موسموں کی جانب جاتا راستہ دکھا گئی تھی۔ انہیں بتا گئی تھی کہ ابھی بھی ماضی کی کوکھ سے گلاب اگائے جا سکتے ہیں۔

آج ڈھلتے سورج کے روپوش ہونے کے بعد ڈھلتی شام میں جب وہ کرسی ڈالے بیٹھے تھے تو ان کے قدموں میں بیٹھ کر ان کا ہاتھ تھامے اس نے انہیں یاد کروایا تھا جب انہوں نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔

''فضہ نے جس مگ میں آخری بار دودھ پیا تھا، یہ وہ مگ تھا جو اس لڑکی سے ٹوٹا تھا۔''

فضہ ان کی چار سالہ وہ بیٹی تھی جو ایک حادثے میں جان سے چلی گئی تھی۔ انہیں وہ مگ یاد تھا، اس مگ کا ٹوٹنا یاد تھا، یہاں تک کہ وہ تھپڑ بھی یاد تھا جو انہوں نے مارا تھا لیکن انہیں وہ لڑکی سرے سے ہی یاد نہیں تھی جس سے وہ مگ ٹوٹا تھا۔ انہیں وہ لڑکی یاد نہیں تھی لیکن انہیں اس لڑکی کا پتا تھا جو چاہتی تو گزرے زمانوں کو آواز دے کر واپس بلا سکتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ رک جائے لیکن اب وہ وہاں نہیں رک سکتی تھی۔

وہ اب ان کی زندگیوں سے دور جانا چاہتی تھی۔ اس کا ضمیر گوارا نہیں کرتا تھا کہ وہ کسی بیل کو اکھاڑ کر اس کے پیڑ سے لپٹ کر زمین سے اٹھ کر خود کو مسلے جانے سے بچائے۔

اس روز انکل کی طبیعت خراب تھی تو وہ انہیں لے کر اسپتال گیا تھا۔ اس رات انکل نے اسے اپنے پاس ہی روک لیا تھا۔ وہ ایک اہم فون کال تھی جو وہ اپنے کمرے کے سامنے سے گزر کر ٹن ٹن ٹن پڑتی بارش میں فون لیے چھت پہ چلا گیا تھا۔ وہ پانی کا گلاس لینے باورچی خانے میں گئی تو بارش تیز ہونے پر وہ نیچے اتر آیا۔ باورچی خانے کی سال خوردہ کھڑکی کے سامنے فون کے اسپیکر سے کسی لڑکی کی آواز بارش کے مدھم شور میں بڑی واضح سنائی دے رہی تھی۔

''تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے وجاہت! چھ سال تک تم مجھ سے محبت کا کھیل کھیلتے رہے ہو اور اب اچانک تمہیں لگتا ہے کہ تم نے مجھ سے کبھی محبت ہی نہیں کی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں کیا کروں؟ تم نے کیوں کیا میرے ساتھ ایسے؟ محبت نہیں تھی تو کیوں اتنے سال مجھ سے کہتے رہے؟''

وہ رو رہی تھی۔ آئرہ کے دل میں خنجر گڑ گیا تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ فوراً باہر نکل جائے یا وہیں کھڑی اس کے جانے کا انتظار کرے۔ دونوں کام ہی مشکل تھے۔ وہ کیسے اس پہ ظاہر کرتی کہ وہ اس کا دھوکا جان چکی ہے اور کیسے کھڑی رو کر مزید کھڑی رہے؟ اسے باہر جانا چاہیے تھا لیکن اس کے قدم وہیں زمین نے تھام لیے تھے۔

''جو بھی کیا تم نے خود کیا ہے اپنے ساتھ، اس لیے مجھے الزام مت دو۔ میں مانتا ہوں، میں نے غلط کیا لیکن سچ بتاؤ کیا تمہیں لگتا ہے، ساری غلطی میری ہے؟''

آئرہ کی سن گئی تھی۔ بارش اتنی قوت سے زمین

سے ٹکرانے لگی تھی کہ بوندوں کے شور میں ان کی آوازیں دب کر رہ گئی تھیں۔

دوٹوک مجھ سے بات کر

یا چھوڑ دے یا ساتھ چل (عین حیدر)

اس نے دوٹوک فیصلہ کرلیا تھا کہ ابھی فیصلہ اس کے ہاتھ تھا۔ اسے یہاں نہیں رہنا تھا۔ اپنا مختصر سا سامان اٹھا کر انکل کو خدا حافظ کہہ کر وہ اپنے گھر آ گئی تھی۔ اسے اگر اس گھر کے موسم ازبر تھے تو بھولی تو وہ اپنے گھر کا بھی کچھ نہیں تھی۔ معافیہ جاتے جاتے جو کچھ لے جا سکتی تھی لے گئی تھی۔ ضرورت کی چیزیں بھی دستیاب نہیں تھیں۔

اگلے کتنے ہی دن لگ گئے تھے اسے ضرورت کی چھوٹی چھوٹی چیزیں اکٹھی کرتے۔ جلد ہی زندگی جیسے ڈگر پر آ گئی تھی۔ صبح آفس جاتی اور واپس آنے کے بعد گھر کی صفائی اور پکانے میں مصروف ہو جاتی۔

گھر کا ایک پورشن پہلے سے کرائے پر تھا۔ مختصر سا خاندان تھا۔ میاں بیوی اسی کے ہم عمر ہوں گے۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ اس کا دل بھی لگا رہتا اور اکیلے پن کا احساس بھی نہ ہوتا۔ اسے ہمیشہ بچوں کی خواہش رہی تھی لیکن ایک تو نوکری اور دوسرا ابتسام کہتا تھا۔

”میں ابھی اس جھنجھٹ میں پڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“

سارا دن بے انتہا مصروف گزارنے کے بعد رات کو بستر پر لیٹتے ہی جیسے زہریلے بچھوؤں جیسی یادیں ذہن کے کونے کھدروں سے نکل نکل کر ڈسنے لگی تھیں اور دل جیسے خالی ہو گیا تھا۔ نہ کوئی دکھ تھا نہ خوشی تھی۔۔ بس ایک خاموشی سی تھی جس نے اس پر اپنا تسلط جما لیا تھا۔ دل کو ہول اٹھتے تھے لیکن وہ مضبوطی سے اپنے فیصلے پر جمی ہوئی تھی۔

بہت بار دل چاہا کہ جا کر انکل کو دیکھ آئے لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس سے سامنا ہو، جس نے اس طرح بے ... کر اب ... بھی جاتا تو

دل بسنے والا نہیں تھا۔ اس کی راتیں بھیگ گئی تھیں۔

ابتسام کے ساتھ گزرے سالوں میں اس نے ایک لمحے کے لیے بھی ان سب کمیوں کو نہیں سوچا تھا جو اس کی زندگی میں ہمیشہ رہی تھیں۔ وہ تو بس اس کی شکر گزار رہی تھی کہ اس کی وجہ سے وہ اس جہنم سے نکل گئی تھی، جو معافیہ نے اس کے لیے بنا رکھا تھا اور عنقریب آئرہ، اس دلدل میں اترنے والی تھی جہاں سے اسے تازہ ہوا کا جھونکا بھی خواب لگتا تھا۔

وجاہت حسن وہ شخص تھا جس نے اسے احساس دلایا تھا کہ زندگی میں محبت بھی ہوتی ہے۔ ہر شخص ابتسام جیسا نہیں ہوتا۔ وہ اسے جتنی اہمیت دیتا تھا، جیسے اس کی پروا کرتا تھا اور سب سے بڑھ کر اس کا لودیتا لہجہ جیسے آئرہ کا وجود پگھلاتا تھا۔ محبت تو ایسی ہی ہوتی ہے ناں۔

اسے خود علم نہیں ہوا اور وہ اس کی محبت میں مبتلا ہوتی چلی گئی۔ ٹھیک ہے اس نے دل دکھایا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ دل سے نکل گیا تھا۔ وہ وہیں موجود تھا اپنی تمام تر وجاہت کے ساتھ پورے استحقاق کے ساتھ۔ دل کی مسند پر روزِ اول کی طرح وہ وہیں تھا۔

☆☆☆

کسی خوش رنگ منظر سے سارے رنگ کھینچ لیے جائیں تو کیا دلکشی رہ جاتی ہے؟

اس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا انیہ کے ساتھ کیا ہوا ہے لیکن وہ جانتا تھا، کچھ تو ضرور ہوا ہے جو وہ ایسے بدل گئی ہے لیکن اب اسے اس میں کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی تھی۔ اس نے واضح الفاظ میں اسے بتا دیا تھا کہ وہ اپنا راستہ الگ کر چکا ہے۔ وہ حیران تھا۔ اس کو یقین نہیں آتا تھا۔ وہ لڑکی جس نے اسے اتنے سال نہ ڈھنگ سے وقت دیا اور نہ توجہ، وہ کیسے اس کی محبت کی دعوے دار ہو رہی تھی۔

اسے شک ہوتا تھا کہ یہ وہی لڑکی تھی۔ کتنی ہی بار وہ اس سے ملنے آ چکی تھی۔ عزتِ نفس کی پروا کیے

بغیر وہ اس کے سامنے روئی بھی تھی، گڑگڑائی بھی تھی جب وہ اس کی جانب نہیں آیا تو جذباتی بلیک میلنگ بھی کرتی رہی تھی لیکن اب جو دل نہیں تھا تو کچھ نہیں تھا۔ وہ آئرہ کو گھر متعارف کروا چکا تھا اور آئرہ سے بات کر چکا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

انیہ نے اس کا دماغ اتنا زیادہ خراب کیا تھا کہ وہ کام پر ٹھیک سے توجہ بھی نہیں کر پاتا تھا اور جب وہ ذہنی طور پر حاضر ہوا تو آئرہ زندگی سے غائب ہو چکی تھی۔ وہ جس دن بابا جان سے ملنے گیا، گھر کے در و دیوار سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس ویرانی نے پہلے ہی اس کے نہ ہونے کی گواہی دی تھی لیکن ضروری تو نہیں ہر بار دل صحیح سمت میں ہی اشارہ کرے۔

”آئرہ چلی گئی۔“ بابا جان نے بتایا اور اس کا دل دھڑکنے کا ہنر بھول گیا تھا۔

”کہاں؟“

”معلوم نہیں لیکن وہ چلی گئی۔“

تو وہ جیسے آئی تھی بغیر کسی پیشگی اطلاع، دل پر حواس پر بلا اجازت قابض ہوئی تھی، بالکل اسی طرح چلی گئی۔ موسمِ بہار نے بھی تو آنے سے پہلے کب دستک نہیں دی تھی پھر بے وقت خزاں سے کیا گلہ۔ بس اتنا ہوا کہ جیسے زندگی کا مقصد کھو گیا تھا۔ ہر شے سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ نہ کوئی رابطہ نمبر نہ کوئی پتا وہ کیسے ڈھونڈ سکتا تھا اسے؟ زندگی کے سارے ذائقے ختم ہو گئے تھے۔ گھر میں اس کی بات ہوتی تھی۔ ماما کہتی تھیں۔

”ماما! پہلے ہی اتنی دیر کر دی ہم نے۔ آئرہ اتنی اچھی لگی ہے مجھے۔ بس اب بھائی کی شادی کر دیں۔“

ماما کہتی تھیں۔ ”کبھی لے کر آؤ اسے دوبارہ اور دیر کرنے کی وجہ کوئی نہیں تو شادی کیوں نہیں کر رہے؟“

وہ انہیں کیا جواب دیتا کہ دنیا کی بھیڑ بھاڑ میں اس نے اس لڑکی کو کھو دیا ہے، جو معلوم نہیں کب آنکھوں سے دل میں اتر گئی تھی۔

وہ تھی ہی ایسی کہ اسے پسند کیا جائے، سراہا جائے۔ ماما پوچھتی تھیں۔ وہ اسے کیوں نہیں لے کر آیا، اسے تو ناپسند کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ پورے دن میں کسی نہ کسی بار اس کا ذکر نکل ہی آتا تھا۔ بس وہ نہیں آئی تھی۔ دل میں ایک خوف سا تھا کہ کہیں وہ اپنے شوہر کے پاس واپس نہ چلی گئی ہو لیکن وہ تو اسے طلاق دے چکا تھا۔ ایک سہ پہر شام میں ماما شاپنگ کے لیے نکلی ہوئی تھیں۔ ان کی گاڑی خراب ہو گئی تھی اور انہوں نے فون کر کے اسے بلایا تھا۔ ایک موڑ کاٹتے ہوئے اسے لگا کہ وہ ہے۔ پاگلوں کی طرح گاڑی وہیں سڑک پر چھوڑ کر وہ باہر نکل آیا تھا اور اسی سمت بھاگا جہاں اسے اس کے ہونے کا گمان ہوا تھا۔ ٹریفک پولیس نے جو اس کے ساتھ سلوک کیا اور ماما جو اس کے لیے انتظار کر رہی تھیں۔ اسے اپنے حواس پر شک ہوا تھا کہ وہ کچھ بھی رکھتا ہے یا نہیں۔

☆☆☆

پھر ایک دن وہ خود واپس آ گئی۔ ٹھیک ہے اس کے لیے نہیں بلکہ ماموں جان کے لیے۔ ماموں کی طبیعت خراب تھی اور کسی محلے والے نے فون کر کے ایمبولینس منگوائی تھی۔ جب تک وہ پہنچا، وہ اسپتال پہنچ چکے تھے۔ وہیں اس نے اسے دیکھا تھا۔ آنسوؤں سے بھیگے ہونٹوں پر کوئی ورد تھا شاید۔

”انکل ٹھیک ہو جائیں گے ناں؟“ وہ اس سے پوچھ رہی تھی اور اس کے دل میں سکون اتر رہا تھا۔ وہ ایسے وہاں موجود تھی جیسے کبھی وہاں سے گئی ہی نہیں تھی۔

عمر کے جلتے صحرا میں کسی نخلستان کی طرح وہ اس کے سامنے موجود تھی اور تب وجاہت حسن کو معلوم ہوا کہ اس کے ملنے اور کھونے کے پیچھے زندگی کا کون سا سبق تھا۔ وہ جان ہی نہ پاتا کہ محبت میں مبتلا ہونا اصل میں ہوتا کیا ہے۔ اسے لگا کہ اس نے انیہ کو اس لیے انکار کیا کہ وہ آئرہ کو گھر ملوا چکا ہے اور اس کے ہاتھ میں امید کی کرن تھما چکا ہے

غلط...... بالکل غلط۔ اس نے اس لیے انیہ کو انکار کیا کہ اس کا دل آئرہ سے جڑ گیا تھا۔ اس پہ رعب جھاڑتی وہ لڑکی دل کی سرزمین پر پہلی بارش جیسی تھی۔ اب وہ لوٹ آئی تھی تو وہ جانتا تھا اب وہ اسے کہیں جانے نہیں دے گا۔

☆☆☆

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے لیے منتیں مانگی جاسکتی ہیں۔ ان کے لیے رات کے آخری پہر اٹھ کر مناجات کی جاسکتی ہیں اور آئرہ ان ہی لوگوں میں سے تھی۔ اس نے شادی کے لیے ہاں اس شرط پہ کی تھی کہ وہ انکل کے گھر سے کہیں نہیں جائے گی۔ وہ کہہ سکتا تھا اس کا گھرانہ روایت پسند تھا اور آئرہ اس گھر کی انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ بیٹھی تھی۔ وجاہت کو حیرت نہیں ہوئی جب اس نے ماما کو اس کی طلاق کا بتایا تھا اور انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

"بیٹا، کوئی فرق نہیں پڑتا طلاق سے۔ ہم انسان ہیں.. ماں باپ سے بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ اب کوئی ماں باپ اپنی اولاد کا برا تو نہیں سوچیں گے۔ ہو گیا جو ہو گیا۔ اب بس آگے کی سوچو۔"

اور اب ماما نے اس کی اس خواہش پر بہت خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"شکر ہے، آج کل بھی کسی کو بیٹوں کا خیال ہے ورنہ تو نفسا نفسی کا دور ہے، اپنی سگی اولاد نہیں پوچھتی۔"

بھائی کی تنہائی کے احساس سے انہوں نے کتنی بار انہیں اپنے گھر لانے کی کوشش کی تھی لیکن اقبال صاحب کہاں کسی کے قابو آتے۔ پاپا کو پتا چلا تو وہ بھی ہنسے تھے۔

"جدید دور ہوتا جا رہا ہے۔ شعور پھیلنا ہی چاہیے۔ پہلے لڑکیاں بیاہ کر آتی تھیں، کوئی بات نہیں اگر لڑکے بھی بیاہ کر کہیں چلے جائیں۔"

تو وہ اب ماموں ان ہی کے گھر میں رہ رہا تھا۔ ہر تھوڑے دن بعد وہ آئرہ کو لے کر گھر چلا جاتا یا ادھر سے کوئی آجاتا۔ ماما بڑی خوشی خوشی ان کے پاس رہنے آئی تھیں۔ خود وجاہت اسے دیکھتا تو شکر ادا کرتا تھا۔ زندگی تو یوں بھی کہیں نہ کہیں گزر جاتی لیکن اس کے گرد زندگی کا احساس بڑا گہرا ہوتا تھا۔ وہ عادت سے مجبور تیز لہجے میں بولتی تو اسے بھی پیار آتا تھا۔ وہ بے وجہ رونے لگتی تو وجاہت تب بھی طعنہ دیے بغیر اسے سمیٹ لیتا تھا۔

اقبال صاحب کے لیے جانے وہ کہاں سے طالب علم اکٹھے کر کے لائی تھی۔ "انسان مصروف رہتا ہے تو وہ بیمار نہیں ہوتا۔" اس کی اپنی منطق تھی اور وجاہت کو اس کی بے تکی باتیں بھی پسند تھیں یہ تو پھر کہیں نہ کہیں درست معلوم ہوتی تھی۔

رمضان شروع ہونے والا تھا اور پہلی بار ماموں نے کسی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

"میں کہہ رہا تھا جیسے ہم پہلے ہر رمضان کی پہلی افطاری اپنے گھر کرواتے تھے اب بھی ایسے ہی کروائیں۔"

اور ان کے منہ سے نکلی خواہش تو حکم کا درجہ رکھتی تھی آئرہ کے لیے۔ وجاہت کے کتنے چکر لگوائے تھے اس نے بازار کے۔ ہر بار وہ کچھ نہ کچھ اہم بھول جاتی اور کبھی رعب کے ساتھ، کبھی معذرت خواہانہ لہجے میں اس کے سر پہ آ کھڑی ہوتی۔

"میں دعا کرتا ہوں ایک بار پھر تم کچھ بھول جاؤ۔"

وہ جھینپ جاتی اور چپکے چپکے اس شخص کی بلائیں لیتی جسے اپنی بے وقوفی سے اس نے کھونے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔

اسپتال سے واپسی پر جب وہ انکل کے ساتھ ہی آ گئی تھی تو وجاہت نے اس سے نہیں پوچھا تھا وہ کہاں گئی تھی۔ اس نے پوچھا "تم کیوں چلی گئی تھیں؟ جانتی ہو، میرا کیا حال ہوا تھا؟"

اور اس کیوں کا جواب وہ دینا نہیں چاہتی تھی اور دینا چاہتی بھی تھی کہ وہ شخص اپنی صفائی میں کچھ

... کو کون ملے کہ اب کی بار اس نے انسان ... غلطی نہیں کی تھی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اب ... میں ... اجڑا تھا۔ تو اس نے بتا دیا۔

"آزادی کی بات تم روپوش ہونے سے پہلے بھی ... کی تھیں۔"

"تو تم مجھے سچ بتا دیتے؟"

"تمہیں یقین ہے، اب جو بتاؤں گا، وہ سچ ہو ... اس کا سر اثبات میں ہلا تھا۔

"میں اس وقت بھی تمہیں سچ بتا سکتا تھا۔"

اور جو سچ اس نے بتایا تھا اگر وہ جھوٹ بھی ہوتا ... آئرہ کی مان لیتی۔ لیکن یہ جو دل ہوتا ہے ناں.. یہ ... کرواتا ہے اور اس نے تبھی وجاہت حسن کا یقین کر لیا تھا۔

"میں لڑکیوں کی کامیابی سے ڈرتا نہیں ہوں ... اس کے خلاف ہوں لیکن پتا ہے کیا.. میں پرانی ذہنیت کا آدمی ہوں۔ مجھے اچھا لگتا ہے اگر تم میری ... جاتی ہو۔ اپنے کاموں کے لیے میرا منہ دیکھتی ہو۔ مجھے مردمار قسم کی "میں سب کر سکتی ہوں" قسم کی لڑکیاں نہیں پسند۔

انیہ کے سامنے مجھے اپنا آپ بہت بونا لگتا ... مجھے اہمیت ہی نہیں دیتی تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے مجھے دنیا کی سمجھ نہیں ہے اور وہ اپنے معاملات اور دنیا کو مجھ سے بہتر سمجھتی ہے اور مجھے یہ لگتا تھا ایک دن اسے خود احساس ہو جائے گا کہ اس کی یہ دوڑ لاحاصل ہے۔

وہ میرے گھر والوں سے نہیں ملنا چاہتی تھی کہتی تھی جب وقت آئے گا تب دیکھیں گے۔ میں اگر چھوٹی ذہنیت کا ہوتا تو اسے جانے ہی نہ دیتا۔

میں اس سے شادی کر بھی لیتا تو میں جانتا ہوں، اس کی حاکم طبیعت کے ساتھ میرا گزارا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ میں نے تمہاری حاکمیت دیکھ لی تھی ہاں، تم تو دل پہ حکومت کرتی ہو۔"

اس کے دل نشین لہجے میں کہی گئی ہر بات پر یقین کے علاوہ کچھ کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ آنے والے وقت نے ثابت کرنا تھا کہ اس نے یہ یقین کر کے غلط نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

"میں ٹھیک لگ رہی ہوں؟" اس نے کوئی تیسری بار پوچھا تھا اور تیسری بار بھی ایک "ہوں" جواب میں ملا تھا۔

ماما اور پاپا نے افطار پارٹی رکھی تھی اور وہ وہیں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ انکل کے لیے اس نے کھانا بنا دیا تھا کہ انہوں نے جانے سے منع کر دیا تھا۔ شادی کے بعد اس گھر میں یہ پہلی گیدرنگ تھی جس میں اس نے سب سے ملنا تھا سو وہ اوور کانشس ہو رہی تھی اور وجاہت اتنا ہی ہر شے کو ہلکے پھلکے انداز میں لے رہا تھا۔ غصے میں آئینے کے سامنے سے ہٹ کر وہ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"ایک بار بھی نہیں دیکھا اور ہوں ہوں کیے جا رہے ہو۔"

"تو میں تو بغیر دیکھے بھی کہہ رہا ہوں، تم اتنی پیاری ہو، کینسل کرتے ہیں جانا۔ پھر جو تم مجھے اتنا سجا سنورا دیکھ لوں گا تو پھر تمہیں ہی مشکل ہوگی۔"

آئرہ کا چہرہ سرخ ہوا تھا اس کی بات پر۔

"بندے کو روزے کا لحاظ ہونا چاہیے۔"

"روزہ نہ ہو گیا پانی کا بلبلہ ہو گیا جو اپنی بیوی سے اظہار محبت کرنے پر پھوٹ جائے گا۔"

ماما کی کال آنے لگی تو وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو میں گاڑی نکالتا ہوں، تم آجاؤ۔"

انکل نے نکلتے ہوئے نصیحت کی تھی۔ "خالی ہاتھ مت چلے جانا، جاتے ہوئے کچھ لے جانا۔"

ان کی اس نصیحت پر عمل پیرا ہوتے وہ گھر جانے سے پہلے اسے شاپنگ مال لے آیا تھا۔ برینڈڈ کپڑوں کے آؤٹ لیٹس ایک کے بعد ایک کنگھالتے آخر کار اسے اپنی پسند کا سوٹ مل ہی گیا۔ کاؤنٹر پہ کھڑی لڑکی کو ڈریس پیک کرنے کا کہہ کر وہ پے منٹ کے لیے وجاہت کو بلانے باہر آئی تو

وہ اسے دیکھ کر فوراً ہی آ گیا۔
"ہاں لے لیا؟ نکلیں؟"
"بے منٹ کے بغیر کیا ملے گا؟"
آئرہ کی بری عادت یہ تھی کہ ہینڈ بیگ یا پاؤچ جو بھی پکڑتی، چلتے چلتے غیر محسوس طریقے سے وجاہت کے ہاتھ میں منتقل کر دیتی تھی۔ اس دن ایک دوست نے دیکھ لیا تو اتنا مذاق بنایا تھا۔ اب اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ بیگ وغیرہ لے کر ہی نہ نکلے۔ ویسے بھی کہیں کچھ لینے کے بعد وہ اتنی معصومیت سے اسے پکارتی تھی تو پھر اسے بیگز یا پیسوں کی ضرورت بھی کیا تھی۔

"آئی ایم سوری۔" وہ اس کے ساتھ ہی اندر آیا تھا۔ آئرہ کی بتائی اماؤنٹ والٹ سے نکال کر اس نے کاؤنٹر پہ رکھی۔

"میں اپنے لیے بھی لے لوں ایک؟" ادھر ادھر دیکھتے آئرہ کو کچھ اور پسند آ گیا تھا۔

"لے لیں میم.. میری اتنی جرات کہ منع کر سکوں۔" وہ ہنسا اور تب آئرہ نے محسوس کیا کاؤنٹر پہ کھڑی لڑکی کے وجود سے جیسے خون کی آخری بوند بھی نچوڑ لی گئی ہے۔ اس کا رنگ پیلا زرد ہو رہا تھا۔ ادھر ادھر کسی سیلز مین یا سیلز گرل کو دیکھتے وہ اس کے قریب آئی۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" آئرہ کی بات پر وجاہت نے بھی اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

وسیم عباسی نام نہیں، ایک شخص نہیں ایک پورا سسٹم تھا جس سے اس نے ٹکرانے کی جسارت کی تھی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی قابلیت کے مطابق کوئی اچھی کمپنی اسے رکھنے کو تیار نہیں تھی۔ حلیف تو حلیف حریفوں نے بھی جھنڈی دکھا دی تھی۔ یہ ٹھیک تھا وہ حسب کی وجہ سے کسی ناقابلِ تلافی نقصان سے بچی رہی تھی لیکن اس کا جو نقصان ہوا تھا اس کی بھرپائی نہیں ہو سکتی تھی۔ آسمانوں کی جانب محوِ پرواز وہ لڑکی منہ کے بل نیچے گری تھی۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ کسی نجی یا سرکاری کالج میں اس کی جاب ہو جائے لیکن تب تک ضروریات کو روکا نہیں جا سکتا تھا سو وہ یہاں تھی۔

سامنے وہ شخص کھڑا تھا، جو کبھی اتنا امیر ہوا کرتا تھا کہ اگر وہ اس وقت سمیٹ لیتی تو عمر بھر کے لیے کنگال ہو جاتا اور اب اس کی نگاہ، اس لڑکی سے بھیک مانگ رہی تھی جس کی عادت میں بچپنے کی شوخی واضح جھلک رہی تھی۔ اس کی جگہ انیہ ہو سکتی تھی کیا یہ ظلم تھا کہ وجاہت کی جس وارفتگی کو وہ ناپسند کرتی رہی تھی اب اس کے سامنے کسی اور کے لیے تھی اور وہ بچے پاتال میں گرتی جا رہی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں میم! شکریہ۔" وہ بدقت بولی تھی اور وجاہت وہاں سے شاپنگ بیگ اٹھا کر باہر نکل گیا تھا۔ کاؤنٹر پہ کھڑی لڑکی کی آنکھ سے آنسو اور ایک سسکی میں وجاہت کا نام نکلا تھا۔

گہری نظر سے اسے دیکھتی کچھ اور دیکھنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے آئرہ بھی وجاہت کے پیچھے ہی نکل آئی تھی۔ اس دن نہ اس نے کچھ کہا اور نہ وجاہت نے بتایا۔

چاند رات کو اسے ماما کے ساتھ بازار نکلنا تھا۔ پاپا آتے ہوئے ان کے لیے کتنے تحفے لے کر آئی تھی۔ آئرہ جانتی تھی یہ محض تحفے نہیں ہیں۔ یہ محبت ہے۔ وہ محبت جو وہ ان سب سے کرتی تھی اور خوش قسمتی سے ان لوگوں کو محبتیں لوٹانا آتی تھیں۔

ہاتھوں پہ مہندی لگوانے کے بعد جو وہ نکلے تو وجاہت نے بڑے طریقے سے اس کا دوپٹہ سنبھال سمیٹ کر اسے گاڑی تک پہنچایا اور پھر وہیں انہیں آئس کریم بھی اپنے ہاتھوں سے کھلائی تھی۔ آئرہ بے انتہا خوش تھی اور اس خوشی میں اسے روتی ہوئی وہ لڑکی جانے کہاں سے یاد آ گئی تھی۔

"کیا ہوا؟"

"اس دن وہ جو لڑکی.." بات درمیان میں چھوڑ کر آئرہ چپ ہو گئی تھی۔

وجاہت نے ادھوری بات سے جان لیا تھا کہ وہ کس لڑکی کی بات کر رہی ہے۔

"ڈری تھی۔" اس نے دھیمے سے کہا تھا، اکیلے پن کا خوف تو اسے بھی تھا۔ شکر ادا کرنا بنتا تھا کہ مالک نے اسے اس آزمائش میں مبتلا نہیں کیا تھا اور ساتھ ہی اسے اس لڑکی پر ترس بھی آیا تھا۔ آئرہ جیسے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی۔ اسے اپنے پیاروں کے ساتھ ہونے کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ آئرہ سوچ رہی تھی کہ بعض اوقات، مضبوط نظر آنے اور بنے رہنے میں انسان کیسے سب کچھ کھو دیتا ہے۔ عورت کو تو مرد کے نام اور سہارے کی ضرورت ہوتی ہی ہے، بالکل اسی طرح جیسے مرد کو عورت کی ضرورت ہوتی ہے۔ انکل کی اتنی عمر ہو گئی تھی لیکن ان کے گھر میں عورت کا وجود اتنا ہی ضروری تھا جتنا کہ اس کی زندگی میں مرد کا وجود۔ اس نے شکر ادا کیا تھا کہ ایک بار غلط قدم اٹھانے کے باوجود اللہ کی ذات نے، اسے دوسری بار صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور یہ صرف وجاہت کی وجہ سے نہیں تھا۔ اسے ایک مثالی گھرانہ نصیب ہوا تھا۔ وہ جتنی محبتیں کرتی تھی، وہی محبتیں ضرب دے کر اب ان سے اسے لوٹتی جاتی تھیں۔

"چلیں اب گھر۔" ماما کی آواز پر وہ خیالوں سے چونکی تھی۔ کل عید کی تیاری ماما نے اس پر چھوڑ دی ہوئی تھی۔ اسے اب ان کی طرف جانا تھا کیونکہ صبح صبح اتنی جلدی میں نکلنا ممکن نہیں ہوتا تھا تو رات وہ وہیں رک رہی تھی۔

"تم ماما کو منع بھی تو کر سکتی تھیں۔" وجاہت کا موڈ اس سوچ کے ساتھ خراب ہوا تھا کہ رات اسے اکیلے ہی بابا جان کے پاس رکنے کے لیے آنا پڑے گا۔

"اگر بابا جان کو منا لیں تو صبح کے بجائے ابھی انہیں لے کر آ جائیں گھر۔ ایک کمرہ ان کے لیے ہو گا ہی۔"

گاڑی سے نکلتے اس نے پاپا کی نظر بچا کر سرگوشی کی تھی۔ یہ تو ایک چاند رات تھی۔ آنے والے سالوں میں کتنی ہی چاند راتیں محبتیں اور خوشیاں اپنے دامن میں سمیٹے ان کی منتظر تھیں اور وہ بے صبر نہیں تھا۔

☆☆

نمرہ احمد

"وہ اس کی تھیراپسٹ ہے بابا!"
عبدالمالک فرید نے ایک گہری سانس لبوں سے خارج کی۔ ایک دم کندھوں پہ بہت سے بوجھ آن گرے تھے۔

"وہ... اس کی... تھراپسٹ ہے۔" ایک ایک لفظ توڑ توڑ کے ادا کیا۔

"یاسمین؟"

"اور میں کیا کیا سمجھنے لگی تھی۔ مگر نہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ "میں یہاں سے نہیں جاؤں گی بابا، میں ماہر پہ گیواپ (ہار ماننا) نہیں کروں گی۔"

"باوجود اس کے کہ تم اس کی زندگی میں کہیں نہیں ہو؟" عبدالمالک فرید کے تاثرات پل بھر میں واپس برف بن گئے۔ ان کا سوال کسی بھی جذبے سے عاری تھا۔

"یہ میری زندگی ہے اور یہ میرا فیصلہ ہے۔ میں یہیں رہوں گی۔ ماہر کے لیے، کیف کے لیے۔ میں اس کو چھوڑ کے نہیں جاؤں گی۔ وہ میرا سب سے اچھا دوست ہے۔" کہتے کہتے وہ رکی۔ ایک دم آنکھوں میں خوف سا ابھرا۔ وہ تیزی سے آگے ہوئی۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" وہ پریشان نظروں سے ان کا چہرہ ٹٹولنے لگی۔ "آپ ماہر کے پاس جا کے اس کو کہنا چاہتے ہیں کہ وہ مجھے یہاں سے جانے کے لیے مجبور..."

"تمہیں کوئی کچھ کرنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتا زمر! کیونکہ تمہیں کسی نے اس گڑھے میں نہیں ڈالا۔ تم خود اس میں کودی ہو۔ تمہیں اس سے تمہارے سوا کوئی نہیں نکال سکتا۔ خود میں بھی نہیں۔ جو دل چاہے کرو۔"

ہلکے سے کندھے اچکا دیے۔ وہ وہاں سے پلٹے تو چہرہ اسی طرح سرد تھا۔ البتہ چال دھیمی تھی۔

"ہم آج رات واپس جا رہے ہیں۔ زمر ابھی جائے گی۔" سامنے سے آتے اسسٹنٹ کو دھیمی آواز میں اطلاع دی۔ اس کے ہونٹ اوہ میں سکڑے۔

"آپ نے آج چار بجے کی میٹنگ کے لیے یہ فائل مانگی تھی۔" ان باپ بیٹی کے مسئلے پہ تبصرہ کیے بغیر اسسٹنٹ نے ایک فلیش ڈرائیو مالک کی طرف بڑھائی۔ "وہ میٹنگ کنفرمڈ ہے نا سر؟"

"یہ تو چار بجے ہی معلوم ہوگا۔" انہوں نے فلیش ڈرائیو کو اوپر اٹھا کے دیکھا۔ بنا عینک کے بھی وہ اس پہ لکھا "سبرینہ" پڑھ سکتے تھے۔

☆☆☆

"آئی ایم سوری، کشمالہ۔"
وہ دونوں ایک کیفے کے چھجے تلے، پچھی کرسیوں پہ آمنے سامنے بیٹھے تھے اور ویٹر ان کے سامنے قہوے (کافی) کے کپ رکھ رہا تھا، جب زیاد کھنکھارا۔ بالا نے نگاہ اٹھائی۔ اس نے سفید ہائی نیک پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پہ گلاسز تھے اور ملال بھی۔

اس کے خواب کے برعکس استنبول کی اس گلی میں بنے کیفے بارونق اور رنگین تھے۔ ترکش قہوے اور خستہ سمت (simit) کی خوشبو۔ دکانوں کے چھجوں سے لٹکتے رنگین پھول۔ صبح کی بارش کے بعد کی گیلی سڑک۔ آج طلوع ہونے والی صبح میں امید بھی تھی اور ابہام بھی۔

"کس کس بات کے لیے سوری، زیاد؟" اس کی سبز آنکھوں میں خفگی اتر آئی۔ وہ سیاہ ڈھیلا ڈھالا سا کارڈیگن پہنے ہوئے تھی، جس کے گریبان پہ پیا

مکمل ناول

سترھویں قسط

وندہ کے نگینے دمک رہے تھے۔ بال اونچے کر کے بزرو رال میں باندھ رکھے تھے۔ چہرے پہ خفگی بھی تھی اور ایک اطمینان بھی، وہ اس کے لیے آ گیا تھا۔

"تمہارے لیے تمہارے بھائی کی شادی کو ہینڈل کرنا میں نے اتنا پیچیدہ بنا دیا۔ مجھے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔" ان دونوں کے درمیان بھاپ اڑاتی کافی کے کپ تھے جو بار بار ان کا منظر دھندلا دیتے۔

"اسی لیے میں یہاں آیا ہوں۔ کیونکہ میں تمہیں مزید ناراض نہیں کر سکتا۔"

"زیاد آ گیا اتنی جلدی؟" اس کی آنکھوں میں اکلا جذبہ شکایت کا ابھرا۔ زیاد سلطان نے تھوڑی جھکا دی۔

"میرے پاس یو کے کا ویزا ہے۔ اسی ویزا اپلائی کرنا مشکل نہیں تھا۔ لیکن میں اس شادی پہ نہیں آنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے یہ بات چھپالی۔"

"آپ اس شادی پہ کیوں نہیں آنا چاہتے تھے؟" وہ بھاپ کے پار نظر آتا زیاد سلطان کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کیونکہ میں ایک اینٹی سوشل انسان ہوں۔" اس نے بے بسی سے بالا کو دیکھا۔ "ایک انٹروورٹ۔ مجھے لوگوں سے گھلنا ملنا پسند نہیں ہے۔ یہ میری

ذات کی کمزوری ہے، اسی لیے جب میں نے تم سے
شادی کی تو میں مطمئن تھا کیونکہ تم بہت سوشل ہو۔ تم
میری اس کمزوری کو دور کرنے میں مدد کرو گی۔ میں
ہمیشہ یہی کرتا ہوں۔ امی مجھے شادیوں پہ جانے کے
لیے مجبور کرتی ہیں اور میں نہیں جاتا۔"

"آپ عزہ کی شادی پر بھی آئے تھے۔ ماں کی
بیماری تشخیص ہونے سے چند دن پہلے جب میں لاہور
آئی تھی۔" وہ یاد کر رہی تھی۔ "اور اس سے ڈیڑھ سال
پہلے آپ سہیل کی شادی پہ بھی آئے تھے۔"
اور یہ وہ ملاقات تھی جو اسے یاد نہیں تھی۔ جیسے
وہ یادداشت سے محو ہو گئی ہو۔

"ہاں۔ گزشتہ تین سال میں ہمارے خاندان
میں آٹھ دس شادیاں ہوئی ہیں اور میں نے صرف دو
اٹینڈ کی ہیں۔ کہا نا۔ میں اس چیز میں اچھا نہیں
ہوں۔ مگر میں اس عادت کو بدلنا چاہتا ہوں۔"

"آپ کو یہ تب سوچنا چاہیے تھا جب میں دو
ہفتے تک آپ کی منت کرتی رہی تھی۔" وہ دکھی انداز
میں یاد دلا رہی تھی۔

"میں خوف زدہ تھا۔" زیاد نے پھر سے چہرہ
جھکا دیا۔

"کس سے؟"

زیاد نے نگاہ اٹھا کے اسے دیکھا تو آنکھوں
میں شرمندگی تھی۔

"کہ کہ یہاں سب مجھ سے پوچھیں گے کہ
میری جاب کیسی جا رہی ہے اور مجھے جھوٹ بولنا
پڑے گا۔"

"جاب؟"

اس کا سانس تک رک گیا۔

"میں نے تمہیں ایک بات نہیں بتائی۔" اس
نے تھوک نگلا۔ جیسے یہ بتانا اس کے لیے کسی بوجھ
سے کم نہ تھا۔ "میری جاب چلی گئی ہے۔"

وہ ساکت بیٹھی اسے دیکھے گئی۔ جیسے معلوم نہ
ہو کہ کیا کہنا چاہیے۔

"دراصل میں نے خود ہی نوکری چھوڑ دی
تھی۔ مجھے مکہ کی ایک کمپنی کی طرف سے بہتر جاب
کے لیے گرین سگنل مل گیا تھا۔ وہ میرے دوست کی
کمپنی تھی۔ میں نے ایک غلط فیصلہ کیا اور لالچ میں
اپنی پرانی جاب چھوڑ دی۔ میں تمہارے لونگ
اسٹینڈرڈ (معیار زندگی) کو میچ کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ
میں تمہیں اصلی ہیرے گفٹ کر سکوں۔"

"مگر آپ نے کہا تھا کہ آپ کو کمپنی نے
ٹرانسفر..."

"جھوٹ بولا تھا تاکہ تم مجھ پہ غصہ نہ کرو۔ سوچا
جب اچھی جاب مل جائے گی تو سرپرائز دوں گا لیکن
مکہ آ کے..." اس نے افسوس سے سر جھٹکا۔ "میرا
اس دوست کے ساتھ معاملہ خراب ہو گیا۔ میرے
غصے کی وجہ سے۔" اس نے بہت تکلیف سے ماتھے کو
چھوا جیسے خود پر غصہ آ رہا ہو۔ "اس نے میری بنی بنائی
بات خراب کر دی اور میں تب سے بہت اسٹریس میں
تھا۔ اسی لیے میں تم سے بھی کھنچا کھنچا رہنے لگا اور
ٹریول بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ میں ٹریول پسند
کرتا ہوں۔ مجھے خود شوق ہے۔"

وہ الجھن سے اسے دیکھے گئی۔ کیا وہ کہانی بنا رہا
تھا؟ یا وہ جانتا تھا وہ اس کا پاسپورٹ دیکھ چکی
تھی؟ لیکن پاسپورٹ اس نے خود ایسی جگہ رکھا تھا
جہاں سے وہ دیکھ سکے۔ چھپانا ہوتا تو چھپا لیتا۔ وہ ان
تمام باتوں کا اعتراف کر رہا تھا جو ان دونوں کے
درمیان حائل ہو گئی تھیں۔

"زیاد میں نے آپ سے کتنی دفعہ کہا تھا کہ مجھ
سے سچ اور صاف بات کیا کریں۔ مجھے نہیں
چاہئیں لگژریز۔ میں اپنی لگژریز کما سکتی ہوں۔ مجھے
صرف سچا رشتہ چاہیے۔ آتھینٹک تعلق۔ اگر جاب کا
پرابلم تھا تو مجھ سے شیئر کرتے۔ میں آپ کا دکھ
بانٹتی۔ میاں بیوی اور کس لیے ہوتے ہیں؟ لیکن
آپ مجھ سے جھوٹ بولتے رہے۔ ہر صبح آپ یہ کہہ
کر گھر سے نکلتے تھے کہ میں کام پہ جا رہا ہوں۔"

"وہ جھوٹ نہیں تھا۔ کیونکہ میں مختلف کیفے جا
کے اپنی کتاب لکھتا تھا۔ میں بہت پریشر میں تھا۔ کہا نا۔

ہر ایک ذات کے مسئلے ہیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں
تم نے بہت بے بسی سے کہہ رہا تھا۔ "ہر شادی
شدہ جوڑے کے مسئلے ہوتے ہیں لیکن ہمیں ان کو حل کرنا ہوتا
تھا ایک دوسرے کو چھوڑ کے نہیں چلے جانا ہوتا۔ مجھے
جب ایسا احساس ہوا تو فوراً یہاں آ گیا۔"
"لیکن جمال نہیں تھا جو اگر اس سے جھوٹ
بولتا تو وہ اس سے منہ موڑ لیتی یا اس کو زندگی سے نکال
دیتی۔ وہ اس کا شوہر تھا۔ وہ اس کو منانے استنبول کے
پیچھے آیا تھا۔ کتنے ہی دن سے اس کے ایک سچ
کی انتظار میں تھی۔
اس کے کندھے ڈھیلے پڑنے لگے۔ پیشانی کی
شکنیں مٹنے لگیں۔

"ہمارے درمیان اتنے فاصلے کیسے آ گئے ہیں
زیاد؟" کپ اٹھائے پتھروں سے بنی سڑک پہ چلتے
لوگوں کو دیکھتے ہوئے وہ ملال سے بولی۔ ایسی
شادی اس نے تصور نہیں کی تھی۔
اسی پل کچھ عجیب سا ہوا۔ اچانک جیسے اوپر
سے بارش ہوئی۔ وہ دونوں چونکے۔
نہ جانے کہاں سے چند قطرے زیاد کے سفید
سویٹر پہ آن گرے۔ وہ پانی کے قطرے نہیں تھے۔
وہ خون کے تھے۔
مالا نے بے اختیار گردن اٹھائی۔ اوپر کچھ بھی
نہ تھا سوائے آسمان یا چندی گمر کے جو یونہی استنبول کی
گلیوں کا چکر لگا کے سمندر تک چلے جاتے تھے۔
"شاید... یہ ہے ہمارے درمیان فاصلوں کی
وجہ۔" زیاد نے ٹشو اٹھایا اور دھیرے دھیرے وہ
قطرے صاف کرنے لگا۔ وہ جیسے شل سی بیٹھی تھی۔
"کبیرہ تائی؟" ذہن کے پس منظر میں ایک
نام ابھرا۔

"وہی ہو سکتی ہیں۔ امی نے مجھے ان کے
بارے میں وارن کیا تھا۔ امی بہت نیک خاتون
ہیں۔ ان کو سچے خواب آتے ہیں۔ انہوں نے خواب
میں دیکھا تھا۔ کبیرہ تائی ہماری شادی کی سب
سے بڑی مخالف تھیں۔ وہ جادو میں بھی مشہور
ہیں۔ اور جادو کے بارے میں میں زیادہ نہیں جانتا
سوائے اس کے کہ سب سے خطرناک جادو..."

"میاں بیوی کو جدا کرنے والا جادو ہوتا ہے..."
کسی میکانکی عمل کے تحت اس نے زیاد کا فقرہ مکمل
کیا۔ "خود سوچو کشمالہ! ہم نے پسند کی شادی کی
تھی۔ پھر ایسا کیا ہوا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے
اتنے ناراض رہنے لگے؟ میں تم سے باتیں چھپانے لگا اور
تم مجھے چھوڑ کے یہاں آ گئیں؟" وہ اب ٹشو بھگو کے اپنا
سویٹر صاف کر رہا تھا۔ سرخ دھبے مزید پھیل گئے تھے۔
وہ پلک تک نہیں جھپک گی۔ چہرہ سفید پڑنے لگا۔
"جادو؟" اسے اپنی آواز کسی کھائی سے آتی
سنائی دی۔ وہ سمجھی تھی یہ چیزیں اس کا پیچھا چھوڑ چکی
ہیں۔ لیکن میوزک باکس کی آواز، ماں کا خواب، وہ
سب ویسا ہی تھا۔

"ہو سکتا ہے ہمیں ایک دوسرے سے دور
کرنے میں اس جادو کا ہاتھ ہو۔"
"یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔" اس کا دماغ
ایک دم بہت سے حصوں میں بٹ گیا۔
کافی ٹھنڈی ہو رہی تھی لیکن اسے پروا نہ تھی۔
جدہ میں گزرے وہ آخری تکلیف دہ دن...
کو ورکنگ اسپیس کے باتھ روم میں بیٹھ کے رونا...
اکیلے پیکنگ کرنا اور زیاد کا کمرے میں نہ آنا... وہ
تمام شکوک جو زیاد کے لیے اس کے دل میں در آئے
تھے... زیاد کا خراب موڈ، گھر کا تلخ ہوتا ماحول... کیا
معلوم وہ سب جادو ہو؟
ورنہ زیاد تو ایسا نہ تھا۔ وہ تو خود جاب کے لیے
پریشان تھا۔ وہ اس سے جان بوجھ کے کچھ نہیں چھپا
رہا تھا۔ وہ صرف اس کو ایک بہتر طرز زندگی فراہم کرنا
چاہتا تھا۔ اس نے کیسے اتنی سی بات کو اپنے اور اس
کے درمیان آنے دیا؟ بہت سے مردوں کی جاب
چلی جاتی ہے۔ وہ شرمندگی سے گھر میں نہیں بتاتے
۔ بہت سے مرد بیویوں کے خاندان کی شادیاں اٹینڈ
نہیں کرنا چاہتے۔ یہ روٹین میں ہوتا تھا۔ اس نے
اس بات کو اتنا کیسے بڑھا دیا کہ وہ اپنی زندگی زیاد

سے الگ کرنے کا سوچنے لگی تھی؟ اس نے ایسا سوچ بھی کیسے لیا۔

"آئی ایم سوری' زیاد۔" اس نے خود کو کہتے سنا۔ "شاید میرے اوپر بھی جادو اثر کر رہا تھا۔ وہ چھوٹی باتوں کو کسی عدسے سے بڑا بنا کے دکھا رہا تھا۔" وہ ابھی تک بے یقین سی تھی۔

"جو ہوا سو ہوا۔ اب ہم مزید ان چیزوں کو اپنے درمیان نہیں آنے دیں گے۔" اس نے دھیرے سے اس کا ہاتھ تھاما اور بہت وثوق سے اس کو یقین دلایا۔ مالا نے گم صم سے انداز میں سر ہلایا۔

"لیکن آپ مجھ سے ہمیشہ سچ بولیں گے۔" ایک واہمہ سا ابھی تک اندر سر اٹھا رہا تھا۔ لیکن اس نے اسے دبا دیا۔

"ہمیشہ۔" وہ مسکرایا۔ بہت دیر بعد وہ بھی بالآخر مسکرا دی۔

دونوں نے اپنی اپنی کافی اٹھائی۔ گھونٹ بھرتے ہوئے مالا نے ایک نظر گھڑی کو دیکھا۔

"آج ماہی اور حور آ رہے ہیں۔ میں حور سے ملنے کے لیے بہت ایکسائٹڈ ہوں۔" بہت سا بوجھ کندھوں سے اتر چکا تھا۔ وہ ایک دم خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ یہ سب جادو ہی تھا۔ وہ ایسے ہی اتنی پریشان رہی۔

"حور؟ اچھا ماہی کی بیٹی۔"

"ہاں۔ وہ مجھے بہت پیاری ہے۔" پھر ایک گلٹ سا دل میں سر اٹھانے لگا۔ "آپ کو بچے پسند ہیں' زیاد؟"

"سب کو ہوتے ہیں۔" وہ مسکرایا۔

"آپ میرے اور اپنے لیے کیا سوچتے ہیں؟ یعنی۔ ہمارے بچے....."

"مجھے بچے نہیں چاہئیں۔" وہ ایک دم اتنی تیزی سے بولا کہ وہ جہاں تھی' وہیں رہ گئی۔

"جی؟"

"مطلب ابھی نہیں چاہئیں۔" زیاد سلطان سنبھل گیا۔ "کچھ سال ہمیں اپنے رشتے کو دینے چاہئیں۔ بچے پیدا کرنے کے لیے ایک عمر پڑی ہے۔" اس کے کندھوں سے گرا بوجھ ایک دم پھر دھیرے دھیرے واپس آنے لگا۔ مالا نے سر ہلایا اور کافی کا ایک اور گھونٹ بھرا۔ پھر مسکرایا۔

"انہوں نے میرے منع کرنے کے باوجود کافی میں اتنی چینی ڈال دی ہے۔ میں بھی کب سے پیے جا رہی ہوں۔ مجھے شوگر سے دانے نکلتے ہیں۔"

"آج پی لو۔ کچھ نہیں ہوتا۔" وہ مسکرا کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ وہ پہلے ویٹر کو آواز دینے لگی پھر رک گئی۔ اس کا دماغ کہیں اور الجھ گیا تھا۔

زیاد نے نامحسوس انداز میں ایک کاغذ کے ٹکڑے کو گول مول کر کے جیب میں ڈالا۔ اس کی جیب پر لگے چند شوگر کے بیز تھے جو ایسے ہی کاغذوں میں لپٹے تھے (تمہارے سامان کے ساتھ میں نے چند ہربل کیوبز بھیجے تھے' بیٹے۔ جانتی تھی ایسا وقت آئے گا جب میرا کیا ہوا دم کمزور پڑنے لگے گا اور تمہیں ان کیوبز کی ضرورت ہوگی۔ تمہیں اپنی ماں کی ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ استنبول جاتے ہوئے ان کو ساتھ لے جانا۔ تمہاری بیوی پھر کبھی تم پر شک نہیں کرے گی۔)

وہ مسکرا کے خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا جو ابھی بھی کافی پی رہی تھی۔ پھر رک کے جیسے یاد آیا۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں کس ہوٹل میں ہوں؟"

"صبح لینڈ کرتے ہی میں نے معید کو کال کی تھی۔ اس نے سرپرائز رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔"

"او معید....." اس نے ماتھے کو چھوا۔ "مجھے ویڈنگ کیک کے لیے بیکری جانا تھا۔ آپ آئیں گے۔"

"نہیں۔ میں تھکا ہوا ہوں۔ ویسے بھی کپڑے بدلنے پڑیں گے۔" اس نے ایک افسوس بھری نظر سفید سویٹر پہ پڑے داغوں پہ ڈالی۔ "میں دوپہر تک سوؤں گا۔ تم اکیلی چلی جاؤ گی نا؟" وہ بہت اطمینان سے پوچھ رہا تھا۔

اس نے سر ہلا دیا۔ دماغ کہیں اور پھنس چکا تھا۔

☆☆☆

"...ان کا دماغ کہاں پھنسا تھا؟" ... بیٹھی زعتر سے بھری ... ہوئی ... پہ ... اب ... کرتے ہوئے اس کو دیکھ رہی تھی ... میں ... نکل رہی تھی۔

زیاد نے کہا کہ وہ اگلے چند سال تک بچوں ... میں نہیں پڑنا چاہتا۔" ... کنٹراسیپشن لینے پہ گلٹی محسوس ... یعنی اب آپ ... ختم۔"

... بالکل ختم نہیں ہوا' رامین۔ اسے بچے کیوں ... نہیں؟" مالا نے پریشان کرا سے دیکھا۔ رامین نے مٹھائی کا باکس ایک طرف رکھا اور ... دی۔

"کیا فرق پڑتا ہے؟ آپ خود بچے نہیں ... ہوا کر ... میں ابھی نہیں چاہتی۔ لیکن چند ماہ بعد... یا ... اگلے سال تک میں چاہوں گی کہ ہمارے بچے ... لیکن وہ ایسا بالکل نہیں چاہتا۔ کیوں؟"

رامین نے ایک الجھی ہوئی نگاہ میز پہ الٹے ... پڑے کاغذوں پر ڈالی۔

"کیا اس بات کا ان کاغذوں سے کوئی تعلق ہے؟" ... بائیں ہاتھ میں چکر کاٹتی مالا ٹھٹھک کے رکی۔ ... کے چہرے کی رنگت بدلی۔ تھوک نگلا۔

"نہیں۔ ان کے بارے میں میں تمہیں بتاؤں گی۔"

"کب؟" وہ سسپنس سے اب بور ہونے لگی ... کی بالکنی میں کھڑی انگلیاں مروڑتی رہی۔ ... کسی کنفیوژن کا شکار تھی۔ وہ کچھ بتانا چاہتی تھی ... مگر ... کچھ تھا جو اس کی زبان پکڑ لیتا تھا۔

"کیا آپ بیکری گئیں؟" رامین نے مایوس ہو کر ... کا کین اٹھایا اور اسے کھولنے لگی۔

☆☆☆

... نشان تشی میں بنی اس بیکری کے اندر کافی بینز کی خوشبو پھیلی تھی۔

مالا اندر داخل ہوئی تو گلابی اور سفید رنگوں سے سجا ایک سٹنگ ایریا دکھائی دیا۔ اس کی متلاشی نگاہیں اطراف میں دوڑ گئیں۔ پھر وہ شناسائی سے مسکرائی۔

بیرمل سٹنگ ایریا میں ستون کے ساتھ تنہا بیٹھا تھا۔ سر جھکائے۔ سامنے ان چھوا کافی کپ رکھا تھا۔ ملگجا لباس' کان میں بالی' اداس چہرہ' زیر لب وہ کچھ بول رہا تھا۔

"بیرمل؟" وہ کھنکھاری۔

بیرمل نے چونک کے چہرہ اٹھایا۔ کچھ بولتے بولتے رکا۔

کشمالہ عین سامنے کھڑی تھی۔ سیاہ کارڈیگن پہ زرد مفلر دو بل دے کر گردن میں لپیٹا ہوا تھا' جس سے فاختہ والا لاکٹ چھپ گیا تھا اور کھلے بال مفلر کی گرفت میں مقید ہو گئے تھے۔ دائیں کندھے سے گزار کے بائیں پہلو میں کراس باڈی بیگ تھا اور سبز آنکھیں اسے دیکھ کے دوستانہ انداز میں مسکرا رہی تھیں۔

"مالا؟"

وہ چند قدم آگے آئی۔ اگلے ہی پل مسکراہٹ غائب ہوئی۔

ستون کی اوٹ میں کوئی کھڑا تھا۔ وہ جو دروازے سے دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ جس سے بیرمل بات کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی اور بظاہر وہ ایک نئے دن کے لیے تیار' سوٹ اور ٹائی میں ملبوس تھا۔ آہٹ پہ وہ پلٹا۔ ایک نظر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں قدرے سرخ تھیں۔ جیسے رات بھر جاگتا رہا ہو۔ پھر اس نے چہرے کا رخ موڑ کے پیالی سے گھونٹ بھرا۔

"خوش آمدید۔ آیئے۔" بیرمل فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ مالا نے پھر سے ہاشر کو دیکھا۔ وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ وہ وہاں اس کی موجودگی کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ لیکن وہ اس کی خاموشی کی توقع بھی نہیں کر رہی تھی۔

"میں معید کے ویڈنگ کیک کے لیے آئی تھی۔" وہ چہرے پہ پھر سے مسکراہٹ لاتے ہوئے' آگے آئی اور پرس کندھے سے آزاد کرتے ہوئے صوفے پہ بیٹھی۔ اسی پل ایک عینک والی پستہ قد لڑکی کچن سے آتی دکھائی دی۔ مالا کو دیکھ کے وہ

ٹھہری۔ آنکھیں مشکوک انداز میں چھوٹی ہوئیں۔ باری باری سب کے چہرے کے تاثرات دیکھے۔

"شبنم..." ہیرل نے اسے اشارہ کیا۔ "کچن میں کشمالہ خانم کے لیے کافی آرڈر کردو پلیز۔"

شبنم کا منہ کھل گیا۔

"وہ باغ بان کی بیٹی؟"

"باغبان؟" وہ چونکی۔

"کک... کچھ نہیں..." ہیرل گڑبڑا کے تیزی سے شبنم کی طرف لپکا۔ وہ یہاں سے اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن وہ جلد ہی حیران پریشان کھڑی شبنم کو زبردستی کچن کی طرف لے جاتا دکھائی دیا۔

ستون کے ساتھ کھڑا شخص بالکل خاموشی سے اپنی چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔

مالا نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ پھر چہرہ اٹھا کے سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"کل رات میں نے تمہیں کال کی تھی کیونکہ..."

"ناٹ انٹرسٹڈ" اس نے نگاہ ملائے بغیر ایک اور گھونٹ بھرا۔ کشمالہ کے چہرے پہ پہلے الجھن ابھری، پھر ناگواری۔

"تم نے خود کہا تھا اگر ہلال کے..."

"کشمالہ بی بی..." اس نے پیالی زور سے میز پہ رکھی۔ "مجھے آپ کی مدد نہیں چاہیے۔ میں اپنی بہن کو خود ڈھونڈ سکتا ہوں۔"

وہ واپس سیدھا کھڑا ہوا۔ وہ اب بھی اس کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ کشمالہ کا چہرہ ہلکا گلابی ہوا۔

"فائن بائی می۔" وہ چہرہ موڑ کے کچن کے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ اسی پل ہیرل آتا دکھائی دیا۔

"سوری، شبنم کے لیے۔" وہ شرمندہ لگ رہا تھا۔ "دراصل اس کا قصور نہیں ہے۔ بچپن میں وہ اپنی ماں کے ہاتھ سے گر گئی تھی۔ ایسی چوٹ لگی کہ..." اس نے کنپٹی تک انگلی لے جا کر دائرہ بنایا۔ وہ پھیکا سا مسکرا دی۔

"اچھا؟"

"جس کا میرے جیسا بھائی ہو، اسے لگے ہم کے مینج کا کام آنا ہی پڑتا ہے۔" ہیرل نے اکرشا کی نظر اس شخص پہ ڈالی جو کیتلی سے اپنی پیالی میں مزید چائے انڈیل رہا تھا۔

"اگر تم ٹھیک نہیں ہو تو ہم کہیں اور سے کیک لے لیتے ہیں۔ یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔"

"توبہ توبہ۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "یہ کیک ماہر بے کا تحفہ ہے۔ اگر میں نے نہ بنایا تو وہ آپ کے بھائی کو کسی عمارت کا ماڈل گفٹ کر دے گا۔ اس کو کاٹ کے کیسے کھائیں گے؟"

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس دی۔ کن اکھیوں سے وہ اس شخص کا نیم رخ دیکھ سکتی تھی۔ وہ اسی طرح کھڑا تھا۔ کیا اسے چائے پینی تھی؟ یا وہ دونوں بھائی کسی بات کے درمیان میں تھے جسے اس نے مخل کر دیا تھا؟

"میں نے تمام فلیورز منگوائے ہیں۔ آپ ٹیسٹ کر کے بتا دیں۔ ویسے آپ اپنے نرجنڈ کو ساتھ نہیں لائیں؟ سنا ہے کل رات وہ بھی استنبول پہنچ گئے ہیں۔"

جہاں وہ بری طرح چونکی، وہاں ماہر فرید نے تیزی سے پیالی نیچے کی اور اسے آنکھوں سے جیسے کوئی اشارہ کیا۔

"تمہیں کیسے معلوم؟" اس نے براہ راست ماہر کو دیکھا۔

"سعید سے سنا تھا۔" اس نے شانے اچکائے۔ وہ ہنوز اس کی طرف نیم رخ کیے کھڑا تھا۔

"سعید سے؟" کچھ تھا جو اسے برا لگا تھا۔ سعید کا زیاد کے بارے میں ان کو بتانا یا ہیرل کا "کل رات" کہنا۔ وہ صبح آیا تھا۔ پھر اس نے کل رات کیوں کہا؟

وہ پوچھنا چاہتی تھی لیکن ویٹر ٹرے لیے آ گیا۔ پھر چند پلیٹیں میز پہ رکھیں۔ ہر پلیٹ میں ایک کیک سلائس اور ایک چمچ رکھا تھا۔ یہ کیک ٹیسٹنگ تھی جو کیک کا آرڈر دینے سے قبل ہونا ضروری تھی۔ تمام سلائسز کے رنگ اور شکلیں مختلف تھیں۔

"یہ ہمارے سگنیچر فلیورز ہیں۔ آپ ایک ایک کر کے سب ٹرائی کریں۔" ہیرل کا موڈ قدرے بہتر

...بتا انداز میں بے دلی اور سستی تھی۔ جیسے وہ اپنے بھائی کے مجبور کرنے پہ یہاں آیا ہو۔ خاموشی سے کیک سلائسز کو دیکھنے لگی۔ اس ...کل رات کیوں کہا؟ ویٹر سامنے سے ہٹا تو مالا نے چہرہ اس کی ...اٹھایا۔

"شبنم..." ہم آفس واپس جا رہے ہیں۔" ...نے بلند آواز میں اپنی سیکرٹری کو پکارا۔ سوال کشمالہ مبین کے حلق میں دم توڑ گیا۔ ہیرل نے اسے گھورا لیکن وہ ان کی طرف دیکھ ...رہا تھا۔

شبنم فوراً ہی کچن سے نکل کے آئی۔

"شیور ماہر بے!" وہ خواہ مخواہ ہی مسکرائے جا رہی تھی۔

ماہر نے جھک کے پیالی رکھی اور اسی لمحے مالا نے سر جھکا کے چمچ سے کیک کا ٹکڑا توڑا۔ کچھ تھا جو نگاہوں میں چمکا تھا۔ وہ چونک کے سیدھا ہوا۔ نظر اس کے کارڈیگن پہ ٹھہر گئی۔

"یہ لاکٹ..." وہ پلک جھپکائے بغیر میں ابھی سیاہ فاختہ کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ تمہارے پاس کیسے آیا؟"

"میں بتانے میں انٹرسٹڈ نہیں ہوں۔" وہ اب ایک ایک کیک سلائس چکھ رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔

وہ ہنوز بے یقینی اور الجھن سے اس لاکٹ کو دیکھ رہا تھا جب شبنم کھنکھاری۔

"ماہر بے... دروازہ اس طرف ہے۔" مسکرا کے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔

ماہر نے بس ایک گھورتی ہوئی نظر اس پہ ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ وہ اسی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کے پیچھے لپکی۔ ہیرل نے افسوس سے اسے جاتے دیکھا۔

"میں اپنے بھائی کی طرف سے معذرت خواہ

ہوں۔ اس کے جسم سے انسانی روح نکلے برسوں بیت چکے۔ کھانا پینا تو صرف دکھاوا ہے۔ اصل میں چار جنگ سے چلتا ہے۔"

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی۔

"ایسے پیس نایاب ہوتے ہیں۔ لیکن ماشاء اللہ ہمارے خاندان میں ایسے دو ہیں۔" انگلیوں کی وکٹری بنا کے دکھائی۔ "یہ لاکٹ میری ماں کا تھا۔ یقیناً آپ کو دوسرے روبوٹ نے دیا ہوگا؟" وہ عام سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"تمہیں یقیناً برا لگا ہوگا کہ تمہاری ماں کی چیز کسی اور کو دے دی گئی۔" اس کا دل یونہی برا ہوا۔

"مجھ غریب کی ساری پراپرٹی اٹھا کے کسی اور کو دے دی گئی ہے۔ میں کس کس چیز کا غم مناؤں؟" وہ ہنس دیا تو وہ بھی مسکرا دی۔ پھر ایک نظر دروازے کو دیکھا جہاں سے وہ گیا تھا۔

کل آفس میں جو شخص اس سے ملا تھا، جو اس کو کار میں ڈراپ کروانے کی پیشکش کر رہا تھا، وہ کوئی اور تھا۔ کچھ بدل گیا تھا اس میں۔ اس نے اپنی انا، اپنے اور کیف کے تمام مسئلے پس پشت ڈال کے اسے ہلال کے لیے فون کال کی تھی، اسے لگا تھا وہ مزید جاننا چاہے گا، کیونکہ اس کے پاس بتانے کو کچھ نہیں تھا۔ یا شاید وہ شکر گزار ہوگا۔ لیکن یہاں... وہ جیسے اس سے احتراز برت رہا تھا۔

"کیک؟" ہیرل نے یاد دلایا۔ "ویڈنگ کیک کے تین tiers (منزلیں) ہوں گے۔ سب سے نچلے tier کو..."

"سب سے بھاری ہونا چاہیے۔ جیسا کہ ریڈ ویلویٹ۔" ایک پلیٹ اس کی طرف کھسکائی۔ ہیرل کے الفاظ منہ میں رہ گئے۔ وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

"لیکن اس میں مجھے کریم چیز فلنگ چاہیے۔ دوسرا... tier" اس نے چمچے سے ایک دوسری پلیٹ پہ دستک دی۔

"چاکلیٹ فج کیک کا ہونا چاہیے۔ اس میں

بلجیئن چاکلیٹ ganache ہوگی۔"
پھر ایک پلیٹ اٹھا کے درمیان میں رکھی۔
"اور سب سے ہلکا کیک یعنی کوکونٹ کیک ٹاپ میر ہوگا۔تم اس کو لیمن کرڈ فلنگ کے ساتھ بنا سکتے ہو؟"
"آف کورس۔" وہ کھلے دل سے مسکرایا۔
"آپ کو کیکس پسند ہیں؟"
اس نے جواب نہیں دیا۔بس مسکرا کے اطراف میں دیکھا۔
"کیسی جا رہی ہے آپ کی بیکری؟" انداز سرسری تھا۔
"بہت کامیاب۔"
"اسی لیے ایک بھی گاہک نہیں ہے۔" اس نے غور سے بیرل کو دیکھا۔
"پھر بھی آپ یہاں بیٹھی ہیں۔" وہ ڈھٹائی سے مسکرایا تو وہ ہنس دی۔
"امید ہے کیک اچھا ہوگا۔" وہ پرس اٹھاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔وہ بھی ساتھ ہی کھڑا ہوا۔
"ہمارے کیک جیسا ذائقہ فلیش لائٹ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔"
اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔
"فلیش لائٹ؟" وہ جہاں تھی وہیں ٹھہر گئی۔
"محاورہ بول رہا ہوں جیسے" بیرل نے ناخن سے شیو کھجائی۔"جیسے لیمپ لے کر کچھ ڈھونڈنا... علامتی طور پہ..."
"علامت۔فلیش لائٹ ایک علامت ہے۔" وہ جیسے خود سے بولی۔"لیکن کس چیز کی؟"
"کیا مطلب؟" وہ حیران ہوا۔لیکن وہ کچھ کہے بنا تیزی سے باہر کی طرف بڑھ گئی۔
وہ اچنبھے سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔پھر افسوس سے بڑبڑایا۔
"شاید یہ بھی بچپن میں گری ہو۔"
☆☆☆
بیرل کی بیکری سے نکل کے وہ اسٹریٹ میں یونہی چلتی رہی۔ذہن کسی دوسرے نقطے پہ الجھا تھا۔
اطراف میں چلتے سیاح' کیفے ز' شاپس' کچھ بھی اس کے لیے پرکشش نہیں تھا۔اس نے سوچا تھا استنبول آئے گی تو خوب گھومے پھرے گی۔کسی سیاح کی طرح۔اس سے پہلے وہ دو دفعہ اس شہر میں آئی تھی۔ایک دو دن کے لیے' کسی گروپ کے ساتھ' کسی کانفرنس کے لیے۔اکیلے اپنے قدموں پہ شہر دیکھنے کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔
لیکن اس بار وہ زیاد کے ساتھ اس شہر کو ضرور ایکسپلور (دریافت) کرے گی۔
اور زیاد کے خیال سے کچھ اور یاد آیا۔
"میں چار بجے نہیں آسکوں گی' مالک صاحب۔" وہ ایک دکان کے فرنٹ پہ بنے زینوں پہ بیٹھ گئی اور ان کو میسج لکھنے لگی۔میسج بھیجا ہی تھا کہ ان کی کال آنے لگی۔اف۔
"کیوں؟ آپ کی فائل تیار ہے۔"
اس کے ساتھ ایک سمت (ترکش بیگل) بیچنے والا اپنا سرخ کارٹ لیے آن کھڑا ہوا تھا۔گول' خستہ سمت کی خوشبو اس تک اپنا راستہ بنانے لگی۔
"آپ نے درست کہا تھا۔مجھے اس سے بات کرنی چاہیے تھی۔ہم نے بات چیت کے ذریعے اپنا مسئلہ حل کر لیا ہے۔"
"میں نے کہا تھا اس سے بات کریں۔یہ نہیں کہ اس کی ہر بات کا یقین کریں۔اس نے کوئی کہانی سنائی اور آپ نے مان لی؟"
"میں ایک مری ہوئی عورت کی وجہ سے اپنا گھر نہیں خراب کرنا چاہتی۔" کارٹ والے نے ایک گول سمت پکڑ کے اس کی طرف بڑھائی۔اس نے مسکرا کے نفی میں سر ہلایا۔صبح ہی صبح اتنے کاربز۔کبھی نہیں۔
"اور اپنے شوہر کی جاسوسی کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔میں اس سے محبت کرتی ہوں اور اس پہ یقین کرنا چاہتی ہوں۔"
"یہ محبت ہے نہ یقین۔یہ خوف ہے۔"
مالک فرید اس وقت کیف کے آفس کی بالکنی میں بیٹھے تھے۔یہاں سے ان کو زارا کے آفس کی

کھڑکی دکھائی دے رہی تھی۔وہ کرسی پہ براجمان کمپیوٹر پہ کچھ ٹائپ کر رہی تھی۔چہرہ مطمئن تھا۔
"جانتی ہیں لوگ مجھے ناپسند کیوں کرتے ہیں؟ کیونکہ میں ناپسندیدہ سچ بولنے کا عادی ہوں۔یہ خوف ہے' کشمالہ۔" وہ زارا کو دیکھ رہے تھے۔وہ اب ریسیور اٹھائے مسکرا کے کسی سے بات کر رہی تھی۔
"کس چیز کا خوف؟"
"جب عمر کا تیسواں سال قریب آتا ہے' اور آنکھوں کے گرد جھریاں آنے لگتی ہیں' تو ہر عورت کی طرح آپ بھی خوف کا شکار ہو رہی ہیں۔اکیلے رہ جانے کے خوف کا۔"
(ہوٹل کی لابی میں ماہی کے بیگز اور اسٹرالر کھڑا تھا۔وہ مالا سے گلے مل رہی تھی اور معید مسکرا کے انہیں دیکھ رہا تھا۔زیاد بھی ساتھ کھڑا تھا اور اس کے ہونٹوں پہ بھی مسکراہٹ تھی۔وہ ایک نارمل فیملی لگ رہے تھے۔)
"اس نے آپ کو ایک کہانی سنائی' اور آپ نے یقین کر لیا؟ نہیں۔آپ کو معلوم ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔مگر آپ کو ایک بہانہ چاہیے تھا اس کو معاف کرنے کا۔کیونکہ تنہا رہ جانے کا خوف جان لیوا ہوتا ہے۔"
(منظر بدل چکا تھا۔اسی لابی میں اب مالا اور ماہی صوفوں پہ ٹھہری بیٹھی تھیں۔دفعتاً معید اندر داخل ہوا۔اس کے ساتھ ایک دبلی پتلی اسٹیپ کٹنگ والی لڑکی تھی۔مالا مسکرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔البتہ ماہی نے ناک سکوڑا۔
"ہونہہ۔پلاسٹک کی گڑیا۔ماں ہوتیں تو اسے کبھی..." مالا نے اس کا ہاتھ دبایا۔وہ خاموش ہوئی۔)
"کل تک آپ اس کو چھوڑنا چاہتی تھیں لیکن آئینہ آپ کو متنبہ کرتا ہے کہ یہ جوانی اور خوب صورتی ہمیشہ نہیں رہے گی۔اس کو چھوڑ دیا تو اب دوسرا کوئی نہیں ملے گا۔"
(وہ دونوں اسٹریٹ کارنر پہ آئس کریم کی دکان کے سامنے کھڑے تھے۔وہ ہنستے ہوئے ہاتھ بڑھائے کون پکڑے کھڑی تھی۔زیاد مسکراتے ہوئے موبائل پہ اس کی فلم بنا رہا تھا۔آئس کریم والا بار بار سلاخ سے چپکی آئس کریم اس کی طرف بڑھاتا۔پھر اسے کھینچ لیتا۔وہ ہنسے جا رہی تھی۔)
"اس کے لیے آپ اپنے تمام اسٹینڈرڈز ایک ایک کر کے نیچے کرتی جائیں گی۔آپ اسے ہر دفعہ معاف کر دیں گی۔"
(فرنچ کٹ والا آدمی پولیس اسٹیشن کے ایک کاؤنٹر پہ کھڑا تھا۔ایک آفیسر اسے گرفتاری کے وقت ضبط کی گئی تمام اشیاء واپس کر رہا تھا۔اس کا فون' سیاہ تعویذ۔
"غالب نواز۔تم جا سکتے ہو۔" قریب کھڑے چنگیز نے بغور اس کو دیکھتے ہوئے اطلاع دی۔اس نے تعویذ اٹھا کے گردن میں پہنا اور مسکرا کے آگے بڑھ گیا۔)
"آپ جب بھی اس کے جھوٹ پہ اسے چھوڑنے کا سوچیں گی' آپ کو وہ گزرے ہوئے ماہ و سال یاد آئیں گے جو آپ نے اس شخص پہ لگائے تھے۔چاہے وہ ایک سال ہو۔(بابیت سے زارا کو دیکھا) یا کئی برس۔اب اس شخص کو چھوڑ دینا ایسے ہے جیسے وہ سال ضائع گئے۔"
(غالب نواز کے پولیس اسٹیشن سے نکلتے ہی ایک چھوٹی' نیلی کار جس کی چھت سفید تھی' اس روی سے اس کے پیچھے ہولی۔اس میں ڈرائیونگ سیٹ پہ ایک بھاری بھرکم آفیسر بیٹھا جس کے ایک ہاتھ میں سینڈوچ تھا۔وہ بار بار ڈرائیو کرتے ہوئے سینڈوچ کا ایک لقمہ دانتوں سے توڑتا۔)
"اس کو چھوڑ دینا ایسے ہے جیسے اتنا عرصہ اس شخص پہ کی گئی جذباتی انویسٹمنٹ غلط تھی۔جیسے آپ غلط تھیں۔اور اگر یہ مان لیا کہ آپ غلط تھیں تو خود کا سامنا کرتے ہوئے خوف آئے گا۔"
(ایک کئی کنال کے خالی پلاٹ کے سامنے اس وقت بہت سے لوگ کھڑے تھے۔کیمرہ کریو۔ورکرز۔سفید ہیلمٹ پہنے بہت سے افراد۔ایک طرف ایک بڑے اسٹینڈ پہ پینافلیکس لگا تھا جس پہ ایک

سرخ عمارت کا ماڈل چھپا تھا۔ سامنے ماہر کھڑا تھا۔ سفید انجینئر ہیلمٹ پہنے، وہ مسکرا کے کدال کے ذریعے زمین پہ ضرب لگا رہا تھا۔ گراؤنڈ بریکنگ تقریب میں آئے افراد نے بے اختیار تالیاں بجائیں۔ مبارک سلامت کی آوازیں گونجیں۔ (تالیاں بجانے والوں میں زارا بھی تھی۔)

"اور خوف ایک ایسا ہے جو بار بار جلتا ہے لیکن ہر دفعہ اپنی راکھ سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔"

"(معید۔" زیاد اور ماہی بوفے ٹیبل سے کھانا لینے گئے تھے جب مالا نے معید کے قریب جھک کے پوچھا۔

"تم نے زیاد کے آنے کے بارے میں ماہر کو بتایا تھا؟"

"نہیں۔ میں کیوں بتاؤں گا؟" وہ حیران ہوا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی۔)

یہ یہیں ختم نہیں ہو گا۔ یہ اس کا آخری جھوٹ نہیں ہو گا۔ نہ یہ آخری دفعہ ہو گا جب آپ اس کا سچ جاننے کی کوشش کریں گی۔ لیکن انجام ہر دفعہ یہی ہو گا۔

("آپ نے میسج نہیں کیا؟ ہم واک پہ جا رہے تھے۔" وہ باتھ روم سے نکلی تو اسے کھڑکی کے ساتھ صوفے پہ بیٹھے، لیپ ٹاپ پہ مصروف دیکھ کے ٹھٹک گئی۔ زیاد نے چہرہ اٹھا کے بے چارگی سے اسے دیکھا۔

"سوری۔ میں آج شام لکھنا چاہتا ہوں۔ بہت مشکل سے ذہن بن رہا ہے۔ تم خود چلی جاؤ۔ یا ماہی کو ساتھ لے جاؤ۔" واپس اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کا چہرہ بجھ سا گیا۔

اب وہ جھکے کندھوں اور اداس چہرے کے ساتھ باہر اسٹریٹ میں چل رہی تھی۔ ہر شے بے رونق تھی۔)

"میں سمجھا تھا آپ مختلف ہیں۔ زیادہ بہادر۔ کم عقل مند۔ لیکن آپ کے خوف بھی دوسری لڑکیوں جیسے ہیں۔ (وہ زارا کو دیکھ کے کہہ رہے تھے۔) آپ بھی گھبرا جانے والی، خوف زدہ ہیں۔"

"کیا میں غلط انتخاب کر رہی ہوں؟" دوست کے سرخ کارٹ کے ساتھ بیٹھی، فون کان سے لگائے، اداسی سے پوچھ رہی تھی۔

"زندگی میں ہر انتخاب غلط یا درست نہیں ہوتا لیکن نتیجہ ہر انتخاب کا ہوتا ہے۔ سزا یا جزا۔ اس نتیجے کے ساتھ آپ کو تمام عمر رہنا ہو گا۔ آپ کو جب بھی سبر ینہ کی فائل چاہیے ہو گی، میں ایک فون کال کے فاصلے پر ہوں گا۔"

☆☆☆

"استنبول جیسا خوب صورت شہر بھی آپ نے انجوائے نہیں کیا؟"

رامین اب کچن کاؤنٹر کے سامنے کھڑی برتن سمیٹتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"کیسے کرتی؟ سوائے ایک آئس کریم دلانے کے، زیاد کہیں بھی میرے ساتھ باہر نہیں گیا۔ مجھے ٹریول کرنے کا شوق ہے۔ اپنے قدموں پہ کسی انجان شہر میں کئی میل چلنے کا۔ لیکن کوئی ساتھ تو ہو۔ اکیلے کہاں مزہ آتا ہے۔"

وہ کاؤنٹر کے پیچھے رکھے اسٹول پہ بیٹھی اداسی سے کہہ رہی تھی۔

رامین نے اختلاف کے لیے لب کھولے، پھر ارادہ تبدیل کر کے کیبنٹ کھولنے لگی۔

"میں چائے بنا رہی ہوں۔ آپ بتائیں، پھر آگے کیا ہوا؟"

"لڑائی۔"

رامین نے چونک کے اسے دیکھا۔

"کس کی لڑائی؟"

☆☆☆

"تمہارے خیال میں فلیش لائٹ کس چیز کی علامت ہے؟"

ریستوران ایریا میں اس صبح بفے بریک فاسٹ زور و شور سے جاری تھا۔ انڈوں، ترکش بیگل (سمت) اور کافی کی ملی جلی مہک نے سارے کو معطر کر رکھا تھا۔ ایک طرف آملیٹ سیکشن تھا جہاں

شیف تازہ آملیٹ بنا رہا تھا۔ معید اپنا ناشتہ لیے میز پہ پہنچ چکا تھا جبکہ وہ دونوں آملیٹ کے انتظار میں شیف کے سامنے کھڑی تھیں۔ وہ ابھی ماہی کا آملیٹ تیار کر رہا تھا۔

"فلیش لائٹ؟" ماہی نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"میں نے ماں کو خواب میں دیکھا۔ دو دفعہ انہوں نے مجھے فلیش لائٹ ڈھونڈنے کے لیے کہا۔ خواب میں دکھائی دینے والی چیزیں عموماً علامت ہوتی ہیں۔"

ماہی سوچ میں پڑ گئی۔ اسی لمحے شیف نے اشارہ کیا۔ اس نے جلدی سے اپنی پلیٹ آگے کی۔

"فلیش لائٹ روشنی کی علامت ہے۔ لیکن چیز جو اندھیرے میں دیکھنے کے لیے استعمال کی جائے۔"

شیف اب گیلا گیلا سا زرد آملیٹ اس کی پلیٹ میں انڈیل رہا تھا۔ ترک اس کو سادے آملیٹ (سادہ آملیٹ) کہتے تھے۔

"مشروم چیز آملیٹ۔" اپنا آرڈر نوٹ کروا کے اس نے تعجب سے ماہی کو دیکھا۔ "ماں کو روشنی کیوں چاہیے؟"

"شاید تمہیں چاہیے؟"

وہ گم صم سی آملیٹ بار میں بنے مختلف خانے دیکھے گئی۔ وہاں ہر رنگ کی شے موجود تھی۔ کئی سبزیاں۔ پنیر۔ مشروم۔

اسے روشنی کیوں چاہیے تھی؟

"مجھے خوشی ہے کہ تم آ گئی ہو ماہی۔" وہ تینوں دوبارہ اپنی میز پہ بیٹھے تھے جب معید نے نرمی سے بات کا آغاز کیا۔ ساتھ رکھے اسٹرولر میں حور عین سو رہی تھی۔ ماہی مسکرا دی۔ پھر ایک تنقیدی نظر معید کی پلیٹ پہ ڈالی جو آملیٹ، سلامی، ساسیج اور کئی طرح کے ٹکڑے بھری ہوئی تھی۔

"کل نکاح ہے تمہارا۔ تمہیں ڈائیٹنگ پہ ہونا چاہیے۔"

"میں تھک چکا ہوں تیاری کرتے کرتے۔"

"ہوں۔ کافی لمبے عرصے سے تیاریاں چل رہی تھیں کافی۔" ماہی کی نظروں میں خفگی ابھری۔ معید نے سر جھکائے، چھری کانٹے سے آملیٹ توڑتے ہوئے محض کندھے اچکا دیے۔ وہ اتنا تھکا ہوا تھا کہ تردید بھی نہیں کر پا رہا تھا۔

"میں نے انسٹا پہ اس وینیو کو دیکھا ہے جو تم نے سلیکٹ کیا ہے معید۔" مالا نے اسے بازرہنے کا اشارہ کیا لیکن وہ ماہی تھی۔ "اتنے پیسے کہاں سے آئے اس ایمر جنسی نکاح کے لیے؟"

"باغ سے اور کہاں سے۔" معید کا موڈ اب خراب ہو رہا تھا۔

"ہونہہ۔ خوامخواہ کی فضول خرچی۔" ماہی منہ بنا کے پلیٹ پہ جھک گئی۔

البتہ مالا رک گئی۔ ہاتھ روک کے اسے دیکھا۔

"باغ کے ٹھیکے سے؟ وہ تو چند ہزار سے زیادہ کا نہیں ہوتا۔"

ایک سرخ بتی ذہن میں جلنے بجھنے لگی۔

معید نے پانی کا گھونٹ بھرا۔ پھر چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔

"میں نے باغ بیچ دیا ہے۔"

"معید!" وہ دونوں ایک ساتھ چیخی تھیں۔

"تم نے شادی کے لیے باغ بیچ دیا؟"

"اس فضول خرچی کی کیا ضرورت تھی؟" ماہی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

"فضول خرچی کا مسئلہ نہیں ہے، ماہی۔" مالا ایک دم غرائی۔ اتنی زور سے کہ ماہی بھی چپ ہو گئی۔ "اس باغ میں میرا اور ماہی کا بھی حصہ تھا۔"

"یار مجھے پیسے چاہیے تھے۔ میں کہاں سے پورا کرتا۔" وہ جیسے اکتا گیا۔

"جہاں سے بھی کرتے مگر میری اور ماہی کے حصے کی زمین نہ بیچتے۔ ہم نے تمہیں پاور آف اٹارنی اس لیے دیا تھا کہ ہم پاکستان میں نہیں تھے۔ اس باغ میں تمہاری بہنوں کا شرعی حق تھا۔" اس نے زور سے مٹھی بھینچ کے میز پہ رکھی۔ ایک کانٹا اچھل کے نیچے جا گرا۔

"بس کر دو یار۔" معید نے غصے سے پلیٹ پرے کی۔ "ماں نے تم لوگوں کو شادیوں پہ اتنا گولڈ اور جہیز بھی دیا تھا۔ مالا کی شادی کا اماؤنٹ بھی انہوں نے الگ سے مختص کیا تھا۔"

"جہیز الگ چیز ہوتی ہے، معید! جیسے ہمیں جہیز دیا ویسے ہی تمہارے فارن ٹرپس اور پڑھائی پہ بھی بہت خرچ کیا ہے ماں نے۔ جہیز دینے سے جائیداد کا حصہ ختم نہیں ہو جاتا۔ تم نے آدھا باغ بیچا لیکن وہ ہمارا حصہ تھا۔"

"یار وہ اتنا مہنگا باغ نہیں تھا۔ چھوٹا اور سستا سا تھا۔ میں تمہارا بھائی ہوں۔ مجھے پیسے چاہیے تھے۔"

"تمہیں اندازہ بھی ہے کہ تم نے کیا کیا ہے؟" وہ دبا دبا سا چلائی۔ ارد گرد لوگ مڑ کے انہیں دیکھنے لگے۔

"میں نے ظہیر کے ساتھ پارٹنر شپ نہیں کی کیونکہ میں ماں سے پیسے نہیں لینا چاہتی تھی۔ کیونکہ ماں کے پاس جو بھی تھا اس میں تم دونوں کا بھی حق تھا اور اسی لیے ظہیر نے مجھے ایک منٹ میں آؤٹ کر دیا۔ میں اپنی لگژری تک اپنی سیونگز سے کرتی ہوں معید! تمہاری شادی کا یہ اسٹوپڈ ٹرپ بھی۔" اس نے نیپکن اٹھا کے پرے پھینکا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ تمتما رہا تھا۔ مالا کو غصہ کم ہی آتا تھا، اب آیا تو ماہی تک چپ ہو گئی۔

"مجھے لگا تم دونوں کو وہ نہیں چاہیے ہو گا۔ تم دونوں کے ہزبینڈز اچھا خاصا کماتے ہیں۔"

"پھر وہی بات؟ میرا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ وہ باغ سستا تھا یا تم نے فضول خرچی کی۔ بات حق کی ہے۔ تم نے ایک دفعہ بھی ہم سے نہیں پوچھا۔"

"تم لوگوں سے بات کرنا ہی فضول ہے۔ تم لوگ دراصل میری خوشی میں خوش ہی نہیں ہو۔ ماں ہوتیں تو...." وہ غصے سے کرسی دھکیل کے اٹھا۔

"ماں کے نام پہ بلیک میلنگ نہ کرو۔ ماں ہوتیں تو میں دیکھتی کیسے تم اس پلاسٹک کی گڑیا کی انگلی کے ساتھ بندھے ہوئے۔" ماہی چمک کے بولی۔

معید بکا جھکا باہر نکل گیا۔ ماہی نے ایک نظر اسٹرولر میں سوتی حور کو دیکھا جو صد شکر ابھی تک نہیں جاگی تھی۔ پھر ماتھے کو چھوا۔

"اس نے صرف شادی کے لیے فضول خرچی...."

"پھر تم فضول خرچی کی بات لے کر بیٹھ گئی ہو۔" وہ اس پہ غصہ ہوئی۔ "وہ کرے فضول خرچی۔ شوق سے کرے لیکن اپنے پیسے سے کرے۔ وہ یوں ہمارا حق نہیں بیچ سکتا۔ بہنوں کا جائیداد میں حق ہوتا ہے جو جہیز دینے سے سلب نہیں ہو جاتا۔ جہیز گفٹ ہوتا ہے۔ جیسے بچی کو دیا جاتا ہے ویسے ہی بیٹوں کے نخرے ساری زندگی اٹھائے جاتے ہیں۔ وہ گفٹس ہوتے ہیں۔ حق نہیں۔ گفٹ دیں یا نہ دیں۔ اس کی پوچھ نہیں ہے۔ حق کی ہے۔ معید نے ہمارا حق مارا ہے۔" اس نے گلاس اٹھایا اور ایک ہی گھونٹ میں سارا پانی غٹاغٹ پی گئی۔ چہرہ ابھی تک سرخ تھا۔

"میں تو آنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ تم نے مجھے ایموشنل کر دیا تھا۔" ماہی کو بالآخر موضوع مل گیا تھا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ اگلا گلاس بھرنے لگی۔ اسے سانس لینے تھے۔ اسے خود کو پرسکون کرنا تھا۔

لیکن.....

کن اکھیوں سے اسے دکھائی دیا۔ ہال کے داخلی حصے سے کوئی چلا آرہا تھا۔ وہ اس کو بنا دیکھے بھی پہچانتی تھی۔ مانوس قدموں کی چاپ۔ مانوس پرفیوم۔ مانوس آواز۔

(اف... ابھی نہیں۔ آج صبح نہیں۔)

وہ ان کی میز کے قریب رکا۔

"ہیلو ون اِن ففٹی............"

ماہی بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ماہر...."

☆☆☆

یاسمین کے آفس کی کھڑکی کے باہر برستی بارش اب رک چکی تھی۔ شیشے ہنوز گیلے تھے۔ وہ کھروکوشال کی طرح لپیٹے اسی طرح کاؤچ پہ بیٹھا تھا۔ سامنے میز پہ ان کا ہاتھ کا چھوا سینڈوچ رکھا تھا۔

"تم اس سے ملنے کیوں گئے؟" وہ کرسی پہ بیٹھی نوٹ بک گھٹنے پہ رکھے، اپنا سینڈوچ دانتوں سے کتر رہی تھی۔

"کہا نا۔ مجھے ماہ جبینہ نے بلایا تھا۔ ہماری ایک عرصے سے پینڈنگ (التواء) ملاقات تھی۔ لیکن میں وہاں پہنچا تو...." اس نے گہری سانس کھینچی۔ "یوں لگا تھا دونوں کی کسی بات پہ لڑائی ہوئی تھی۔ وہ غصے میں تھی اور میں نے اسے غصے میں بہت کم دیکھا ہے۔" اس نے رک کے تصحیح کی۔ "بلکہ جب بھی دیکھا ہے، مجھ پہ ہی غصہ ہوتے دیکھا ہے۔"

☆☆☆

وہ ہوٹل کی لابی سے گزر کے بریک فاسٹ روم تک آیا ہی تھا کہ وہ دونوں سامنے نظر آگئیں۔ ایک میز پہ آمنے سامنے بیٹھی دونوں لڑکیوں کے چہرے گلابی پڑ رہے تھے۔ تیسری کرسی پیچھے دھکیلی گئی تھی جیسے ابھی ابھی کوئی اٹھ کے گیا ہو۔ مالا گردن پیچھے کیے، پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگائے ہوئے تھی۔ جب تک اس نے گلاس نیچے کیا، وہ قریب پہنچ چکا تھا۔

"ہیلو ون اِن ففٹی۔" مسکرا کے اس نے صرف اسے مخاطب کیا جس سے وہ ملنے آیا تھا۔ کن اکھیوں سے وہ مالا کو چونکتے، اور پھر ناپسندیدگی سے گہری سانس بھرتے دیکھ سکتا تھا۔

"ماہر بے..." ماہی سنبھل کے بدقت مسکراتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "آپ عین مقرر کردہ وقت پہ پہنچے ہیں۔ حالانکہ اس شہر کے لوگ وقت کے پابند نہیں ہیں۔"

"شکر ہے میں اس شہر کا نہیں ہوں۔" وہ مسکرایا۔ پھر ماہی کی پلیٹ کو دیکھا۔ "تم ناشتا شروع کر چکیں؟ میرا خیال تھا ہم نشاتشی میں کہیں اس سے بہتر ناشتا کر سکتے ہیں۔"

"حور ابھی اٹھ جائے گی اور تنگ کرے گی۔ سو ہمیں یہیں رہنا ہو گا۔" ماہی نے بے بسی سے اسٹرولر میں سوئی بچی کو دیکھا۔ وہ دیکھ سکتا تھا کہ خفا چہرے والی لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے اس نے سپاٹ انداز میں اطلاع دی۔ "میں باہر جا رہی ہوں۔" اور اس کو دیکھے بنا ساتھ سے گزر کے نکل گئی۔

(زبردستی کا فیملی فرینڈ۔ ہونہہ) وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے گزری تھی۔

ماہر نے چہرہ اٹھایا۔ سامنے شیشے کی دیوار میں اس کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ وہ باہر جا رہی تھی۔ چہرہ ہنوز غصے سے گلابی تھا۔ اور ماتھے پہ بل تھے۔ کشمالہ تکین کو اس نے غصے میں بہت کم دیکھا تھا۔

وہ معید کی کرسی پہ بیٹھا اور ٹانگ پہ ٹانگ جما لی۔ انگلی سے ویٹر کو اشارہ کیا۔

"ترکش قہوہ۔" پھر بغور ماہی کو دیکھا۔ وہ سوچتی نظروں سے مالا کو جاتے دیکھ رہی تھی۔

"تم دونوں کی لڑائی ہوئی ہے کیا؟"

"نہیں۔ ہم فلیش لائٹس کو ڈسکس کر رہے تھے۔" وہ جل کے بولی۔

"فلیش لائٹس؟"

"جی۔ فلیش لائٹس۔ آپ کے خیال میں فلیش لائٹس کس چیز کی علامت ہوتی ہیں؟"

ماہر فرید نے لاعلمی سے شانے اچکائے۔

"مصنوعی روشنی۔ یہ تب جلائی جاتی ہے جب ساری روشنیاں ختم ہو جائیں اور...."

"آپ نے مالا کو ہیلو تک نہیں بولا۔ کیوں؟" اسے یک وقت جیسے سب پہ غصہ آرہا تھا۔

"روز بولتا ہوں۔ کل ہم ہیرٹل کی بیکری پہ ملے تھے۔ پرسوں میرے آفس میں۔"

"اور یہ سن کے مجھے لگا تھا آپ دونوں کے مسئلے ختم ہو گئے ہیں۔ لیکن پھر وہی آکورڈنیس۔" ماہی جیسے اکتا گئی تھی۔

"میں صرف....." وہ کھنکھارا جیسے الفاظ تلاش کیے۔ "اس کو آوائیڈ کرتا ہوں۔"

"آوائیڈ (نظر انداز)؟" ماہی کی اسکین کرتی نظریں جیسے اس کے اندر اتر رہی تھیں۔

ماہر ہلکا سا مسکرایا۔ اس کے گال پہ زخم کا نشان تھا جواب مستقل ہو چکا تھا۔

"اس کا شوہر اس شہر میں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے ان دونوں کے درمیان کوئی مسئلہ ہو۔"

"میرا شوہر اس شہر میں نہیں ہے مگر آپ کی وجہ سے ہم دونوں کے درمیان کبھی مسئلہ نہیں ہوگا، کیونکہ اس کو مجھ پہ اعتبار ہے۔ آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ زیاد کو ملالہ پہ اعتبار نہیں ہے؟ یعنی آپ ابھی تک زیاد کو ناپسند کرتے ہیں؟"

ماہر فرید نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔

"واللہ زیاد کے بارے میں میری رائے بدل چکی ہے۔"

اس کا انداز الجھا دینے والا تھا۔ لیکن خیر۔ ماہی نے سر جھٹکا۔

"چھوڑیں۔ ہم بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ میں تو آج تک آپ کا ٹھیک سے شکریہ بھی نہیں ادا کر سکی۔"

"فون پہ کئی دفعہ کر چکی ہو۔ ان فارملیٹیز کی ضرورت نہیں ہے، لڑکی۔" وہ مسکرایا۔

ویٹر اب اس کے قہوے کا ننھا سا کپ سامنے رکھ رہا تھا۔

"آخری دفعہ جب ہم ملے..... اس روز جب میرا سرخ والٹ کھویا تھا..... تب آپ مختلف تھے؟"

"میں خوف زدہ تھا۔ اب نہیں ہوں۔ میں نے خوف کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اور تم نے؟" اس نے بھاپ اڑاتا کپ اٹھایا۔ بھاپ کے پیچھے ماہی کا چھوٹے بالوں والا چہرہ دھندلا سا گیا۔

"میرے خوف اب بھی وہی ہیں۔" ماہی اسٹرا کو دیکھ رہی تھی۔ ماہر کی نگاہوں نے اس کا تعاقب کیا۔

"اس کا خیال رکھنا' بیٹا! میں ہلال کا نہیں ہو سکا۔" کوئی اداس سا نغمہ جیسے فضا میں گھل سا گیا۔ ماہی نے سر ہلا دیا۔ پھر یاد آیا۔

"آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے لیکن پھر ہم اتنے مہینوں سے نہیں مل سکے۔ آپ نے کہا تھا' آپ مل کے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"مجھے کسی نے کہا تھا کہ تم جانتی ہو کچھ۔" ماہر نے پیالی نیچے رکھ دی۔

"کس نے؟" اس نے بہت دفعہ کا پوچھا سوال دہرایا۔

"ایک بوڑھے دوست نے۔" وہ مبہم سا مسکرایا۔

"لیکن میں آپ کو فون پہ بتا چکی ہوں کہ میں سرکار نامی کسی آدمی کو نہیں جانتی نہ میں نے زندگی میں کوئی اصل جادوگر دیکھا ہے۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کے بوڑھے دوست نے آپ سے پورا سچ بولا تھا؟"

"مجھے یقین ہے۔" اس کا لہجہ کسی قسم کے شک سے پاک تھا۔

ماہی نے الجھ کے اس کو دیکھا۔ سوٹ اور ویسٹ میں ملبوس' ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا وہ پراعتماد سا آدمی' انگوٹھے اور انگلی سے پیالی پکڑے' بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"تم نے ایئر پورٹ پہ بتایا تھا کہ تم کسی سفر پہ جا رہی تھیں۔ راستے میں تمہیں کوئی ملا۔ کوئی سایہ۔ کوئی جادوگر۔ اس نے تم پہ پھونک ماری اور....."

"یاد ہے۔" ماہی نے جلدی سے بات کاٹی۔ وہ اس تکلیف دہ قصے کو مزید لمبا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ "شاید وہ وہی سفر تھا جس میں ہم ملے تھے کیونکہ کینیڈا پہنچنے کے کچھ دن بعد میرا مس کیرج ہو گیا تھا۔"

"کیا مجھ سے ملنے سے پہلے یا بعد میں تم کسی ایسے انسان سے ملیں جو سحر کے کاموں میں ملوث ہو سکتا تھا؟"

"نہیں۔" وہ پورے وثوق سے کہہ رہی تھی۔ "میں کسی کریپی قسم کے بوڑھے آدمی سے نہیں ملی جو سر پہ نارنجی رومال باندھتا ہو۔"

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ جیسے وہ جانتا ہے کہ تم کچھ جانتی ہو۔ اسی لیے وہ تمہیں اور مجھے ملنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ تم سے ملنے لاہور آرہا تھا لیکن پھر میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ بعد میں، میں جب آیا تو ہمیں ہلال کی لاش دکھائی گئی۔ میں تم سے ملے بغیر چلا گیا۔"

"لیکن میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ بتائیں آپ کیا جانتے ہیں اس کے بارے میں؟" اس نے سینے پہ بازو لپیٹ لیے اور پیچھے ہو کے بیٹھ گئی۔ جیسے وہ قتل میں ماہر فرید کے کٹہرے میں کھڑے ہو کے تنگ آ گئی ہو۔

"میں نے اس کو ایک دفعہ دیکھا تھا۔ خواب میں۔ وہ بوڑھا ہے۔ اس کے لمبے سفید بال ہیں۔ دبلا پتلا۔ سانولا رنگ۔ نقوش ہلکے ہلکے سے یاد ہیں۔ سر پہ نارنجی رومال باندھتا ہے۔ اور....." اس نے یاد کیا۔ "ہاں..... اس کے بازو پہ....."

حور نے ایک دم زور سے رونا شروع کیا۔ اتنی زور سے جیسے کچھ کاٹ گیا ہو۔ ماہی کرنٹ کھا کے اٹھی اور پریشانی سے اسے اسٹرولر سے نکالا۔ وہ زور زور سے روئے جا رہی تھی۔

"تم سے کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے اس کو واپس کرا دوں۔" وہ بے بسی سے اب اسے کندھے سے لگائے چپ کروا رہی تھی۔ ماہر کو بھول گیا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ شاید کوئی چھوٹی تفصیل بتا رہا تھا۔ لیکن خیر۔ چھوٹی تفصیلات اہم نہیں تھیں۔

"میں واقعی ایسے کسی آدمی کو نہیں جانتی' ماہر بھائی۔ اگر کچھ یاد آیا تو ضرور بتاؤں گی۔" حور کے رلانے نے اس کی توجہ بانٹ لی تھی۔

ماہی مسکرا کے اٹھ کھڑا ہوا اور کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی جس پہ ایک میسج موصول ہوا تھا۔

"مجھے بھی کہیں پہنچنا ہے۔"

"آپ رات ڈنر پہ آئیں گے؟" حور ابھی تک روئے جا رہی تھی اور ماہی کو اونچا بولنا پڑ رہا تھا۔

"اوہ۔ آج فیملی ڈنر ہے۔" اسے یاد آیا۔ سعید کو اس ملک کے لوگوں کا کلچر بہت پسند آ گیا ہے عائلہ۔" وہ ماہی کا سوال نظر انداز کر گیا تھا۔ اسے دیر ہو رہی تھی۔ اسے کہیں پہنچنا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک متوسط طبقے کی اپارٹمنٹ بلڈنگ تھی۔ سامنے پارک بنا تھا۔ اور دوسری طرف دکانیں اور ریستوران تھے۔

سڑک کنارے ایک سفید چھت والی نیلی کار کھڑی تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا فربہی سا آدمی چپوز کا بڑا سا پیکٹ کھول رہا تھا۔ دفعتاً فرنٹ ڈور کھلا۔ آدمی کا ہاتھ فوراً جیب کی طرف گیا۔ لیکن پھر کندھے ڈھیلے ہوئے۔ برا سا منہ بنا کے ماہر کو دیکھا جو اندر بیٹھ رہا تھا۔

"اگر کوہسار چنگیز نے ہم دونوں کو ساتھ دیکھ لیا تو وہ کیا سوچے گا' ماہر بے؟"

"یہی کہ میں اپنا پیسہ تم جیسے آدمی کو اس لیے دیتا ہوں تاکہ تم مجھے پولیس اسٹیشن کے اندر ہونے والے معاملات سے باخبر رکھو۔ لیکن تم....." ناپسندیدگی سے پیکٹ کو دیکھا جس سے وہ تین انگلیوں میں بہت سے چپوز بھر کے نکال رہا تھا۔ لاپروائی سے شانے اچکائے۔

"کم از کم میں نے آپ کو بروقت اطلاع کردی۔ چنگیز بے نے ابھی تک نہیں بتایا؟"

ماہر جواب دیے بنا سوچتی نظروں سے اپارٹمنٹ بلڈنگ کو دیکھے گیا۔

"غالب نواز یہاں رہتا ہے؟"

"عمارت میں داخلے کا ایک ہی راستہ ہے۔ وہ تھانے سے سیدھا گھر آیا ہے۔ اور کل سے باہر نہیں

نکلا۔"
"وہ خوف زدہ ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ "مگر میرے دوست نے اسے رہا نہ کیا ہوتا تو ہم اس کے بارے میں مزید جان سکتے تھے۔"
"آپ کا دوست آپ کو جھوٹی گواہی کے اثرات سے بچا رہا تھا' ماہر بیٹے۔"
"اور تم؟ تم نے کیا کچھ معلوم کیا ہے اب تک؟" اس نے ناپسندیدگی سے اس آفیسر کو دیکھا جو سادہ حلیے میں بھی پہچانا جا رہا تھا۔
"پولیس ڈیوٹی میں سب سے بورنگ کام اسٹیک آؤٹ ہوتا ہے۔" وہ منہ بسور کے بتانے لگا۔ "اس کی پولیس آفیسر گرل فرینڈ ملک سے باہر ہے۔ تین دن بعد آئے گی۔ وہ دونوں جلد شادی کرنے والے ہیں۔ اور..." سسپنس بھرا وقفہ دیا۔
"اور... وہ کیٹو ڈائٹ پہ ہے۔" پھر پرجوش انداز میں سامنے ایک اسٹور کی طرف اشارہ کیا۔
"دن میں دو دفعہ اس آرگینک فوڈ اسٹور سے اس کے کیٹو لنچ باکسز اس عمارت میں ڈلیور ہوتے ہیں۔"
"اور تمہیں کیسے معلوم وہ شادی کرنے والا ہے؟"
"کیونکہ اس نے جس دن ڈائیٹ شروع کی تھی' اس سے ایک رات پہلے اس کے کریڈٹ کارڈ بل میں "اور نکائے" کے ایک فینسی ریسٹوران کے ڈنر کا بل بھی تھا۔ یقیناً اس ڈنر پہ اس نے لڑکی کو پرپوز کیا ہوگا۔ تب ہی اگلی صبح سے ڈائیٹ اسٹارٹ کی۔ آپ کے خیال میں کیٹو ڈائیٹ کام کرتی ہے؟"
ماہر فرید نے بہت ضبط سے اسے دیکھا جو کڑچ کڑچ کرکے چپس چبا رہا تھا۔
"کیا کوئی اس سے ملنے آیا ہے؟"
"ابھی تک تو نہیں۔" آفیسر نے ایک ٹیبلیٹ اسکرین کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک اپارٹمنٹ کے دروازے کے باہر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ دروازہ بند تھا۔
"شاباش۔ تم ٹی وی دیکھو۔" اس نے اس کا کندھا تھپکا اور باہر نکل گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے روک پاتا' ماہر فرید اپارٹمنٹ بلڈنگ کے اندر داخل ہو چکا تھا۔
لفٹ سے وہ مطلوبہ فلور پہ اترا تو غالب نواز کے اپارٹمنٹ کے باہر ایک ڈلیوری بوائے جھک کے لنچ باکس رکھ رہا تھا۔ ماہر ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ ڈلیوری بوائے نے گھنٹی بجائی اور خود آگے بڑھ گیا۔
دفعتاً دروازہ کھلا۔ غالب نواز نے احتیاط سے سر نکالا۔ دائیں بائیں دیکھا۔ گردن میں تعویذ کا سیاہ دھاگہ دکھائی دیا تھا۔
پھر دروازہ مکمل کھولا اور جھک کے لنچ باکس اٹھایا۔ دو بوٹ قریب آتے دکھائی دیے۔
وہ چونک کے سیدھا ہوا۔ سامنے ماہر فرید کھڑا تھا۔
اس کے ماتھے پہ بل پڑے۔
"میں تمہیں نہیں جانتا نہ میں نے تمہیں کال کی تھی۔ اگر تم مجھے یوں ہراساں کرو گے تو میں تمہارے خلاف پولیس میں شکایت کروں گا۔" غصے سے اس نے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن ماہر نے تیزی سے اپنا بوٹ درمیان میں دے دیا۔
"کیا دروازہ توڑ دو گے؟"
"توڑ دیتا اگر میری ٹانگ مکمل طور پہ صحت یاب ہو چکی ہوتی۔" وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے' بوٹ دروازے میں پھنسائے کھڑا تھا۔ بالکل پرسکون۔ آواز بھی نارمل تھی۔
"کیا چاہتے ہو؟" وہ بھی دروازہ اسی طرح پکڑے کھڑا تھا۔ ادھر ماہر بوٹ نکالے اور ادھر وہ دروازہ بند کرے۔
"تم خوف زدہ ہو۔ کیونکہ تم نے اس شہر میں ایک زندگی تعمیر کی ہے۔ لیکن تمہارا سرکار تمہیں ایسا نہیں کرنے دے گا۔" وہ مسکرایا۔
"وہ تمہیں یہ ملک چھوڑ کے کہیں گم ہو جانے کے لیے کہے گا۔ شاید کہہ چکا ہے اور اس کی اندھی عقیدت میں تم ایسا ہی کرو گے۔ لیکن کیا تم اس ملک سے دور جا کے خوش رہو گے؟"
"ایسا کچھ نہیں ہے۔"
"میں تمہیں جیل میں نہیں ڈالنا چاہتا' غالب نواز۔ میں صرف چاہتا ہوں کہ تم سچ بولو۔ مجھے صرف اس کا نام بتا دو۔ اپنی لڑائی میں خود لڑ لوں گا۔"
غالب نواز آنکھوں میں بہت سی تپش لیے اسے دیکھے گیا۔ بولا کچھ نہیں۔
"وہ ایک عام سا جادوگر ہے۔ اس کے پاس جنات ہیں' انسان نہیں۔ انسان زیادہ خوف زدہ کرنے والی مخلوق ہے۔ اس کے جنات سے ڈرنا چھوڑ دو۔ مجھے سچ بول دو۔ میں تمہیں سرکار سے بچا سکتا ہوں۔" اس نے اپنا بوٹ پیچھے کر لیا۔ اب وہ دروازہ بند کر سکتا تھا۔
"کوئی کسی کو نہیں بچا سکتا' ماہر بیٹے۔" وہ چبا چبا کے بولا اور دروازہ زور سے بند کر دیا۔ پہلے لاک لگایا۔ پھر ڈبل بولٹ۔ پھر چٹخنی۔
وہ سوگواریت سے مسکرا دیا۔
وہ جنات سے خوف زدہ تھا۔ اس نے افسوس سے سر جھٹکا اور لفٹ کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

"معید نے بہت مایوس کیا ہے' مالا۔" رامین افسوس سے کہہ رہی تھی۔ وہ دونوں واپس صوفوں پہ آن بیٹھی تھیں۔ اور چائے کے مگ ہاتھوں میں پکڑ رکھے تھے۔
"خود میرے اپنے ماموں نے ہماری امی کا حق..." اس کی زبان کو بریک لگے۔ مالا کا چہرہ دیکھ کر سنبھلی۔
"سوری۔ ہم آپ کی کہانی سننے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔"
وہ اب مزید ان کاغذوں کے بارے میں نہیں پوچھ رہی تھی جو لاؤنج کی میز پہ بکھرے ہوئے تھے۔ وہ مالا کے بتانے کی منتظر تھی۔
"کیا معید کی اس حرکت کے بعد آپ نے شادی اٹینڈ کی؟"
کشمالہ صوفے پہ پیر اوپر کیے بیٹھی تھی۔ اس سوال پہ گھٹنے کو جھکی تو ڈھیلا جوڑا کھل گیا۔
"تمہارے خیال میں مالا نے کیا کیا ہوگا؟" اس نے دونوں ہاتھوں سے بالوں کو سمیٹا اور بے رحمی سے کس کے پونی میں باندھا۔ انداز میں لگ سا تھا۔ یا اپنے لیے طنز۔

☆☆☆

کمرے کی کھڑکیوں سے باہر اترتی شام دکھائی دے رہی تھی۔ مالا پچکی ہی دستک پہ اٹھ کھڑی ہوئی جبکہ ماہی ڈھٹائی سے بیٹھی رہی۔ وہ جانتی تھی باہر کون ہوگا۔
"سوری۔" چوکھٹ میں کھڑے معید نے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔ پھر پیچھے بیٹھی ماہی کو۔
"میں نے غلط کیا بائی گاڈ۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آئی ایم سوری۔"
مالا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"میں کچھ ہی عرصے میں تم لوگوں کے حصے کی رقم تمہیں لوٹا دوں گا۔ اب تم دونوں نیچے آ جاؤ۔ پلیز میرے لیے۔ فیملی ڈنر ہے اور سب پہنچ چکے ہیں۔" آخر میں اضافہ کیا۔ "تقریباً۔"
"تمہارے خیال میں وہ سچ میں شرمندہ ہے؟" اس کے جاتے ہی ماہی شروع ہو گئی۔
"نہیں۔ اور نہ ہی وہ کبھی شرمندہ ہوگا۔ لیکن اس وقت ہمارے پاس اس کو معاف کرنے کے سوا کوئی آپشن بھی نہیں ہے۔ بہنوں کے پاس ہوتا بھی نہیں ہے۔ ان کو ساری عمر بھائیوں کی ضرورت رہتی ہے۔ سو اپنا موڈ درست کرو اور نیچے چلو۔ زیادہ کو نہیں پتا چلنا چاہیے کہ ہم بہن بھائی کے درمیان کیا چل رہا ہے۔"
ان کے ہوٹل سے ایک گلی چھوڑ کے ایک فائن ڈائن بنا تھا جس کے ایک ہال کمرے میں ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ میز پہ اونچی موم بتیاں جل رہی

تھیں۔ ایک طرف معید اور شفق ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ ماہی نے اسے دیکھتے ہی زیر لب "کم بخت پلاسٹک" کہا تھا کہ مالا نے جوتے سے اس کا پیر دبایا۔

زیاد خاموشی سے اپنی جگہ براجمان تھا۔ اسے دیکھ کے اٹھا نہیں۔ بس شکایتی انداز میں گھڑی کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "اتنی دیر لگا دی۔" دو دن کی خوش خلقی کے بعد زیاد سلطان کی ازلی خفگی اور بوریت واپس آچکی تھی۔ اس کے دل کو دھکا سا لگا۔ کیا یہ اس کی فطرت تھی یا کیرہ نانی کے جادو تھے؟

ماہی نے سب سے پہلے سربراہی کرسی پہ قبضہ جمایا۔ اب وہ یوں بیٹھی تھی کہ ایک ہاتھ پہ مالا اور زیاد تھے اور دوسرے پہ معید اور شفق۔ یہ چھے افراد کی ڈائننگ ٹیبل تھی اور ماہی کی سیدھ کی دوسری سربراہی کرسی ہنوز خالی تھی۔ معید نے کہا تھا سب پہنچ گئے تھے تقریباً۔

وہ مینو کارڈ پہ سر جھکائے ہوئے تھی جب قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اسے معلوم تھا وہ مدعو تھا۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ آجائے گا۔ نگاہ اٹھا کے دیکھا اور حلق میں کڑواہٹ گھل گئی۔

ماہر فرید سامنے سے چلا آرہا تھا۔ سفید شرٹ پہ بھوری ڈنر جیکٹ، جینز اور سفید جوگرز۔ مسکرا کے معید سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا جو اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے لگا تم نہیں آؤ گے۔" معید واقعی اس کا ممنون تھا۔

"فیملی ڈنر میں کیسے مس کر سکتا ہوں۔ بالخصوص زیاد صاحب سے ملاقات کا موقع۔" وہ خوش گوار انداز میں کہتا زیاد کی طرف پلٹا۔ کشمالہ کا سانس تک رک گیا۔ ماہر اس کا کوئی ایکس نہیں تھا جو وہ گلٹی محسوس کرتی لیکن وہ اپنے شوہر کو جانتی تھی۔ وہ رامین کے شوہر کی اس کے لیے کی گئی تعریف برداشت نہیں کر سکا تھا۔ ماہر کی موجودگی اس کو کتنا غیر آرام دہ کردے گی۔ اُف۔

اس نے فکر مندی سے زیاد کا چہرہ دیکھا۔

☆☆☆

باہر سرد رات گہری ہو رہی تھی۔ لیکن آفس میں جلتے زرد لیمپ اور ہیٹر کی گرمائش ماحول کو آرام دہ بنا رہے تھے۔ اس کا سینڈوچ ابھی تک میز پہ ان چھوا رکھا تھا۔

"اس لیے تم اس جمعے تھیرا پی پہ نہیں آئے؟ تم اس ڈنر پہ چلے گئے جہاں جانا ہی نہیں چاہتے تھے کیوں؟" وہ نوٹ پیڈ پہ کچھ لکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"مجھے غصہ تھا۔ زیاد پر، کشمالہ پر، خود اپنے آپ پر، یا شاید میں اپنے دشمن کے قریب رہنا چاہتا تھا۔" اس نے سر جھکا کے انگلیاں بالوں میں پھنسا لیں۔

"اور قریب رہ کے تمہیں کیا معلوم ہوا؟"

☆☆☆

"کیف... رائٹ؟" زیاد سلطان خوش گوار حیرت سے کھڑا ہوا۔ کشمالہ کی ساری فکر مندی ایک دم الجھن میں بدل گئی۔

"تم یہاں کیسے؟" وہ ماہر فرید کو دیکھ کے جیسے بہت حیران ہوا تھا۔

ماہر دھیرے سے ہنس دیا۔

"شکر ہے میں تمہیں یاد ہوں۔"

دونوں میں سے کسی نے مصافحے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ ماہر نے دوسری سربراہی کرسی کھینچی اور اپنے مخصوص انداز میں بیٹھا تو وہ معید اور زیاد بھی بیٹھے۔

"کیا مالا نے میرا تعارف نہیں کروایا؟" اس نے پہلی دفعہ اسے دیکھا۔

وہ بند گلے والی سبز لمبی قمیض پہنے ہوئے تھی اور ایک کندھے پہ کام دار شال تھی۔ کانوں میں جھمکے تھے۔ پکارے جانے پہ شکایتی نگاہ اٹھا کے اسے دیکھا۔

"یہ کیف نہیں، ماہر فرید ہے۔" وہ جیسے جبراً

مسکرایا۔ "یونی میں تم دونوں ایک گروپ میں تھے۔" زیاد نے کہا تھا۔

رہا تھی۔ ایک ان دیکھا سا احساس تھا جو فضا میں تناؤ پیدا کر رہا تھا۔ یا شاید یہ اسے محسوس ہو رہا تھا۔ "بتایا تھا ایک بزنس مین ہیں اور کسی وجہ سے میری بات ٹرن کرتے تھے۔"

"تمہیں یاد ہوگا میں نے کہا تھا بہت دلچسپ۔ نہیں جو نظر آتا ہے۔" زیاد محظوظ ہوا کیف وہ نہیں، مالا نے پہلو بدلا۔ زیاد کا غیر متوقع برتاؤ جیسے حیران بھی، اس کو مزید غیر آرام دہ کر رہا تھا۔ آرام دہ ہونا

"کاش میں بھی تمہارے بارے میں یہ محتمل ہو سکوں زیاد!" وہ مسکرایا تھا۔

معید اور شفق آپس میں مینیو ڈسکس کرنے لگے مالا نے بھی خود کو مکمل طور پہ مینیو کی کتاب میں گم کرلیا تھا البتہ ماہی، بغور زیاد سلطان اور ماہر فرید کے چہروں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بظاہر مسکرا رہے تھے لیکن کچھ تھا جو غلط تھا۔

"سو... کس قسم کا کاروبار ہے تمہارا؟" زیاد کے انداز میں تجسس تھا۔ ماہر کی کرسی اس کی کرسی سے اے درجے کے اینگل پہ تھی۔ وہ اس کے بالکل قریب تھا۔ پھر بھی اس نے کرسی کا رخ مزید ماہر کی طرف موڑ لیا جیسے اسے صرف اس سے بات کرنے میں دلچسپی ہو۔

"میں آرکیٹیکٹ ہوں۔" وہ بہت ضبط سے مسکرایا۔

"میں نے تمہارا انسٹا دیکھا تھا۔ شفق! بہت پیاری فیڈ تھی تمہاری۔" ماہی کھنکھاری تو سب اس طرف متوجہ ہوئے۔ مالا نے سکون کی سانس خارج کی۔ کچھ تھا اس کے اندر جو نہیں چاہتا تھا کہ زیاد اور ماہر آپس میں بات کریں۔ یا کسی بھی وجہ سے زیاد کا موڈ خراب ہو۔

"تھینک یو۔" شفق مسکرائی۔ اس کا انگریزی کا لہجہ برطانوی تھا۔

"دنیا کتنی چھوٹی ہے۔ تمہارے اور میرے فالوورز میں ایک مشترکہ دوست نکل آئی۔ مالا کی ایک کلاس فیلو۔"

شفق کی مسکراہٹ پھیکی ہوئی۔ "اچھا؟"

"اتفاق سے آج میری اس سے بات ہوئی۔ وہ مجھے بتا رہی تھی کہ تم لوگ اندرون لاہور کے علاقے کرشن نگر سے ہو۔ تمہارا بچپن وہیں گزرا ہے۔ اسکولنگ بھی وہیں ہوئی۔"

شفق کی رنگت ایسے فق ہوئی جیسے اس نے کوئی جن دیکھ لیا ہو۔ "نن نہیں... وہاں تو میرا ددھیال رہتا تھا۔ ہم تو ڈیفنس..."

"ہاں یاد آیا۔ ڈیفنس میں تم لوگ دو سال پہلے شفٹ ہوئے ہو۔ اس سے پہلے اچھرہ میں کافی سال رہے ہو۔ سائلینٹ تم ایک ایکسچینج پروگرام پہ دو بچے کے لیے گئی تھیں، مگر ایکسنٹ (لہجہ) اچھا ہے تمہارا۔" ماہی بہت معصومیت سے تعریف کر رہی تھی۔ "پتا نہیں آپ کس فرینڈ کی بات کر رہی ہیں۔" شفق نے جیسے جھرجھری لی۔

"اور وہ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ تمہارے دادا کو فوت ہوئے تین چار سال ہوگئے ہیں۔ تمہارے گھر والے تر کی پہنچ گئے یا ابھی دادا کی برسی پہ ہیں؟"

معید نے بے بسی سے ماہی کو گھورا۔ اس نے مسکرا کے شانے اچکا دیے۔

"اصل میں یہ مینیو دیکھ کے مجھے اپنا چارسدہ والا باغ یاد آرہا تھا۔"

شفق بدقت مسکرائی اور ایک دم چہرے کا رخ ماہر کی طرف موڑ دیا۔

"آپ کی کیا کہانی ہے؟ معید بتا رہے تھے کہ آپ ان کے ڈرائیور تھے۔"

ایک دم سب کی توجہ اس طرف مبذول ہوگئی۔ ماہی کے ماتھے کے بل واپس آنے لگے۔

"تھا نہیں، بنا ہوا تھا۔" معید ایک دم جیسے بہت شرمندہ ہوا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" ماہر نے بھی رخ اس کی طرف موڑا۔ اس کے انداز میں نرمی تھی۔

"فردوس شفق۔ عموماً سب مجھے شفق کہتے ہیں۔"

"میرے دادا بھی کرشن نگر سے تھے، شفق!

بہت غریب تھے۔ اندرون لاہور میں پلے بڑھے۔" وہ ٹیک لگائے ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا کہہ رہا تھا۔ "چند دہائیاں قبل وہ انگلینڈ آئے تھے اور یہاں کپڑے کا کاروبار شروع کیا تھا۔ ایک اسٹال سے۔ میرے والد نے اس اسٹال کو آگے بڑھایا۔ میرا بچپن انگلینڈ کی مارکیٹس میں کپڑا بیچتے گزرا ہے۔" وہ مسکرا کے کہہ رہا تھا۔ ایک دم ڈائننگ ٹیبل پہ سناٹا چھا گیا۔ وہ چونک کے اسے دیکھنے لگی اور وہ شفق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چہرے پہ ایک اداس سی مسکراہٹ تھی۔ وہ اس کے گال پہ ثبت زخم کا نشان دیکھ سکتی تھی۔

"پھر میرے والد نے ترقی کی۔ کیونکہ لوگ ان کا اعتبار کرتے تھے۔ ان کے پاس امانتیں رکھواتے تھے جیسے بانڈز، زیور، ان کے سچ پہ کوئی شک نہیں کر سکتا تھا۔ انہوں نے ایک اسٹال سے دکان اور دکان سے ویئر ہاؤس بنایا اور پھر ہم رئیل اسٹیٹ کے بزنس میں آگئے اور اس بزنس سے ہم نے ترقی کی۔ تین سال پہلے میں یو کے چھوڑ کے اسکول آگیا تھا۔ تب سے یہیں ہوں۔"

ٹیبل پہ سناٹا چھا گیا۔ سب خاموش تھے۔

تب ہی زیاد کھنکھارا۔

"وہ اس حصے کے بارے میں پوچھ رہی ہے جب تم دھوکہ دہی سے کشمالہ کے ڈرائیور بنے ہوئے تھے۔"

ماہر نے بے اختیار زیاد کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ بہت سادگی سے۔

"میری ایک بہن تھی۔"

شفق خود سے توجہ ہٹنے پہ خوش تھی، بہت توجہ سے بظاہر سننے لگی۔

"اس کا نام ہلال ہے۔ وہ کھو گئی تھی۔ کسی نے مجھے کہا کہ اگر میں لاہور چلا جاؤں تو شاید اسے ڈھونڈ لوں۔ مجھے ایک کور چاہیے تھا۔ سو میں ان کے گھر کا ڈرائیور بن گیا۔"

"اچھا... کیسے کھوئی تھی وہ؟" زیاد سلطان نے افسوس سے پوچھا۔ ماہر فرید نے بہت ضبط سے گہری سانس اندر کھینچی۔

"یونہی، اچانک، ایک دن وہ غائب ہو گئی۔" اس کی مسکراہٹ اب غائب ہو چکی تھی۔ وہ اس سے زیادہ مسکرانے کی اداکاری نہیں کر سکتا تھا۔

"اور اس وقت تم کہاں تھے؟" زیاد کی آنکھوں میں ایک اکساہٹ بھری مسکراہٹ تھی۔

ماہر فرید نے تھوک نگلا۔ گردن میں گلٹی سی ابھر کے معدوم ہوئی۔

"میں ذہنی امراض کے ہسپتال میں داخل تھا۔"

ایک تناؤ بھرا سناٹا سارے پہ چھا گیا۔ وہ گم سم سی ماہر کو دیکھ رہی تھی اور وہ زیاد کو۔

"یعنی تمہاری بہن اس لیے کھوئی کیونکہ... تم نے اسے اکیلا چھوڑ دیا تھا؟"

"زیاد!" مالا اتنی تیزی سے بولی کہ زیاد نے چونک کے اس کی طرف گردن موڑی۔ وہ ناراضی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ایسے مت کہو! اس کا کیا قصور؟" اس نے خود کو کہتے سنا۔

زیاد لمحے بھر کے لیے کچھ کہہ نہ سکا۔

ماہر فرید بھی اپنی جگہ ساکت رہ گیا تھا۔

"سوری میرا یہ مطلب..."

"نہیں تم درست کہہ رہے ہو۔ اس میں میرا ہی قصور تھا اور میں اس کی سزا بھگت رہا ہوں۔" وہ سنبھل کے پھیکا سا مسکرایا۔

"آئی ایم سوری۔" زیاد جیسے پشیمان ہوا۔ مالا سر جھٹک کے مینیو کارڈ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

معید کھنکھارا۔ لیکن کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ ویٹر بار بار چکر لگا رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ معید آرڈر دینے کا کہتا، زیاد پھر سے کھنکھارا۔

"کس نے اغوا کیا تھا تمہاری بہن کو؟" انداز میں تشویش تھی۔ اور آنکھوں میں مسکراتا ہوا چیلنج تھا۔

ماہر فرید کی میز پہ رکھی مٹھی بھنچ گئی۔ مالا نے پہلو بدلا جیسے یہ گفتگو اس کے اعصاب کو چھو رہی تھی۔

پہل کیے ہوئے تھی۔

"ایک جادوگر نے۔"

معید مینیو کارڈ لیے اٹھ کے کاؤنٹر تک چلا گیا۔ پہلے طے تھا کہ اسے خود ہی آرڈر کرنا تھا۔

"جادوگر؟" زیاد نے ابرو تعجب سے اٹھائے۔

"تم اس دور میں بھی جادو پہ یقین رکھتے ہو؟"

شفق قدرے متحیر نظر آئی۔ البتہ مالا نے براہِ راست زیاد کو دیکھا۔ کچھ کہنے کے لیے لب کھولے پھر بھینچ لیے۔ وہ دوسری دفعہ اپنے شوہر کے سامنے اس کی حمایت نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"ہاں۔ کیا تم نہیں رکھتے؟"

"رکھتا ہوں لیکن جادوگر لوگوں کو اغوا تو نہیں کرتے۔" اس نے جیسے جھرجھری لی۔

"جادو بہت سی اقسام کے ہوتے ہیں، زیاد بے۔" وہ ہاتھ باہم پھنسائے آگے ہوا اور غور سے زیاد کا چہرہ دیکھا۔

"سحر مرض... سحر اسود... سحر عشق..."

بہت ٹھہر کے آخری لفظ بولا۔

"سحر عشق؟" کشمالہ مبین کی آنکھوں میں ناسمجھی ابھری۔ لیکن ماہر اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ زیاد کو دیکھ رہا تھا جس کے چہرے کے اطمینان میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا تھا۔

"انٹرسٹنگ۔ سحر عشق کیا ہوتا ہے؟" زیاد نے مالا کے جیسے تعجب سے پوچھا۔ ساتھ کچھ اور بھی تھا اس کی آنکھوں میں۔ کچھ مذاق اڑاتا ہوا۔ کچھ ایسا جسے صرف ماہر سمجھ سکتا تھا۔

"جب مرد کسی عورت کو حاصل نہیں کر سکتے تو وہ اس پر سحر عشق کرتے ہیں۔ عموماً یہ وہ مرد کرتے ہیں جن کو اپنی شکل وصورت کا کمپلیکس ہوتا ہے۔ سحر عشق کے ذریعے وہ اپنی محبوبہ کو خوب صورت نظر آتے ہیں۔" وہ چبا چبا کے ایک ایک لفظ کہہ رہا تھا۔ وہ ابرو اٹھائے کیا اچنبھے سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا واقعی ایسے کوئی کسی کو اپنا سکتا ہے؟" زیاد سلطان سب سے زیادہ حیران تھا۔

"ہمیشہ کے لیے نہیں۔ کیونکہ جب سحر اترتا ہے تو اسی عورت کو وہ شخص بھیڑیا یا کسی بدشکل جانور کے روپ میں نظر آتا ہے۔" کہتے ہوئے اس نے مینیو اٹھا لیا۔ یہ طے تھا کہ وہ زیاد کے اطمینان میں ہلکا سا بھی فرق ڈالنے سے قاصر تھا۔ اس نے نہیں دیکھا کہ کشمالہ مبین یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ بے یقینی سے، بنا پلک جھپکائے۔ اس کے لب آدھے کھلے تھے جیسے کوئی مجسمہ ہو۔ معید واپس آچکا تھا اور اس نے بھیڑیے کا لفظ سن لیا تھا۔

"کیا ہم کسی اچھے موضوع پہ بات کر سکتے ہیں؟" اس نے اکتا کے استدعا کی۔

"جیسے کہ اسلام میں بہنوں کے حقوق۔" ماہر نے معصومیت سے پلکیں جھپکائیں۔

مالا نے سر جھکا۔ کوئی ٹرانس سا ٹوٹا۔ کیا وہ ماہر کو نہیں جانتی؟ وہ اس کے دماغ میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ اوہ۔

"یہ موضوع بھی کم دلچسپ نہیں تھا۔" زیاد سلطان اس موضوع کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ "میں اس جادوگر کے بارے میں سننا چاہوں گا۔"

"رئیلی؟" ماہر نے ابرو اٹھا کے سخت نظر اس پہ ڈالی۔ "کیا سننا چاہو گے؟"

"یہی کہ ایسا دلچسپ جادوگر کہاں پایا جاتا ہے؟ شاید ذہنی امراض کے ہسپتال میں۔" وہ مسکرایا۔ کچھ تھا اس کے انداز میں جو شفق نے چونک کے ماہر کو دیکھا۔ پھر ہلکا سا سٹ گئی۔ پھر معید کو سوالیہ نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو۔ "کیا یہ واقعی ذہنی مریض تھا؟"

"وہ ایک بوڑھا آدمی ہے۔ تجربہ کار جادوگر۔" وہ مینیو دیکھتے ہوئے جیسے خبریں پڑھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا زیاد اسے اکسا رہا ہے لیکن وہ اس کو کامیاب نہیں ہونے دے گا۔

"اس کی ایک کیٹر کلٹ فالوئنگ ہے۔ اس کے کلائنٹ بہت پہنچے ہوئے لوگ ہیں۔ لیکن اس کا

کوئی آستانہ نہیں ہے۔ وہ اپنے کلائنٹس کو اپنا چہرہ نہیں دکھاتا۔ اپنی شناخت خفیہ رکھتا ہے۔ سب کچھ آن لائن ہے۔ اس لیے وہ کبھی پکڑا نہیں گیا اور ہاں... وہ واقعی چھوٹے بچوں کو اغوا کرتا ہے...."

"پھر وہی کہانی۔" کشمالہ تجبر تجبری لے کر بڑبڑائی تھی۔ جیسے انداز میں افسوس ہو۔ البتہ ماہر نے سن لیا تھا۔

"کیوں کشمالہ بی بی؟ آپ کو یہ سب کہانی لگتا ہے؟" اس نے دوسری دفعہ اسے مخاطب کیا ایسے کہ مسکراہٹ غائب تھی اور چہرے پہ دبا دبا سا غصہ تھا۔

مالا نے مینیو کارڈ زور سے بند کیا اور چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں افسوس بھی تھا اور بے بسی بھرا غصہ بھی۔

"یہ جو بھی ہے، مجھے اس پہ یقین نہیں ہے۔"

"تمہیں ابھی تک جادو پہ یقین نہیں ہے یا میری بہن کے کھونے پہ؟"

"دونوں پہ ہے۔ صرف تمہاری اس کہانی پہ نہیں ہے۔ یا تو تم بے وقوف ہو یا ہمیں بنا رہے ہو۔" لمحے بھر کو میز پہ بیٹھے تمام افراد ان کے لیے غائب ہو گئے۔ صرف وہ دونوں وہاں تھے۔

"اور وہ کیسے؟"

"تم واقعی سمجھتے ہو کہ تمہاری یہ تھیوری قابل یقین ہے؟" وہ کہنیاں میز پہ جمائے پوری طرح اس کی طرف گھوم چکی تھی۔ بہت دنوں کا بہت سا غصہ ایک ساتھ نکلا تھا۔

"ایک آدمی ... تمہارا جادوگر ولن ... جس کے کلائنٹس ساری دنیا میں ہیں... جو بچوں کے اغوا کا نیٹ ورک چلا رہا ہے... اس کا کوئی آستانہ نہیں ہے؟ اس کو کبھی کسی نے نہیں دیکھا سوائے اس کے بہت قریبی لوگوں کے؟" وہ طنز اور افسوس سے کہہ رہی تھی۔ زیاد سلطان پیچھے ہو کے محظوظ سا یہ گفتگو سن رہا تھا۔

"تمہارے خیال میں کوئی جادوگر اتنا طاقتور نہیں ہو سکتا؟"

وہ اسی طرح افسوس سے اسے دیکھے گئی۔

"جانتے ہو دنیا کے سب سے بڑے کلٹ لیڈرز کی پہچان کیا ہوتی ہے؟" اب کے وہ بولی تو اس کا لہجہ دھیما تھا۔ "وہ سب نارسیسٹ مرد ہوتے ہیں جن کی انا ان کو اکساتی ہے کہ وہ اپنے گرد اپنے فالوورز اکٹھے کریں۔ ایک جادوگر جو اتنا طاقتور ہو، یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کا کوئی آستانہ نہ ہو جہاں وہ اپنے فالوورز کو اکٹھا کر کے، ان کی عقیدت دیکھ کر، اپنی ایگو کو ایندھن نہ فراہم کرتا ہو۔ مردوں کی انا ان کو گمنام لیڈر رہنے کی اجازت نہیں دیتی۔ میں نے آج تک ایسا آدمی نہیں دیکھا جو اتنا طاقت ور ہو کے بھی خود کو چھپائے رکھے۔"

کہتے ہوئے مالا نے بوتل کا ڈھکن کھولا اور اسے گلاس میں انڈیلا۔

"اس لیے یا تو تم ہمیں بے وقوف سمجھ کے ایک ہی کہانی دہراتے رہتے ہو۔ یا پھر...."

گلاس اٹھا کے شانے اچکائے۔

"تمہارا جادوگر کوئی عورت ہے۔"

ایک لمحے کے لیے میز پہ سناٹا چھا گیا۔

"کیونکہ کوئی مرد اتنا بڑا کلٹ لیڈر ہو کے گمنام نہیں رہ سکتا۔ عورت رہ سکتی ہے۔ عورت کو اتنی پذیرائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی انا جلد سیر ہو جاتی ہے۔"

زیاد سلطان کی رنگت ایسے سفید ہوئی جیسے لٹھے کی چادر ہوتی ہو۔ وہ لمحے بھر کے لیے بالکل گنگ رہ گیا۔

لیکن وہ دونوں اس کی طرف متوجہ نہ تھے۔ وہ پانی پی رہی تھی اور ماہر الجھن سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کا دماغ الجھ گیا ہو۔ پھر اس نے وثوق سے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ مرد ہے، میں جانتا ہوں۔ سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔"

مالا نے لاپروائی سے شانے اچکا دیے۔

"میں ایک کال لے لوں۔" زیاد تیزی سے بٹن دباتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے پہلے کہ کوئی موبائل تھامے وہ آگے بڑھ چکا تھا۔ اس کی رنگت فق اسے دیکھا اور جیسے دم گھٹ رہا تھا۔

وہ باہر گلی کے کنارے آ کھڑا ہوا۔ گریبان کا بٹن کھولا۔ چند گہرے سانس لیے۔ تھوڑی دیر وہیں کھڑا رہا۔ پھر ایک اسٹال کے کنارے رکا۔ وہاں تختے رکھے تھے۔ وہ استنبول کے مختلف حصوں کے تختے تھے۔ وہ ایک ایک کو کھول کے دیکھنے لگا۔ پھر ایک تختہ چنا۔ اب اس کا چہرہ بہتر تھا۔ پیسے ادا کیے اور چیک کے قلم سے اس پہ تاریخ لکھی۔

"غلط تاریخ ڈال دی آپ نے۔" آواز پہ وہ کرنٹ کھا کے پلٹا۔ پیچھے مالا کھڑی تھی۔ شال کندھوں پہ لپیٹے وہ مسکرا کے اسے دیکھ رہی تھی۔ زیاد پھیکا سا مسکرایا۔

"سوری؟"

"آپ نے آج کے بجائے آنے والے کل کی تاریخ ڈال دی ہے۔"

"اچھا سوری۔ یاد نہیں رہا۔" اس نے تیزی سے تختہ جیکٹ کی جیب میں ٹھونسا۔ "تم یہاں کیوں آ گئیں؟"

"آپ کو بلانے۔ کوئی آرڈر ہی نہیں دے رہا اور معید کا پارہ ہائی ہونے والا ہے۔ چلیں؟" وہ مسکرا کے پوچھ رہی تھی۔ زیاد پھیکا سا مسکرا دیا۔

"آئی تھنک... ہم سب کو ان کے اسٹیک ٹرائی کرنے چاہییں۔ میں سب کے لیے آرڈر کرتا ہوں۔ تم بیٹھو۔"

وہ دونوں اب ساتھ ساتھ واپس آ رہے تھے۔ ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھا ماہر فرید اب قدرے گم صم سا تھا۔ کچھ تھا جو اسے الجھا گیا تھا۔ اس نے ایک نظر ان دونوں کو ساتھ اندر آتے دیکھا اور پھر معید کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یہ طے تھا کہ اب ان تینوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کرنی تھی۔

☆☆☆

"آپ زیاد کے پیچھے کیوں گئیں؟"

رامین چہرہ دونوں ہاتھوں میں گرائے اسے دیکھ رہی تھی، جو کسی پنڈولم کی طرح دائیں بائیں چکر کاٹ رہی تھی۔

"کیونکہ میں ماہر کے ساتھ ایک میز پہ بہت آرام دہ تھی۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ ہونا چاہتی تھی لیکن یوں لگتا تھا اس روز زیاد کا ذہن کہیں اور تھا۔ اس نے نقشے پہ ایک الٹی تاریخ لکھی جو ابھی وقوع پذیر نہیں ہوئی تھی۔ کچھ تھا جو مجھے زیاد کے بارے میں کھٹک رہا تھا۔"

رامین نے ایک نظر میز پہ بکھرے کاغذوں کو دیکھا۔

"سو اس لیے آپ نے کبھی ماہر کی بات کا یقین نہیں کیا؟ کیونکہ آپ کے خیال میں اس کا جادوگر کوئی عورت ہے؟"

"نہیں یار! میں تو ویسے ہی ایک منطقی بات کہہ رہی تھی۔ مجھے ویسے ہی اس کی کسی بات کا یقین نہیں ہوتا۔" وہ جیسے چڑ گئی تھی۔

"اور پھر اس رات ایک اور واقعہ ہوا جس نے مجھے زیاد کی طرف سے کنفیوژ کر دیا۔"

☆☆☆

وہ نکاح کے فنکشن کے لیے استری کیے ہوئے کپڑے ہوٹل روم کی الماری میں ہینگ کر رہی تھی۔ سامنے کھڑکی کے ساتھ کرسی پہ بیٹھا زیاد، لیپ ٹاپ گود میں رکھے کام کر رہا تھا۔ اس کی ریڈنگ گلاسز میں اسکرین کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔

"کچھ لکھا آپ نے؟"

"تھوڑا بہت۔" اس نے نظر اٹھا کے مالا کو دیکھا۔ پھر کھلی الماری سے دکھائی دیتے اس کے کامدار جوڑے کو۔

"مجھ سے ناراض ہو کے آ رہی تھیں تم استنبول، لیکن تیاری تم نے پوری کی ہے۔" اس کے لہجے میں طنز تھا۔

وہ چند منٹ کی خوش گوار بت جو اس کے انداز میں ماہر فرید کو دیکھ کے در آئی تھیں، وہ اب عنقا ہو چکی

تھی۔ وہ پہلے جیسا زیاد بن چکا تھا۔ مالا نے افسوس سے سر جھٹکا۔ کچھ چیزیں کبھی نہیں بدل سکتیں۔ اسے اس کے ساتھ گزارا کرنا ہی ہوگا۔
وہ زیاد سے اس کے کپڑوں کا پوچھنا چاہتی تھی لیکن اس کی بات نے اتنا بدمزہ کر دیا کہ اس نے ارادہ بدل دیا۔ خود ہی ڈریسنگ روم میں آئی اور اس کا بیگ کھولا۔ اس کے کپڑے نکالے اور سیدھی ہوئی کہ...
ایک ننھا سا کاغذ کا ٹکڑا فرش پہ گرا۔ اس نے جھک کے اسے اٹھایا۔
وہ ترکش ایئر لائن کے بورڈنگ پاس کا وہ حصہ تھا جو مسافر اپنے پاس رکھتا ہے۔ اس کے مطابق زیاد سلطان کی فلائیٹ بدھ کی رات نو بجے استنبول پہنچ چکی تھی۔ لیکن زیاد نے تو اسے کہا تھا کہ وہ جمعرات کی صبح پہنچا تھا اور سیدھا اس کے پاس آیا تھا۔ بورڈنگ پاس ایک دوسری کہانی سنا رہا تھا۔
پھر وہ اس رات کہاں رہا تھا؟
"سنا ہے کل رات آپ کے ہزبینڈ بھی استنبول پہنچ چکے ہیں۔" بیریل کا کہا فقرہ ذہن میں گونجا۔
اس نے بورڈنگ پاس مٹھی میں دبا لیا اور اپنا موبائل اٹھایا۔ مالک فرید کے نام پہ اس کی انگلی رکی لیکن پھر اس نے اسکرین بجھا دی۔
اسے فضول کے واہمے نہیں پالنے تھے۔ اسے اپنے شوہر پہ بھروسا کرنا تھا۔

☆☆☆

"کیا یہ ممکن ہے کہ مالا کی تھیوری درست ہو؟" یاسمین نے سوچتے ہوئے انداز میں پوچھا تھا۔ وہ اب کاؤچ کے ایک بازو کو سرہانہ بنا کے لیٹا تھا اور دوسرے بازو پہ جوتوں کی قینچی بنا کے رکھی تھی۔ اس بات پہ نفی میں چہرہ ہلایا۔
"مجھے اپنے بوڑھے دوست پر یقین ہے۔ اس نے مجھے جس کا چہرہ دکھایا تھا وہ مرد تھا۔ وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بولے گا۔"
"جنات اتنے قابلِ اعتبار نہیں ہوتے ' ماہر! جتنا میں جانتی ہوں ' وہ مکمل سچ کبھی نہیں بولتے۔"
"وہ صرف مجھے نیچا دکھانے کے لیے کہہ رہی تھی۔" اس نے سر جھٹکا۔ وہ اب چھت کو دیکھ رہا تھا۔
"میں نے ارادہ کیا تھا کہ اگلے روز نکاح پہ نہیں جاؤں گا۔ میں ان دونوں کو ساتھ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔"
"لیکن تم گئے۔"
"لیکن میں گیا۔" اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

نکاح کا فنکشن ایک آؤٹ ڈور ایونٹ تھا۔ آج اچھی دھوپ نکلی تھی۔ سبز گھاس پہ جگہ جگہ سفید اور گلابی پھولوں کی سجاوٹ کی گئی تھی۔ بیریل اور ماہر ایک ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔
"تم نے کہا تھا ہم فنکشن پہ نہیں جائیں گے۔ پھر ہم یہاں کیوں ہیں؟" بیریل اس کے کان کے قریب کھنکھارا۔
"میری اپنی وجوہات ہیں۔"
"وہ ناٹ سو ہینڈسم ولن بھی یہاں موجود ہوگا؟" بیریل کی متلاشی نگاہیں سبزہ زار پہ بکھرے انسانوں کو دیکھ رہی تھیں۔
"وہ ہوگا لیکن کوئی ایسی لڑکی نہیں ہوگی جس کی امید پہ تم آئے ہو۔" ماہر نے جیسے تنبیہ کی۔
"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" وہ تیز چل رہا تھا۔ بیریل خفگی سے قدم اٹھاتا اس کی رفتار سے ملنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "میں سنگل ہوں اور بہت خوش ہوں۔ میں اب محبت کی تلاش میں نہیں ہوں۔"
"اچھا؟" بیریل کے برعکس اس کی متلاشی نگاہیں کسی اور کو ڈھونڈ رہی تھیں۔
"ہاں۔ میرا ارادہ ہے کہ اگلے دو سال تک میں سنگل ہی رہوں۔"
"آمین۔"

بیریل گڑبڑا گیا۔ "فرشتے "آمین" نہ کہیں۔" "اپنے نہ کہو۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔"
پھر بیریل ہو جائیں گے۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔"
اور تب ہی اسے وہ دکھائی دی۔ وہ دولہا دلہن کے پلیٹ فارم سے دور کھڑی تھی۔ کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھ رہی تھی۔ اس نے بال گھنگھریالے کر کے چہرے کے ایک طرف ڈالے ہوئے تھے۔ سفید پشواز پہ کام والی دوپٹہ کندھے پہ ڈالے کانوں میں بڑے بڑے بندے پہنے وہ بار بار استقبالیہ کو دیکھتی۔ آنکھوں میں پریشانی تھی۔ سن گلاسز ماتھے پہ تھے۔
وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہوں کا ارتکاز محسوس کر کے مالا نے اس طرف دیکھا تو اس نے چہرہ موڑ لیا ' حالانکہ وہ سن گلاسز پہنے ہوئے تھا۔ وہ اس کی آنکھیں نہیں دیکھ سکتی تھی اور اسے خوف تھا کہ کہیں وہ دیکھ نہ لے۔
سارا فنکشن اس کی توجہ کشمالہ یمین کی طرف رہی۔ اس لیے نہیں کہ وہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ بلکہ اس لیے کہ وہ بھی اسی کی منتظر تھی جس کا منتظر وہ خود تھا۔
زیاد سلطان ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔
کیک کٹنے کے بعد اس نے دیکھا ' زیاد اندر داخل ہو رہا تھا۔
"کہاں رہ گئے تھے آپ؟ اتنی دیر سے سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" وہ خفگی سے کہتی سامنے آئی۔
"تم جانتی ہو مجھے یہ گیدرنگز نہیں پسند۔ ایک دوست سے ملنے پل کی دوسری طرف چلا گیا تھا۔ ٹیکسی نے ٹریفک میں پھنسا دیا۔ شکر کرو اب بھی پہنچ گیا ہوں۔" زیاد گو دھوپ کے باعث سن گلاسز پہنے ہوئے تھا پھر بھی وہ اس کی آنکھوں کی بے زاری محسوس کر سکتی تھی۔
"کون سا دوست؟"
"کیا صرف تمہاری فیملی کے دوست ہو سکتے ہیں استنبول میں؟" اس کے انداز میں کچھ جتاتا ہوا تھا۔ مالا نے جواب نہیں دیا۔ مشرقی عورتوں کو کچھ چیزوں کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ سچ شوہر کے ساتھ بھی۔ بس وہ چاہتی تھی کسی طرح زیاد کا موڈ نہ خراب ہو۔ شکر ہے وہ اب بھی پہنچ گیا تھا۔
کھانے کے دوران زیاد، بوفے ٹیبل کے پاس کھڑا تھا جب قدموں کی آہٹ پہ دھیرے سے گردن موڑی۔ ماہر فرید سامنے کھڑا تھا۔ زیاد سلطان مسکرایا اور سن گلاسز اتارے۔ ماہر نے نہیں اتارے۔
"خوش آمدید ماہر بے۔" اس کا انداز خوش گوار ہو گیا تھا۔
"مجھے ابھی پولیس ڈیپارٹمنٹ سے فون آیا تھا۔"
"سن رہا ہوں۔" زیاد اپنی پلیٹ میں پرانز نکال رہا تھا۔
"غالب نواز آج صبح اپارٹمنٹ سے باہر آیا تھا اور سیدھا ائیرپورٹ کی طرف گیا۔ وہاں جا کے وہ ہجوم میں کھو گیا۔ لیکن ائیرپورٹ ڈیٹا کے مطابق اس نے کوئی فلائٹ نہیں لی۔"
"اور تم مجھے یہ کیوں بتا رہے ہو؟"
ماہر اس کے قریب ہوا اور آواز سرگوشی میں بدل دی۔
"کیونکہ میری تھیوری یہ ہے کہ تم اس سے ائیرپورٹ پہ ملے تھے۔ لیکن کیوں؟" رک کے جیسے سوچا۔ "شاید ایک نیا پاسپورٹ دینے کے لیے شاید پیسے بھی۔"
زیاد ہلکا سا ہنس دیا۔
"میں جانتا ہوں زیاد... کہ اسے تم نے کسی دوسرے پاسپورٹ سے اس ملک سے بھیج دیا ہے۔ عقیدت یا خوف کے ہاتھوں مجبور ہو کے اس نے اس ملک کو چھوڑ دیا ہے، جہاں وہ اپنی زندگی بنا چکا تھا۔" اس کے انداز میں ملامت تھی۔
زیاد سلطان پرانز ڈال کے اس کی طرف گھوما اور مسکرایا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو، لیکن کسی سے بات کرنا جرم نہیں ہے۔ کسی کو ایک اچھی آفر دینا بھی جرم نہیں ہے۔ ہر شخص اپنی بھلائی دیکھتا ہے۔ تمل۔" اس نے مسکرا کے شانے اچکائے۔

ماہر نے سن گلاسز اتارے۔ سورج اس کے رخ تھا۔ اس کی آنکھیں دھوپ سے چھوٹی ہو گئیں۔

"تمہاری موت میرے ہاتھوں آئے گی' زیاد سلطان!"

"نہیں ماہر بے!" وہ مسکرا رہا تھا۔ "ابھی تم میرے کام کرنے کے طریقے کو سمجھے نہیں ہو۔ میں اور کشمالہ اپنی زندگی جئیں گے اور تم اپنی بہن کی یاد میں خوشبودار موم بتیاں جلاتے رہو گے۔"

وہ کہہ کے آگے بڑھا ہی تھا کہ کسی نے اس کی کہنی تھامی۔ زیاد تیزی سے گھوما۔ لمحے بھر کے لیے وہ ساکت رہ گیا۔

کشمالہ عین سامنے کھڑی تھی۔ ابرو بھینچے دھوپ سے آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے' زیاد؟"

اس نے شاید کچھ سنا تھا' شاید نہیں۔ زیاد فیصلہ نہ کر سکا۔ لیکن ایک ہی لمحے میں وہ سنبھل گیا۔

"میں ماہر بے سے کہہ رہا تھا کہ اس کی بہن اس کی وجہ سے کھوئی ہے اور اب اس کے پاس اس کی یاد میں خوشبودار موم بتیاں جلانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔" اس کے انداز میں تلخی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ماہر کی شکل دیکھ کے بتا سکتی تھی کہ وہ کوئی خوشگوار بات نہیں کر رہے۔ اتنا کہہ کے وہ رکا نہیں' آگے بڑھ گیا۔

"سنو۔" زیاد وہاں سے ہٹا تو وہ بھی پلٹ گیا۔ تب ہی مالا نے پکارا۔

وہ تیزی سے قریب آئی۔ گھنگریالے بال ایک شانے پر تھے اور کام والی دوپٹہ دوسرے پر۔ آنکھوں میں غصہ تھا۔

"تمہارے اور زیاد کے درمیان کیا معاملہ ہے؟" وہ اس کے عین مقابل آ کے رک گئی۔ دھوپ اس کے رخ تھی۔ اس کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ آج وہ ایک طرف نہیں ہوا۔ چھاؤں بنا کھڑا رہا۔ اسے اس کی چھاؤں کی ضرورت نہ تھی۔

"مجھے نہیں معلوم تم کیا کہہ رہی ہو۔"

"تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو' مجھے ہمیشہ سے یہ لگتا تھا۔ لیکن تم دونوں اس بات کو چھپا کیوں رہے ہو' میں نہیں جانتی۔ تم برینڈ کے پاس تھے اور وہ برینڈ کا منیجر۔"

وہ چند لمحے اسے دیکھے گیا۔ پھر بے نیازی سے شانے اچکا دیے۔

"کہا نا، مجھے نہیں معلوم تم کیا کہہ رہی ہو۔"

"تم جانتے کیا ہو؟" وہ جیسے زچ ہوئی۔ ماہر نے گہری سانس لی۔

"کیا یہ ایسا ہی وقت ہے جب تم مجھے اپنی زندگی سے جانے کو کہو گی اور میں...."

"تمہیں کہیں نہیں جانا۔ میں کل جا رہی ہوں۔ اس شہر سے اور میں شاید تمہیں کبھی دوبارہ نہ دیکھوں۔" وہ تیز تیز کہہ رہی تھی۔ دھوپ سے اس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا۔

"لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ تم کچھ جانتے ہو۔ یہ اتنے دن تم بار بار میرے راستے میں اس لیے آتے تھے کیونکہ تم مجھے کچھ بتانا چاہتے تھے۔" پھر افسوس سے اسے دیکھا۔ "اس لیے میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔ تم کیا بتانا چاہتے ہو؟"

ماہر فرید نے بہت سا تھوک نگلا۔ پھر ایک نظر دور پیچھے معید کے ساتھ کھڑے زیاد کو دیکھا۔ وہ ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔

"تم زیاد کے بارے میں کچھ جانتے ہو۔ ہے نا؟" ماہر کو دیکھتی اس کی آنکھیں گلابی پڑنے لگیں۔ وہ غصے میں نہیں تھی۔ وہ خوف زدہ تھی۔

اس کی گردن خود بخود نفی میں ہل گئی۔

"مجھے کچھ نہیں کہنا۔"

"میں نے سب کچھ بھلا کے تمہیں ہلال کے لیے فون کیا تھا۔ اگر تم مجھے کچھ بتانا چاہتے ہو تو میں سن رہی ہوں۔" آنسو اس کی پلکوں پہ ٹوٹ رہے تھے۔

"نہیں۔ مجھے کچھ نہیں کہنا۔" اس نے بے بسی کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ "میں صرف اپنے بارے میں سوچتا ہوں۔ اپنے اور ہلال کے بارے میں۔ تم اور زیاد میرے ذہن میں کہیں نہیں ہو۔"

ایک آنسو کشمالہ کی آنکھ سے ٹوٹا اور گال پہ بہہ گیا۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ وہ وہاں سے پلٹ گئی۔ ایک فیملی گروپ فوٹو ہو رہا تھا۔ اس نے انگلی کی پور سے آنکھ کا کنارہ صاف کیا اور ان کے ساتھ شامل ہو گئی۔

☆☆☆

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ زیاد اور وہ ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟"

"اس نے اتنے ماہ میری نوکری کی۔ کبھی خوشبودار موم بتی نہیں جلائی۔" وہ صوفے پہ بیٹھی' گھٹنوں کو سینے سے لگائے' سر جھکائے انگلی سے صوفے پہ لکیریں بنا رہی تھی۔ "میں اس کے آفس گئی تو دیکھا وہاں جگہ جگہ سینٹڈ کینڈلز رکھی ہیں۔ مجھے تب بھی خیال نہیں آیا کہ وہ ماہر کی ہوں گی۔ پھر زیاد کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ خوشبودار موم بتیاں جلاتا ہے؟" اس نے جھرجھری لی۔ "کچھ تھا ان کے درمیان۔ کچھ ایسا جو راز تھا۔"

☆☆☆

"تم نے مالا کو سچ کیوں نہیں بتایا؟ کیا اس لیے کہ تم نے زیاد سے ڈیل کی تھی؟"

یاسمین پوچھ رہی تھی۔

ماہر دھیرے سے ہنس دیا اور لیٹے لیٹے گردن موڑ کے اسے دیکھا۔

"یاسمین خانم... کیا تم واقعی سمجھتی ہو کہ میں ایسا انسان ہوں، جو زیاد سلطان کے ساتھ کوئی ڈیل کر سکتا ہے؟"

یاسمین کے لب اوہ میں سکڑے۔

"اس رات اور کیا ہوا تھا؟ تم نے مجھے ساری بات نہیں بتائی تھی۔"

☆☆☆

کاٹیج کے باہر سرد رات میں جھیل کنارے دو ہیولے کھڑے تھے۔

"کیا تمہیں یہ ڈیل منظور ہے؟" زیاد سلطان نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

وہ چند لمحے اس کا بڑھا ہاتھ دیکھتا رہا۔ پھر ہلکا سا مسکرا دیا۔

"جو واحد ڈیل میں تمہارے ساتھ کروں گا زیاد سلطان... وہ یہ ہوگی کہ۔" وہ چند قدم قریب آیا یہاں تک کہ اس کی سرگوشی بھی زیاد کو سنائی دینے لگی۔

"کہ تمہاری موت میرے ہاتھوں سے آئے گی۔" کہہ کے وہ پیچھے ہوا۔ زیاد کا ہاتھ فضا میں گر گیا۔ چہرہ سپاٹ ہو گیا۔

"مجھے تمہارے ساتھ کوئی ڈیل نہیں کرنی۔ مجھے تصدیق چاہیے تھی' وہ مل گئی ہے۔ ہلال زندہ ہے۔ اور مجھے اس کو تلاش کرنے کے لیے تمہاری مدد نہیں چاہیے۔ میں اسے خود ڈھونڈ سکتا ہوں اور رہی کشمالہ۔۔۔"

زیاد نے تھوک نگلا۔ گردن میں گلٹی سی ابھر کے معدوم ہوئی۔

"تو بے فکر رہو۔ میں اس کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ نہ بتانے والا تھا کیونکہ مجھے تم دونوں کی اتنی سی بھی (انگلی اور انگوٹھے کے درمیان خلا بنا کے دکھایا) پروا نہیں ہے۔ مجھے صرف ہلال کو ڈھونڈنا ہے۔ میں تمہاری زندگی میں مداخلت نہیں کروں گا۔"

"اس ڈیل میں ترمیم کر لو۔" زیاد بالآخر مسکرایا۔ "تمہاری جان میرے ہاتھوں جائے گی' ماہر فرید!" کین سے ایک آخری گھونٹ بھرا' اسے جھیل کی طرف اچھالا اور پی کیپ درست کرتا وہ آگے بڑھ گیا۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

☆☆

مکمل ناول

"مس مس میں یہاں ہوں....." اس نے کچھ دیر انتظار کیا کہ کسی کی موجودگی کا احساس ہونے پر وہ چپ ہو جائے گی، چشم بیکرکے گھونٹ بھرے کہ بجز اس شاید اب نکل ہی گئی ہو گی مگر مجال ہے جو ادھر سانس لینے کا وقفہ بھی لیا گیا ہو۔ اسے چپ کرانے کے لیے مداخلت ناگزیر جانتے ہوئے ستون کے دوسری طرف کھڑے ایثار نے بولنا شروع ہی کیا تھا کہ عتاب کا رخ اس کی طرف ہو گیا۔

"مس کسے کہا؟" اس نے ریلنگ سے ہٹا کر ہاتھ کمر پر رکھا۔ اسے اس مہذب انداز تخاطب پر اعتراض تھا۔

وہ لڑاکا قطعی نہیں تھی لیکن کم بولنا یا تولنا اس کی کتاب زندگی میں نہیں تھا۔ وہ دفتر سے جلے دل کے پھپھولے پھوڑتی باہر نکلی تھی۔ اس کے پیچھے آفرین تھی جسے وہ سنا رہی تھی مگر وہ دور سے ہی ستون کے اس طرف کسی کو کھڑا دیکھ کر شرمندگی سے بچنے کی خاطر دبے پاؤں پلٹ گئی تھی اور وہ ستون کے اس طرف ریلنگ کو کسی کی گردن سمجھ کر مضبوطی سے تھامے اپنی کہے جا رہی تھی۔

"میرا نام سومہ ہے، یہ کامن پلیس ہے آپ کا آفس نہیں، آپ کو خاموشی چاہیے تو اپنے آفس میں بیٹھیں اور دو منٹ دکھی دل کی آواز سنیں گے تو کوئی پہاڑ نہیں ٹوٹے گا، کبھی کسی نے آپ کی محنت کو لات ماری ہے؟ نہیں نا تو شکر کریں اور دیکھیں مجھے....." اس نے اپنی سمت اشارہ کیا۔

"کہ بندہ کیسے تڑپتا ہے جب اس کے کام کی قدر نہ جائے تو..... کتنا گناہ ملے گا اس لات مارنے والے کو اور میری آہوں کی پہنچ بھی دیکھیے گا....." اس نے آسمان کی سمت ہاتھ اٹھایا۔

"وہ بلبلاتا ہوا گرے گا یہاں۔" اب اس کی انگلی نیچے کھلے حصے کی طرف تھی۔

"انصاف ہوگا، ضرور ہوگا، پورے دو گھنٹے لگائے تھے میں نے وہ رپورٹ تیار کرنے میں اور دو سیکنڈ بھی نہیں دیکھا اسے رد کرنے سے پہلے....."

اس کے رکنے کے آثار نہیں تھے۔ ایثار ایک گہری سانس لے کر پیچھے ہوا تا کہ وہ اسے دیکھ سکے۔ ستون کی اوٹ سے نکل کر سامنے آئے بندے کو دیکھ کر خجل ہونے کے بجائے وہ اور شیر ہو گئی، ذرا سا حیران شیر۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اب اس نے غور کیا کہ آواز تو جانی پہچانی تھی۔

"تمہیں بتانا ضروری ہے؟"

"نہیں۔" اس سوال کی نامعقولیت کا اسے بھی احساس ہوا۔

ان دونوں کو ہی دوسروں کے معاملات کی کھوج نہیں ہوتی تھی۔ کمر سے ہاتھ ہٹا کر وہ سیدھی ہوئی اور وہ ستون کی آڑ سے نکل کر پورا سامنے آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں نیلا فولڈر دیکھ کر اس نے جھپٹ کر اسے اپنی طرف کھینچا اور اوپر دھرے پرنٹ شدہ کاغذات پر نظر پڑتے ہی سارا ماجرا سمجھ میں آ گیا۔

"اوہ تو تم نئے اِدتر ہو!" ایثار نے ملامتی نظروں سے اسے گھورا۔ جتاتے انداز میں فولڈر اس کے سامنے کیا۔

"انصاف کی بات ہے تو تمہیں وہاں ہونا چاہیے تھا ذرا اوپر پہلے نیچے جہاں اس نے انگلی سے بتایا تھا، ایثار نے آنکھوں سے وہ جگہ بتائی۔

"تمہاری ایک سلی مسٹیک کی وجہ سے سارا کیلکولیشن اور رزلٹ غلط ہو گیا ہے جو وقت برباد ہوا وہ الگ، اتنا بھی نہیں معلوم تو تم کام کیسے کرتی ہو؟"

اس نے گہری سانسیں لے کر تازہ ترین دماغ کی روشنی میں صورت حال کا خیالی جائزہ لیا اور فیصلہ کر لیا۔ وہ منٹوں میں فیصلے کرنے کی عادی تھی اور اچھی بات یہ تھی کہ پچھتاتی نہیں تھی۔

"میرا زبانی استعفیٰ قبول کر لو ابھی۔" بنا طنز اور غور کے اس کا لہجہ سادہ تھا۔

"قبول کیا۔" اس نے بھی اسی انداز میں جواب دیا اور تاسف بھرا چہرہ کرتے ہوئے فولڈر پر جھک گیا۔

وہ پلٹ کر واپس دفتر میں آئی۔ آفرین جو اس کی باتیں سننے تیار تھی، اس کا پرسکون چہرہ دیکھ کر متعجب ہوئی۔

"کہاں چلیں؟ ابھی چھٹی کا ٹائم نہیں ہوا ہے۔" کے شولڈر بیگ اٹھاتا دیکھ اس نے یاد دلایا۔

"اللہ حافظ۔ میں نے ریزائن کر دیا ہے۔" وہ اسے اور باقیوں کو حیران چھوڑ کر باہر نکل گئی۔

سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے دیکھا۔ وہ دوسری منزل پر اب بھی وہیں کھڑا فون پر بات کر رہا تھا۔ گھر پر بھی ان کی بات چیت نہ کے برابر تھی حالاں کہ ان کے مکانوں کا داخلی گیٹ ایک ہی تھا۔ وہ اس کے تایا کا چھوٹا بیٹا تھا مگر ان دونوں کو ایک دوسرے کی کوئی خیر خبر نہیں رہتی تھی۔ اسے اتنا پتا تھا کہ وہ بزنس کرتا ہے، بزنس کی تفصیل نہیں جانتی تھی۔ نوکری وہ وقت گزاری اور خود کو مصروف رکھنے کے لیے کر رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی ای کامرس کمپنی تھی جو اسٹیشنری اور موبائل فون ایسیسریز آن لائن شاپنگ سائٹس پر فروخت کرتی تھی۔ ایک تین منزلہ کمرشل کمپلیکس میں آفس، دکانیں اور گودام تھے جو گھر سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ ہفتہ بھر پہلے پتا چلا تھا کہ مالک نے کمپنی کسی بڑی فرم کو بیچ دی ہے۔ عملہ تبدیل نہیں ہوا تھا۔ وہ سب عموماً گودام میں ہوتے تھے۔ جہاں آرڈرز کا حساب کتاب کرنا، انوائس پرنٹ کرنا اور انوینٹری وغیرہ کی ذمہ داری اس کے سپرد تھی۔

دفتر اسی منزل پر سامنے تھا۔ آج اس سے پچھلے دو ماہ کے آرڈرز، ریٹرنز اور واپسی کی وجوہات کا

ریکارڈ ہانگا گیا تھا۔ جو اس نے دیا لیکن ایکسل شیٹ میں کچھ غلطی کر بیٹھی۔ جب چپراسی نے اس کا کام دیکھنے کے بعد نئے آقا کا ردعمل اور دو چار جملے گوش گزار کیے تو وہ تپ اٹھی تھی۔ ایک نظر ڈالتے ہی اس نے فائل میز پر پٹخ دی تھی یہ کہتے ہوئے کہ

"کس بے وقوف نے بنایا ہے یہ جسے بیسک کا بھی علم نہیں، نوکری پر کس نے رکھا تھا اسے......" اور جانے کیا کیا۔

لیکن نئے مالک کی جگہ ابرار کو دیکھ کر اس کا غصہ ختم ہو گیا تھا۔ اسے اپنے بارے میں یقین تھا کہ باقی سب کی طرح اس کے دل میں کسی کے لیے کوئی پرخاش نہیں ہے مگر خاندان کے سارے نمونوں کے لیے اس کے پاس ایک رائے تھی، بس یہ ہی ایک انسان تھا جس کے متعلق اس کی کوئی رائے نہیں تھی اور وہ اسے کوئی رتبہ دینا چاہتی تھی۔ جیسے وہ اپنی بہنوں سے الگ تھی، ایسے ہی وہ بھی تایا ابو کے گھر میں سب سے مختلف تھا۔

انسانوں کا رویہ ان کی سوچ، یقین اور فلسفے کا عکاس ہوتا ہے اور اسے لگتا تھا جیسے وہ اس معاملے میں گھر کے باقی لوگوں سے مختلف ہے شاید وہ بھی ایسا ہی تھا کہ وہ سب کی طرح طنز، تمسخر والی کڑوی کسیلی باتیں نہیں کرتا تھا بلکہ وہ تو کسی سے بات ہی نہیں کرتا تھا۔ اسے ذہنی طور پر تھکانے والوں کی ایک لمبی فہرست تھی۔ مزید ایک اور اس میں شامل نہ ہو، یہ اچھا ہی تھا۔

گھر میں ان کا سامنا بھی کبھار ہوتا تھا اور بات تو نہ ہونے کے برابر، اس لیے اس نے اس سے بار بار ملاقات اور مکالمات کے امکانات ختم کر دیے تھے اور تقدیر اس کی اس دانائی پر بڑے پیار سے مسکرائی تھی کہ اس نادان کے لیے تو اس نے کچھ اور سوچ رکھا تھا۔

☆☆☆

"ممی! اس نے پھر جاب چھوڑ دی۔" عمارہ نے اونچی آواز میں ماں کو اطلاع دی۔

"ایسے اچانک؟" وہ باہر سے دھلے کپڑوں کا ڈھیر لیے اندر آئی تھیں۔

"بس دل بھر گیا تھا ممی۔" اس نے اپنا جواب دے کر بات ختم کی۔

"ذرا بھی مستقل مزاجی نہیں تمہارے اندر سومہ۔" اگلا جملہ اسے پتا تھا۔

"عمارہ کو دیکھو، پچھلے دو سال سے ایک جگہ جاب کر رہی ہے۔" وہ کپڑوں کے ڈھیر سے اپنے کپڑے الگ کرنے لگی تھی۔

"اب یا تو جاب کرو ہی مت اور اگر کرنا ہے تو سنجیدگی سے کرو۔"

"ممی! عمارہ اور مجھ میں فرق ہے، میں شوقیہ ٹائم پاس کے لیے آفس جاتی ہوں، اسی لیے جب دل بھر جائے تو چھوڑ دیتی ہوں، مجھے نیند آ رہی ہے۔" جواب دے کر وہ اپنے کپڑے لیے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"کیا ہو گا اس لڑکی کا؟" تکرار یار کا سنا جملہ پھر اس کے کانوں میں پڑا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ صرف جملہ ہے، حقیقی فکر اور تشویش سے خالی جملہ۔

وہ اکثر سوچتی تھی کہ کیا وہ پیدائشی طور پر سب سے الگ مزاج لے کر آئی تھی، یا والدین میں سے کسی کے قریب نہیں تھی اس لیے ان کی سوچ کے اثرات اس پر نہیں پڑے تھے۔ عمارہ پہلی اولاد تھی اس لیے ماں باپ کو سب سے زیادہ عزیز اور لاڈلی تھی۔ پھر اسے اپنی اہمیت اور بات منوانے کا فن بھی خوب آتا تھا۔ نازیہ چھوٹی ہونے کی وجہ سے بے حد لاڈلی تھی۔

وہ درمیانی تھی اور اس کے حصے میں توجہ اور محبت بھی درمیانی آئی تھی۔ اسے ضد کرنا اور لاڈ اٹھوانا بھی کبھی نہیں آیا لیکن اس نے والدین کے برتاؤ کے فرق کو چپ چاپ برداشت بھی نہیں کیا تھا۔ وہ سب باہر نکال دیا کرتی تھی۔ وہ باتونی مشہور تھی۔ صاعقہ اور دونوں بیٹیاں ہم مزاج تھیں شاید اس لیے وہ ایک دوسرے کے قریب تھیں۔ جب کہ اس کا مزاج گھر میں کسی سے نہیں ملتا تھا۔

صاعقہ اور اصغر بیگ نے گھر والوں کی مرضی کے خلاف شادی کی تھی۔ دادا ابا اس رشتے کے لیے انکار کر چکے تھے اور صاعقہ کے والدین کو بھی لڑکی کی

شادی میں دلچسپی نہیں تھی۔ چوں کہ پہلے کی شادی دیکھنے کے بعد دادی دارِ فانی سے کوچ کر گئی تھیں اس لیے ادھر دادا ابا نے اپنی ذمہ داری سمجھ کر بڑی بہو اور دونوں بیٹیوں کے ساتھ لڑکی دیکھ کر ان کا رشتہ طے کر دیا اور ادھر انہوں نے چپکے سے عدالت سے نکاح کر لیا۔

جب شادی کی تاریخ طے کرنے کی باتیں ہونے لگیں تو انہوں نے اپنا کارنامہ مع ثبوت ان کے حضور پیش کر دیا۔ اس وقت جوانی کا جوش تھا اور محبت کا بھوت سوار تھا کہ وہ کسی کی سننے کو تیار تھے نہ پیچھے ہٹے۔ خاندان میں اور باہر یہ بات نہ پھیلے اور بدنامی نہ ہو، اس سے بچنے اور عزت رکھنے کی خاطر دادا ابا دنیا کے سامنے دھوم دھام سے صاعقہ کو بیاہ کر گھر لے آئے۔ دونوں کے گھر والوں نے خود کو رسوائی سے اور حالات مزید بگڑنے سے تو بچا لیے لیکن اس رشتے کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔

بچوں کے مرضی سے کیے فیصلے درست نکلیں یا اپنی مرضی کرنے کے بعد خوش رہیں تو اکثر والدین کے دل پگھل جاتے ہیں، ان کی ناراضی ختم ہونے لگتی ہے۔ صاعقہ بھی اپنے الگ گھر میں شوہر کے ساتھ رہتیں۔ انہیں جو چاہیے تھا وہ مل گیا تھا، من پسند شوہر کے ساتھ الگ گھر جہاں ساس سسر اور نندوں کا کوئی جھنجھٹ نہیں تھا۔

اصغر بیگ نیک، شریف اور ذمہ دار مرد تھے۔ والدین کا سب سے بڑا خدشہ یہی ہوتا ہے کہ لڑکی کو والدین کے خلاف جا کر شادی پر مجبور کرنے والا لڑکا اوباش اور بدمعاش ہوتا ہے، وہ اسے استعمال کر کے پھینک دیتا ہے۔ یہاں ان کے یہ خدشات غلط ثابت ہوئے تھے اس لیے آہستہ آہستہ صاعقہ کے تعلقات اپنے والدین سے چند برسوں بعد بحال ہو گئے اور بیٹیوں کی پیدائش کے بعد تو خوش گوار بھی مگر دادا ابا کچھ بھولے نہ تھے۔ انہوں نے ان دونوں کو معاف کیا تھا بلکہ اب ان کے لیے بھی وہ اکردہ گناہ کے مجرم تھے۔

ایک ہی مکان میں دو الگ حصے تھے۔ دنیا کے لیے بظاہر سب ٹھیک تھا لیکن کچھ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ چند سالوں بعد اصغر بیگ کو اپنی غلطی کا احساس کچوکے لگانے لگا تھا۔ صاعقہ کو اپنے والدین کے ساتھ ہنستا مسکراتا دیکھ کر انہیں باپ کی ناراضی بہت کھلنے لگی تھی۔ انہیں لگتا کہ ان کا پہنچایا دکھ اور تکلیف اتنی شدید ہے کہ وہ آج تک اسے بھولے ہیں نہ انہیں معاف کیا ہے۔

باپ کی لاتعلقی اور سرد رویہ ہر دن ان کے ملال اور پچھتاوے کو بڑھاتا گیا اور دھیرے دھیرے بڑے غیر محسوس طریقے سے یہ پچھتاوا باپ کو منانے اور انہیں خوش کرنے کے جنون میں ڈھل گیا اور بیوی بچے بہت پیچھے چھوٹ گئے۔

اس نے جب سے ہوش سنبھالا ماں باپ کو پیار محبت کے مظاہروں سے زیادہ الجھتے دیکھا تھا۔ سمجھ داری آتے آتے ہر بار الجھنے کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی کہ ابو پسند سے شادی کرنے اور محبوبہ کو حاصل کر لینے کے بعد اب سارا وقت روٹھے اور ناخوش والد کو راضی اور خوش رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور اس کوشش میں انہوں نے بیوی بچوں کی خوشی اور خواہشوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔

ان پر اب محبت نہیں بلکہ باپ کو دکھی اور خفا کرنے کا پچھتاوا حاوی تھا اور دادا ابا بھی گن گن کر اور تاک تاک کر چھوٹی بہو اور اس کے بچوں سے بدلے لیتے تھے۔

ادھر کسی کی سالگرہ ہو، صاعقہ کے میکے کی کوئی دعوت یا محفل، بچوں کی کوئی ضروری تقریب، وہ انہیں کسی کام میں الجھا دیتے یا خوا مخواہ اپنے پاس دیر تک بٹھائے رکھتے یا انہیں اسی وقت لے کر کسی ضروری کام سے نکل جاتے۔ ان کا ایک ہی مقصد ہوتا تھا کہ بیٹے کو زیادہ سے زیادہ بیوی بچوں سے دور رکھا جائے۔ وہ یہ جتاتے تھے کہ باپ اصغر بیگ کے لیے سب سے اول اور اہم ہے۔

ان کے حصے میں انہوں نے آج تک قدم نہیں رکھا تھا، اصغر بیگ ہی ان سے ملنے ادھر جاتے تھے۔ غرض اس معاملے میں وہ ضمنی اور چالاک عورتوں کو

بھی مات دیتے تھے۔

اصغر بیگ کے لیے اب باپ کو انکار کرنا گناہِ عظیم تھا۔ اس کے بعد جب وہ اپنے حصے میں آتے تو بیوی بچے سب منہ پھلائے اور غصے سے بھرے ہوتے۔

صاعقہ کو پہلے ہی سسرال سے کوئی لگاؤ نہیں تھا مگر سسر کے رویے اور شوہر کی اس عادت نے بے ضرر لاتعلقی اور سرد مہری کو نفرت اور برائی میں بدل دیا۔ کسی کی خوشی غمی سے سروکار نہ رکھنا اور کسی کی خوشی نہ چاہنا، اس کے غم پر سکون محسوس کرنا، دونوں غلط کی مگر بہت مختلف مزاج اور رویے ہیں۔

دادا ابا کا رویہ بچوں کے ساتھ بھی روکھا، حاکمانہ اور اکثر تحقیر بھرا ہوتا تھا۔ انہیں وہ کبھی نام سے نہیں پکارتے تھے۔ تینوں پوتیوں کو ہمیشہ اے لڑکی! کہہ کر مخاطب کرتے۔ ان تینوں نے دادا ابا کا مشفق اور نرم روپ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کے مقابلے میں انہیں بڑی بہو، بیٹا اور ان کے بچے بہت عزیز تھے۔ بڑی بہو ان کی پسند تھی جسے بیٹے نے قبول کیا تھا اور اس بہو نے انہیں دو پوتوں سے بھی نوازا تھا۔ ان کے خاص موقعے خوب دھوم سے اور بڑے پیمانے پر منائے جاتے تھے۔

وہ ان سے زیادہ بے تکلف تھے، دیگر معاملات میں بھی وہ دونوں بیٹوں کے بچوں سے واضح اور جتاتا فرق روا رکھتے تھے۔ دونوں بیٹیوں یعنی سومہ کی پھوپھیوں کا رویہ بھی باپ کے مطابق تھا۔ بڑے بھائی بھابھی زیادہ قریب اور پیارے تھے، انہیں ساری رعایتیں اور سہولتیں حاصل تھیں مگر چھوٹے بھائی کے خاندان کے لیے ہر معاملے میں تنگی تھی، محبت، سہولت، رعایت سب میں۔

لیکن بڑی بہو یعنی الفت کے لیے حالات اس وقت بدلے جب ایسی ہی کہانی ذرا سی انفرادیت کے ساتھ ان کے بڑے بیٹے نے دہرائی۔ نثار نے ماں کی منتخب کردہ خالہ زاد کو ٹھکرا کر اپنی پھوپھی زاد کو پسند کر لیا تھا بلکہ یہ محبت کی کہانی کئی سالوں سے جاری تھی۔ شوہر اور بیٹے کے حامی تھے۔

انہیں دل پر پتھر رکھ کر نند کی بیٹی کو بہو بنانا پڑا۔ اب وہ روایتی ساس تھیں جسے بہو کے روپ میں بیٹے کو ان سے دور کرنے کی سازش نظر آتی تھیں اور یہ یقین بھی کہ نند اور اس کی بیٹی نے سازش کر کے ان کے بھولے معصوم بیٹے کو پھنسایا تھا۔ ساتھ ہی ڈھیروں شکوے بیٹے سے بھی تھے جب کہ دادا ابا کو اپنی نواسی پوتوں سے بھی زیادہ عزیز تھی۔

شام میں دفتر سے واپسی پر اصغر بیگ معمول کی طرح دادا ابا کے پاس رکے تھے۔ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ بعد ادھر آتے تھے۔ آج کچھ زیادہ دیر ہو گئی تھی اور اس وقت اپنے بند کمرے میں بھی اسے ماں باپ کی بحث سنائی دے رہی تھی جس میں کچھ نیا نہیں تھا۔ اب تو لگے جملے کیا ہوں گے اسے یہ بھی ازبر ہو گیا تھا۔

بچپن سے یہ سب ایسے ہی چل رہا تھا۔ ہاں کی بات یہ ہوئی تھی کہ اب کبھی کبھار عمارہ اور مازیہ اگر اس وقت موجود ہوتیں تو وہ بھی بحث اور لڑائی میں کود پڑتی تھیں۔ ان کی زبان سے بھی دادا ابا اور ادھر والوں کے لیے پھول نہیں جھڑتے تھے بلکہ ماں کی طرح کانٹوں جیسے نوکیلے الفاظ ہی تیر سے نکلتے تھے۔

اس بات پر اصغر بیگ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا سب کی مخالفت کے بعد اتنی مشکلوں سے وہ ساتھ تھے تو جتنا وقت میسر تھا اسے ہنسی خوشی کیوں نہیں گزارتے تھے۔

صاعقہ اور ان کی دونوں بیٹیوں کی ناپسندیدگی اور اختلاف نفرت کی حد کو اس وقت چھونے لگا جب عمارہ کی شادی کا ذکر چھڑا۔

عمارہ کے لیے اس کے ساتھ دفتر میں کام کرنے والے یامین کا رشتہ آیا تھا جس میں عمارہ کی مرضی اور پسند بھی شامل تھی۔ اصغر بیگ نے بیوی کے منع کرنے کے بعد بھی یہ بات والد کو بتا دی۔ ایک حکم عدولی اور نافرمانی کے بدلے انہوں نے ذہنی طور پر ان کی عمر بھر کی غلامی قبول کر لی تھی۔ انہوں نے خوب ناراضی اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس میں

...دی زیست کی کمی اور والدین کا بچوں کے لیے ...قدم چھوڑنے جیسے الزام بھی تھے۔

...اس وقت ہوئی جب عمارہ نے دادا ابا کے ...سلوک کی شکایت کر دی کہ لبنیٰ کی پسند ...امتیازی ...ہے تو اس کی کیوں نہیں۔

...بس اس دن سے حالات بدترین ہو گئے اور اصغر ...کو منانے میں حدیں جھکتے گئے۔ رشتے کی بات ...تک پہنچی نہیں تھی، درمیان میں ہی رہ گئی تھی ...صاعقہ اور مازیہ کے نزدیک یہ رشتہ طے تھا۔ ...تھا عمارہ کی شادی وہیں ہو گی۔ ضد اور من ...دادا ابا کے ہم پلہ ہو گئی۔

...میں ...رات کھانے کی میز پر الفت کا دبا دبا غصہ ...باہر آ رہا تھا کہ لبنیٰ اور نثار لبنیٰ کی بہنوں کی ...میں گئے تھے۔

"آپ ایک بار فون بھی کر لیں، کب تک ...گے؟" انہوں نے شوہر سے کہا۔

"آ جائیں گے، بچے نہیں ہیں وہ چھوٹے۔"

"تو بڑوں جیسی ذمہ داری کا مظاہرہ بھی تو ...صبح دفتر جانا ہے، جانتے ہیں نا پھر کیسے بھاگم ...بھاگ ہوتی ہے صبح۔"

"آ جائیں گے بہو۔" دادا ابا نے گویا بات ختم ...کی طرف سے پوتوں کو مکمل آزادی تھی۔ وہ ...ان سے باز پرس نہیں کرتے تھے اور دوسرے ...انہیں یہ بھی پسند نہیں تھا۔ اب تک الفت کو ...یہ عادت بہت اچھی لگتی تھی لیکن بہو کے آنے ...کے بعد اچھی نہیں رہی تھی۔

"اشرف تم نے غضنفر علی سے بات کی؟" ...نے بیٹے سے سوال کیا۔

"جی ابا، اس جمعہ کا وقت دیا ہے انہیں۔" ...کے ہونے والے سسر تھے۔ جمعہ کی یہ ...شادی کی تاریخ طے کرنے کے لیے تھی۔

☆☆☆

...کے درمیان منقش لکڑی کا تختہ لگا تھا جو دو ...کم کرتا تھا اور احاطے میں چھوٹی سی کیاری

تھی۔ جس میں گل دوپہری اور اس جیسے چھوٹے پودے لگے تھے۔ آنے جانے کے لیے اس کیاری کو پھلانگنا پڑتا تھا۔ ان کے یہاں اصغر بیگ کی اسکوٹی تھی اور ایک سیکنڈ ہینڈ کار جو کبھی کبھار ہی باہر نکلتی تھی لیکن اس طرف دو بائیک اور دو کاریں تھیں اور تینوں روز استعمال ہوتی تھیں۔ وہ کیاری میں پانی ڈال رہی تھی جب الفت نے اسے دیکھا۔

"کام پر نہیں گئیں آج؟" وہ خود سے اسے ہی کبھی کبھار مخاطب کر لیتی تھیں۔ عمارہ اور مازیہ کے ساتھ سلام کے جواب کے علاوہ بس نظروں کے تبادلے ہوتے تھے۔

"نہیں۔"

کیوں؟ طبیعت تو ٹھیک لگ رہی ہے۔

جاب چھوڑ دی۔؟" انہوں نے ملامتی نظروں سے دیکھتے ہوئے تاسف سے سر ہلایا۔

"تو ذرا مستقل مزاجی نہیں ہے تم میں۔" اس کے متعلق دونوں طرف اتفاق تھا۔

"میں شوقیہ کام کر رہی تھی تائی امی! دل بھر گیا، شوق پورا ہو گیا تو چھوڑ دی۔"

"میں جا رہا ہوں امی۔" تب ہی ایثار باہر آیا۔

"اب یہ نہ منہ کھول دے اس بارے میں۔"

اس نے سوچا۔

"اس نے پھر نوکری چھوڑ دی ہے، تم دیکھو کہیں کام ہو گا تو اس کے لیے۔" انہیں بازو والوں پر احسان جتانا پسند تھا۔

"نہیں تائی امی!" اس نے تیزی سے کہا۔

"فی الحال میرا موڈ نہیں جاب کا۔"

"بھلائی کا زمانہ ہی نہیں ہے۔" انہیں سیدھے یہ پیشکش ٹھکرانا اچھا نہیں لگا۔ کم از کم اسے مروتاً شکریہ ادا کرتے ہوئے معذرت کرنی چاہیے تھی کہ اسے جاب کی ضرورت نہیں۔

ایثار نے اس پر ایک نظر ڈالی اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

تائی امی اب فخریہ انداز میں بیٹے کی کامیابی

اور نئے بزنس کے متعلق اسے باخبر کر رہی تھیں۔ مقصد اندر تک ستانا تھا۔ بیٹوں کی ماں ہونے پر ان کی گردن ہمیشہ تنی رہتی تھی۔

عمارہ سے پہلے پھوپھو کی بیٹی شہوانہ پہلی لڑکی تھی جس نے نوکری کی تھی۔ وہ ایک اسکول میں پڑھاتی تھی۔ دادا ابا اور باقی سب کے نزدیک لڑکیوں کے لیے یہ واحد عزت دار نوکری تھی۔ عمارہ کی کارپوریٹ جاب ان کے نزدیک اتنی قابل احترام نہ تھی اور اس کے انواع قسم کے کام تو کسی گنتی میں ہی نہیں تھے۔

☆☆☆

جلد ہی ایثار کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ تیاریاں دونوں طرف شروع تھیں کہ مقابلہ آرائی کا زمانہ ہے۔ اسے ایک ہی کام بڑا اچھا لگتا تھا جو خوب دل لگا کر کرتی بھی تھی اور وہ تھا سجنا سنورنا۔ ہر تقریب کے لیے وہ بڑے ذوق شوق سے خریداریاں کر رہی تھی۔

ایثار نے خاندان میں اور کزنز سے شادی سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے یہ عمل ایک شرط دیکھی تھی۔ الفت نے اس کے لیے اپنی بھانجی دیکھ بھی رکھی تھی کے بعد نہیں بیٹے کا یہ فیصلہ اچھا ہی لگا۔ گھر والوں کے رویے اور ماحول دیکھ کر ایثار کا مزاج یہ بن گیا تھا کہ وہ کسی سے الجھتا نہیں تھا نہ ایسا کوئی کام یا بات کرتا تھا کہ کچھ الجھے۔ وہ اختلاف اور بحث سے دور رہتا تھا۔ اس کا رشتہ خوب تلاش بسیار کے بعد خاندان کے باہر ہانیہ سے طے ہوا تھا۔

مہندی والے دن خوب گہما گہمی تھی۔ سب اپنی تیاریوں میں لگے تھے اور کسی کو اپنے اقدام کے نتیجے کا انتظار تھا۔

"آج تو ہم مہندی لگوا لیتے تو اچھا تھا۔" چوڑیاں پہنتے ہوئے اس نے ایک بار پھر کہا۔ عمارہ اور مازیہ نے آج اس کے ساتھ پارلر جانے سے منع کر دیا تھا۔

مازیہ کو اپنا ولیمے کا جوڑا اب اچھا نہیں لگ رہا تھا سو ان دونوں نے آج دن بھر کی خواری کے بعد نیا لباس خریدا تھا۔

"ابھی گھر میں ہی کوئی مل جائے گا، اس سے لگوا لیں گے۔" عمارہ نے مہارت سے لائنر لگاتے ہوئے کہا۔

"نہ۔ مجھے پارلر والی آنٹی سے ہی لگوانا ہے، سب سے اچھی لگاتی ہیں۔" چوڑیاں پہننے کے بعد اس نے لپ اسٹک اٹھائی اور عمارہ کے پیچھے جا کر اس کے شیشے کے سامنے سے ہٹنے کا انتظار کرنے لگی۔

"تم کم سے کم لپ اسٹک ہی لگا لو۔" مازیہ کا میک اپ سے بیر تھا۔

"لپ بام لگا لوں گی۔"

"عمارہ! ذرا چلو میرے ساتھ۔" تب ہی کچھ پرجوش اور گھبرائی سی صاعقہ اندر آ گئیں۔

"کیا ہوا؟" وہ تینوں ماں کی طرف دیکھنے لگیں۔

"وہی بتا کرنا ہے، آؤ۔" انہوں نے آگے بڑھ کر عمارہ کا ہاتھ تھاما اور اسے لے کر باہر چلی گئیں۔ مازیہ بھی پیچھے بھاگی۔ جب کہ وہ اطمینان سے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر لپ اسٹک لگانے لگی۔

"اس گھر میں کوئی کام ڈھنگ سے پورا ہو ہی نہیں سکتا۔" اس نے سوچا۔ ڈارک ریڈ لپ اسٹک لگا کر اس نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور سینڈل پہن کر وہ بھی اسی کی طرف آ گئی۔

وہاں خواتین اور لڑکیاں مختلف گروہ بنائے جوڑے سرگوشیوں میں مصروف تھیں۔ کوئی مرد نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بند دروازے کے شیشے سے ہال میں جھانکا۔ وہاں موجود سارے چہروں پر تشویش اور غصہ تھا۔

"دادا ابا کو اب کس نے ناراض کر دیا؟" اس نے دروازے سے دور ہٹتے ہوئے سوچا۔ اس نے ایسے کچھ نظارے نثار بھائی کی شادی میں دیکھے تھے۔ کچھ دیر سن گن لینے کی ناکام کوشش کے بعد وہ اپنے حصے میں آ گئی۔ خالی گھر میں جی بھر کے سیلفیاں لے کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ مازیہ اور چھوٹی پھوپھو فردوس آ گئیں۔ اس کے پوچھنے سے پہلے ہی مازیہ بول پڑی۔

"کچھ پتا بھی ہے؟ ہانیہ نے شادی سے انکار کر دیا تھا، کسی نے اس کی بات سنی نہیں تو اس نے آج خودکشی کی کوشش کی ہے......"

"ہیں!"

"ہاں۔ گولیاں کھا لیں اس نے، ابھی ہاسپٹل میں ہے۔ اس کے چاچا نے روتے ہوئے تایا ابا کو فون کیا تھا، بہت معافی مانگی اور شادی سے معذرت کر لی اور اب دادا ابا کا غصہ نہ پوچھو...... وہ تایا ابا پر بھی اتنا ہی چیخ چلا رہے ہیں جتنا ان کا دل اس وقت ہانیہ کے باپ پر چلانے کا کر رہا ہوگا...... توبہ!" اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"بے چارہ ایثار۔" اس نے تاسف سے سوچا۔ اسے اس کے لیے واقعی افسوس ہوا تھا۔

"ایسا بھی ہوا! اتنی تیاری کی میں نے۔" وہ ڈھیلی پڑ گئی۔

"لیکن یہ سراسر غلط بات ہے، عین نکاح سے ایک دن پہلے ایسی حرکت نہیں کرنا چاہیے تھی، ایسی دھمکیوں سے روکنا ہی تھا تو یہ کام پہلے بھی تو ہو سکتا تھا۔ اب تک کیا وہ سو رہی تھی۔"

"بے چاری اس وقت ہاسپٹل میں ہے اور آپ اسے باتیں سنا رہی ہیں؟" مازیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"یہ بکھیڑا اسی نے کھڑا کیا ہے اور وقت بہت تھوڑا رہ گیا۔ چار مہینے سے تو انگیجمنٹ تھی ان کی، چلو مان لیا تب کسی نے اس کی بات نہ سنی مگر وہ یہی کام جب تاریخ پکی ہوئی اس دن کر لیتی یا اس کے چند دن بعد۔ اب تو اس نے تایا ابا کو ہی نہیں اپنے گھر والوں کو اس سے بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔" اسے ذرہ برابر ہمدردی نہیں تھی۔

"حد کرتی ہیں آپ آپی! بے چاری مرتے مرتے بچی ہے اور......"

"دیکھو!" اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ "انسان کا پکا ارادہ ہو تو وہ ہر حال میں پورا ہوتا ہے۔ مرنا اتنا آسان نہیں، جو بدبخت خودکشی کو چنتے ہیں، وہ کسی نہ کسی نفسیاتی الجھن میں گھرے ہوتے ہیں اور تم نے ہانیہ اور اس کی فیملی کو دیکھا تو ہے وہ لوگ نہ تنگ نظر اور دقیانوسی خیالات والے ہیں نہ ہانیہ اتنی دبو، کمزور، جذباتی اور بے وقوف کہ اپنی بات طریقے سے منوا نہ سکے اور شادی سے بچنے کے لیے موت کو گلے لگا لے، اس لیے مجھے یہ دھمکی اور بہانہ ہی لگ رہا ہے کہ لاسٹ مومنٹ پر اس کا ارادہ بدل گیا یا اسے کوئی اور پسند آ گیا۔"

مازیہ نے تاسف اور بے بسی سے سر ہلایا۔

"آپ جیسے بے حس لوگ ہی دوسروں کو موت کے منہ کی طرف دھکا دیتے ہیں۔" اس کی ہمدردیاں ہانیہ کے ساتھ تھیں۔

"ہیں؟" اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"لیکن میری میں حقیقت بیان کر رہی ہوں، عقل استعمال کی ہے تمہاری طرح ایموشنل اور جذباتی نہیں ہو رہی حالاں کہ ہونا چاہیے۔ میری ساری تیاری دھری رہ گئی۔" اس نے سینڈل نکال کر پرے کیے۔

اور پھر جلد ہی اس کے ایموشنل اور جذباتی ہونے کا وقت بھی آ گیا۔

دادا ابا اس ہزیمت کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے حکم دیا کہ نکاح کل ہی ہوگا اور اصغر بیگ کی بیٹی سے ہوگا۔ اصغر بیگ بھاگے بھاگے بیوی اور بیٹی کے پاس آئے۔ عمارہ نے سنتے ہی انکار کر دیا۔ اس نے ماں باپ کے ساتھ وہی کارڈ استعمال کیا جس کا ہر لو میرج کرنے والے والدین کو ڈر ہوتا ہے۔

"اگر آپ سب نے زبردستی کی تو میں بھی وہی کروں گی جو ہانیہ نے کیا۔"

اس دھمکی کے بعد صاعقہ اور اصغر ہاتھ باندھے سر جھکائے دادا ابا کے حضور مجرم بنے کھڑے تھے۔

دادا ابا نے بیٹا بہو پر قہر آلود نظر ڈالی اور اتنے افراد کی موجودگی میں خود کو لفظی اظہار خیال سے روکا۔

"تمہیں بھی کوئی پسند ہے؟" اچانک انہوں نے پیچھے کھڑی سومہ سے پوچھا جو والدین کے پیچھے

وہاں پہنچی تھی۔ وہ مڑ کے پیچھے دیکھنے لگی کہ کس سے سوال کیا ہے۔ پیچھے دیوار تھی، اس نے سامنے دادا ابا کو دیکھا۔

"تم سے پوچھ رہا ہوں۔" ان کی آواز اور لہجہ غضب ناک تھا۔ اس نے زبان تک آچکے 'کیوں؟' کو بمشکل روکا۔

"ابا!" اصغر بیگ سامنے آئے۔ وہ باپ کا مدعا جان گئے تھے بلکہ مان بھی گئے تھے۔

"میں اندر جا کر سومہ سے بات کرتا ہوں۔ جیسا آپ چاہ رہے ہیں، ویسا ہی ہوگا۔"

"ابو!" بات سمجھتے ہی اس نے دھیمی آواز میں احتجاج شروع کرنا چاہا کہ صاعقہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے ہال کے دروازے کی سمت بڑھیں۔ دروازے سے باہر نکلنے سے پہلے اس نے مڑ کر ایثار کو دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے تیزی سے انکار میں سر ہلا کر اسے کچھ بھی نہ کرنے کا پیغام دیا۔

"مجھے یہاں کیوں لے آئیں آپ؟ میں وہیں دادا ابا کو منہ کہہ دیتی تو آپ اور ابو پر کوئی الزام نہیں آتا۔"

"تمہارے ابو کو دیکھا نہیں تم نے؟ کس مشکل میں ہیں وہ۔" صاعقہ کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

"تمہارے دادا نے اصغر سے کہا ہے اپنی غلطی سدھارنے اور معافی طلب کرنے کا یہ آخری چانس ہے۔"

"ہیں؟" اس کے اندر سردی بے چینی سرایت کر گئی۔

"عمارہ کی پہلے سے کہیں کمٹمنٹ ہے، تمہارا ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے تو کس لیے نہ کر رہی ہو؟"

"ممی!" اسے بہت حیرت ہوئی۔ "یہ آپ کہہ رہی ہیں؟ میں اس گھر سے رشتہ جوڑ لوں جہاں کا ایک بھی فرد آپ کو پسند نہیں ہے؟"

"ایثار ٹھیک ہی ہے۔" انہوں نے اس سے نظریں چرائیں۔ اس کے بعد سسر راضی ہو جاتے، ان کا غصہ اور ناراضی دور ہو جاتی تو انہیں 'مکمل'

شوہر واپس مل سکتا تھا۔

"بس اتنی اہمیت ہے ممی! میری؟" سومہ کو رونا آگیا۔

"آپ دونوں کی غلطی کی تلافی اور معافی کے لیے استعمال ہونا؟"

"اب اتنا ایموشنل ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔" عمارہ آگے آئی۔

"حالات ایسے ہو جائیں گے، کسی نے سوچا نہیں تھا۔ تمہارا یا ایثار کا کہیں کوئی سین ہوتا تو الگ بات تھی، اس وقت دادا ابا کی بات ٹھکرائی تو تعلقات ہی ختم ہو جائیں گے اور ابو ایسا نہیں چاہیں گے، ویسے مجھے تو یہ رشتہ ٹھیک ہی لگ رہا ہے۔"

"یہ رشتہ نہیں ہے" پیچ ورک ہے 'ناک' بچانے کے لیے، بگڑی سچویشن سنبھالنے کے لیے دو زندگیاں بگاڑ رہے ہیں سب۔" اسی وقت اصغر بیگ اندر آئے۔ ان کے چہرے پر سکون تھا۔ عمارہ کے انکار کے بعد والی بدحواسی اور پریشانی غائب ہو گئی تھی۔

"کل صبح نکاح ہوگا اور شام میں کامن ریسپشن۔"

"ابو!" وہ زور سے چیخنا چاہ رہی تھی مگر رو پڑی۔

"اب تم کوئی بدمزگی نہ کرو سومہ۔" وہ اس کے سامنے آئے۔

"ایثار اچھا لڑکا ہے اور میں ابا کی بات ٹال نہیں سکتا۔ مازیہ! اسے کمرے میں لے جاؤ۔" چپ کھڑی مازیہ کو انہوں نے مخاطب کیا۔

"اپنا وقت تھا تو ٹال گئے، عمارہ کے لیے بھی بس میرے لیے نہیں ٹال سکتے۔"

کچھ دکھ اور سچائیاں گونگا کر دیتی ہیں۔ بے وقعتی کا احساس اتنا شدید تھا کہ شکوہ کرنا بھی گوارا نہ ہوا۔

"مجھ میں ہی عمارہ کی طرح اپنا کیس لڑنے کی صلاحیت نہیں ہے تو کسی سے شکایت کیا کروں۔" سوچتے ہوئے خود ہی اپنے کمرے کی سمت چل پڑی۔ ایک ہی بات اس نے اپنے لیے سوچ رکھی تھی

[کہ] اب کسی کو اپنے ساتھ زیادتی اور ناانصافی نہیں [کر]نے دے گی اور پہلے موقعے پر ہی اپنوں کے [ہاتھ]وں مجبور اور بے بس ہو گئی تھی۔

"آپ سب میری مرضی کے بغیر میری شادی [ک]ر رہے ہیں، یہ زبردستی اور ظلم ہے میرے ساتھ۔" [ا]س نے جاتے جاتے آنسو روکنے کی ناکام کوشش کے درمیان کہا تھا۔

وہ اس حقیقت کو بہت پہلے تسلیم کر چکی تھی کہ والدین کے نزدیک عمارہ اور مازیہ جیسی حیثیت اس کی نہیں۔ وہ ہمیشہ ان چاہی اولاد تھی اور رہے گی۔

کمرے میں بستر پر گر کر روتے ہوئے اسے خیال آیا تو اس نے فون اٹھایا۔ ایثار کا نمبر نکالا اور اسے پیغام لکھا۔ وہ آخری سانس تک لڑنے پر یقین رکھتی تھی۔

"میری کوئی نہیں سن رہا مگر دادا ابا تمہاری بات مان جائیں گے۔" ذرا دیر بعد جواب موصول ہوا۔

"دیر ہو گئی، میں دادا ابا کی بات مان گیا ہوں۔"

"کوئی میرا ساتھ نہیں دے رہا۔" سومہ نے بے بسی سے کہا۔

"شادی رکوانے کے علاوہ ہر معاملے میں مجھے اپنے ساتھ سمجھو۔"

"تم کب سے اتنے اچھے ہو گئے؟"

"تمہارے لیے ابھی ابھی۔"

"یہ شادی نہیں رکوا سکتے کسی طرح؟"

"نہیں۔"

اس نے ڈھیر سارے آنسو بہاتے ایموجی بھیجے اور فون رکھ دیا۔

"میں تو گھر سے بھاگنے یا ہانیہ جیسا ہی کچھ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی، اتنی جذباتی یا بے وقوف بھی نہیں ہوں۔" اس نے افسوس سے سوچا۔

☆☆☆

اگلے دن وہ یا تو منہ پھلائے رہی یا التجا کرتی رہی کہ کسی طرح اسے دادا ابا سے ایک بار بات کرنے کا موقع دیا جائے مگر کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور نکاح ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ شام میں دروازہ پیٹ پیٹ کر جب سب ناکام ہو گئے تو ابو کو بلوایا گیا۔

"میرا تماشا نہ بناؤ سومہ! دروازہ کھولو۔" ان کی جھنجلاہٹ بھری آواز پر اس کے اندر پھر وہی خالی پن پھیل گیا جس کے بعد غصہ اور مان سب بے معنی ہو جاتا تھا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔

رخصتی کے وقت جب کزنز اسے ایثار کی طرف لے جا رہی تھیں تو اس نے پلٹ کر سب سے کہا۔

"آپ سب نے میرے ساتھ جو کیا ہے نا، میرا دل کر رہا ہے، اب کبھی واپس ہی نہ آؤں ادھر۔" وہ فوراً نہیں روئی تھی مگر منہ پھولا تھا۔

"کل صبح ہی ادھر آ جاؤ گی تم، دیکھنا۔" عمارہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ کوئی اس کی بات کو سنجیدگی سے لیتا ہی کب تھا۔

صاعقہ اور اصغر بیگ کی آنکھیں نم تھیں۔ وہ رو رہے تھے۔ ان کا برتاؤ جیسا بھی ہو، اولاد تھی وہ ان کی، باقی دو سے کم سہی مگر فطری لگاؤ نہیں بھی تھا۔

☆☆☆

کل سے سب کی سن سن کر وہ بہت تھک چکا تھا۔ ہر کوئی یا تو اپنا غصہ اسے سنا تا تھا یا یہ باور کرانے کی کوشش میں تھا کہ اس کے ساتھ جو غلط ہوا ہے جنھوں نے غلط کیا ہے، وہ انہیں کبھی معاف نہیں کریں گے یا اسے تسلیاں دیتا تھا کہ اچھا ہی ہوا، کچھ ہونے سے پہلے پتا چل گیا،

وہ دھوکے سے بچ گیا، اللہ نے کرم کیا۔ وہ سب اپنے طور پر اسے 'مجبراپ' کر رہے تھے حالاں کہ اسے اس کی ضرورت نہیں تھی لیکن کون سمجھتا تب نا۔

اسے بطور انسان بیان کرنے کے لیے دو الفاظ کافی تھے، امن پسند اور سلجھا ہوا۔ اس اچانک افتاد پر بھی اس کے لیے دادا ابا کی بات مان لینا مشکل نہیں تھا کہ یہ ہی اس کا مناسب حل تھا جس پر دل سے نہ سہی جبراً ہی سہی مگر سب راضی تھے۔ اس کا انکار لمبے وقت کے لیے اس کے گھر کے حالات اور چاچا کے گھر کے ساتھ تعلقات ہمیشہ کے لیے بگاڑ دیتا،

معاملہ دونوں طرف طول پکڑتا اور فیصلے وہ ہمیشہ "امن سکون قائم رہے، بات نہ بڑھے، نہ بگڑے" اس تناظر میں کرتا تھا۔ سومہ کے لیے اتنا کافی تھا کہ اس کے نام پر دل نے احتجاج نہیں کیا تھا۔

اب جب سب اپنے طریقے سے اس کی زندگی سنبھال اور سنوار چکے تھے تو وہ اپنے بستر پر گر کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہونا چاہتا تھا مگر اس کے لیے تو عشق سے پہلے والے امتحان ہی ختم ہونے میں نہیں آرہے تھے۔ جمائی لیتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے ہی منہ پھلائے بیٹھی سومہ کو دیکھ کر اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کیں پھر بالوں پر ہاتھ پھیر کر اس کے سامنے آیا۔ سومہ نے منہ کھولا ہی تھا کہ ایثار نے ہاتھ اٹھا کے روکا۔

"میں ساری زندگی کے لیے تمہارے حوالے ہوں، آخری سانس تک منتظر ہوں گو بس آج کچھ نہ کہو۔"

"میں ساری عمر تھوڑی نا اتنے غصے میں رہوں گی۔" اسے برا لگ گیا۔

"مجھ پر کس لیے غصہ ہو؟" اس کا سوجا سا منہ دیکھ کر ایثار نے پوچھا آخر وہ بھی تو اس کی طرح "دکھی" ہی تھا۔

"میں سب سے غصہ ہوں، ہر کسی پر غصہ ہوں اور سننے کوئی تیار نہیں، تم تو سن لو، تم نے ہی کہا تھا نا ہر معاملے میں میرے ساتھ ہو۔"

اس نے فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے سہولت سے اپنی نشست درست کی۔

"تمہارے علاوہ کوئی دستیاب بھی نہیں اس وقت۔" اس نے ایک وجہ پیش کی۔ وہ اسے ریڈی اسٹڈی گو والی خطرناکیوں سے دیکھ رہی تھی کہ ادھر وہ اشارہ کرتا اور وہ بندوق سے نکلی گولی کی طرح شروع ہوتی۔

ایثار گہری سانس لیتے ہوئے اس کے بازو میں بیٹھ گیا۔

"پانچ منٹ ہیں تمہارے پاس جو کہنا ہے جلدی کہو۔" اس نے فون میں اسٹاپ واچ سیٹ کی۔

"ایسے ایک دن کے نوٹس پر کسی کی شادی ہوتی ہے اور ابھی تو میرا نمبر بھی نہیں تھا، سب کو اپنی پڑی تھی، دادا ابا، تایا ابا، ابو، امی سب نے صرف اپنا سوچا، انہوں نے عمارہ کو بچایا، عمارہ نے اپنی محبت کو اور مجھے اپنی پسند اپنی مرضی سوچنے تک کا بھی وقت نہیں دیا، کسی نے فارملیٹی کے لیے بھی مجھ سے نہیں پوچھا شادی کرنا بھی ہے یا نہیں پھر بھی میں چلاتی رہی، مجھے نہیں کرنی شادی، مجھے نہیں کرنی شادی مگر سب بہرے ہو گئے تھے، اور تم...... تم نے انکار کیوں نہیں کیا؟ مجھے لے کے اس ہانیہ کا ری پلیسمنٹ بنا دیا، زبردستی تمہارے اور تائی امی کے سر تھوپ دیا مسلط ہو گئی نا میں اور اس پر سب کو یہ فکر کہ منہ سیدھا رکھو، رونے کی کیا بات ہے، ایک بار تو سوچا ہانیہ کی طرح میں بھی کر لوں کچھ، پھر خیال آیا دوبار تمہارے ساتھ ایسا ہو گیا تو نہیں تم ہی کچھ نہ کر بیٹھو اور پھر ساری عمر کا ایک اور الزام ننھیال والوں کے سر......

دیکھو، کوئی اتنا نہیں سوچتا جتنا میں نے سوچا اور پھر بھی میرے لیے کسی نے نہیں سوچا، کسی سے شکایت بھی نہیں کر سکتی، سب ایسے بے حس ہیں کہ نہ پوچھو...... نہیں یہ غلط بول گئی، سب سے شکایت کر سکتی ہوں مگر کوئی سننے تیار نہیں ہو رہا جب کہ دل کر رہا ہے چیخ چیخ کر سب سے کہوں، غلط کیا میرے ساتھ سب نے، میری زندگی اور میری مرضی اتنی ارزاں نہیں تھی، کبھی معاف نہیں کروں گی کسی کو، شادی کا جوڑا پسند کا تو چھوڑو میرے ناپ کا بھی نہیں تھا، یہ دیکھو کتنا لوز ہے......"

اس نے ہاتھ اوپر اٹھا کر لٹکتی آستین پکڑ کر اسے دکھائی۔

"ہانیہ کا تھا، یہ اسی کے ناپ کا اور تو اور مہندی کے نام پر یہ......" اس نے اپنی ہتھیلی آگے کی جس کے درمیان سرخ دائرہ بنا تھا۔

"اتنا گندا لگتا ہے مجھے، کہاں میں عید بقر عید پر ہاتھ پیر بھر بھر کے مہندی لگاتی ہوں اور اپنی سگی شادی پر یہ بڑا سا گول ٹیکا......!" اسے رونا آنے لگا۔

"اور یہ......" اس نے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا۔ "پنک لپ اسٹک میں میرے ہونٹ ایسے لگتے ہیں جیسے فاسٹ بولرز کے زنک آکسائیڈ والے ہونٹ......"

مسلسل فون پر آگے بڑھ رہے وقت پر نظر جمائے بیٹھا ایثار بے اختیار مسکرا اٹھا تھا۔

"یعنی ساری عمر اپنی فوٹوز میں یہ درگت نظر آئے گی مجھے، ایسی کارٹون یادگاریں کسی کی نہیں ہوں گی دنیا میں......

تم اتنی دیر سے بیٹھے آئے ہو کہ کتنی باتیں تو بھول گئی میں، فون میں پوائنٹس لکھ لینا چاہیے تھے مجھے۔" آخری جملہ تاسف بھری خود کلامی تھا۔

"اب کون سی نیند!" ایثار نے فون بند کر کے اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔

"بہت سلو بولتی ہو تم پانچ منٹ کب کے ختم ہو گئے۔"

"فی الحال انرجی نہیں میرے اندر فر فر بولنے کی۔ سات بجے سے کھانا کھلا دیا تھا امی نے، اس کے بعد کسی نے پوچھا بھی نہیں۔ نیند آرہی تھی نا تمہیں جاؤ سو جاؤ۔"

"تمہاری باتوں نے بھگا دی ساری نیند۔" وہ کھڑا ہوا۔

"تمہیں چینج کرنا ہے اور بھوک بھی لگی ہے؟"

"ہاں۔"

"تم چینج کر لو یا ایسے ہی چلو گی؟"

"کہاں؟"

"چینخنے کے لیے انرجی کا انتظام کرنے۔" اس نے کچھ دیر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا مگر وہ پلٹ کر الماری سے ٹی شرٹ نکالنے لگا تھا۔ وہ بھی "ڈھیلا" جوڑا بدلنے اٹھ گئی۔

دس منٹ بعد دبے پاؤں لان میں پہنچ کر ایثار نے بائیک یونہی کھینچ کر گیٹ سے باہر نکالی تا کہ شور نہ ہو اور کچھ آگے جانے کے بعد شروع کی۔

"بیٹھو۔" اس نے پیچھے آرہی سومہ سے کہا۔

"گھر میں بھی تو کھا سکتے تھے۔" اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ایک دن میں جو ماحول بدلا تھا اور جیسے شادی ہوئی تھی سارے قریبی مہمان بھی گھروں کو چلے گئے تھے۔

"چیخنی کہاں تم گھر میں؟ ویسے بھی کچن کے سب سے قریب پاپا اور امی کا کمرہ ہے۔"

"اچھا۔" اس نے ایثار کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

دراصل ایثار کو بھی کھلی ہوا کی ضرورت تھی اور بھوک بھی لگی تھی۔

کمرے میں آتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ سومہ سے کیا اور کیسے کہے کہ وہ اس کی بات سمجھ جائے۔ ازدواجی زندگی کی ابتدا کا سارا جوش ساری خواہشیں ڈھیر ہوئی تھیں جو یوں ٹریگر پر دوبارہ جوان نہیں ہو سکتی تھیں لیکن سومہ کے آغاز نے اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔

گھر کے قریب انہیں اتنی رات گئے آملیٹ پاؤ والی ریڑھی مل ہی گئی۔ وہاں سے پیٹ پوجا کے بعد واپسی میں قدرے سنسان سڑک پر ایثار نے بائیک روک دی۔

"یہاں جی بھر کے چیخ چلا لو تم۔"

"ایثار! میں نے دو دو آملیٹ اور جانے کتنے پاؤ کھا لیے ہیں اور اب مجھے بے تحاشا نیند آرہی ہے، مجھے تو ڈر لگ رہا ہے سیٹ سے پیچھے ہی لڑھک نہ جاؤں۔" اس کی آواز پر بھی نیند کا غلبہ تھا۔

"گھر ہی چلو اور میری گرفت ڈھیلی ہوئی نا تو دھیان رکھنا، میرا غصہ اور زبردستی کی شادی اپنی جگہ مگر ابھی مرنا نہیں مجھے۔" ایثار نے بائیک آگے بڑھا دی۔

"ویسے منگیتر کی خودکشی کی کوشش کے بعد پہلی رات بیوی ایکسیڈنٹ میں مر گئی تو تمہیں......"

"تم اب بالکل چپ ہو جاؤ۔"

"بولنے دو اول فول، چپ ہوئی تو اونگھتے ہوئے گر جاؤں گی۔" ادھر خود شناسی کی انتہا تھی۔ گھر

پہنچنے تک اس کی اول فول جاری رہی تھی۔

گیٹ سے ذرا دور اس نے بائیک بند کی اور خاموشی سے اندر لا کر اس کی جگہ کھڑی کر دی۔ دبے پاؤں واپس کمرے میں آتے ہی وہ تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

"پہنچنے پھر چلیں گے۔" سومہ نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

"اوکے۔" وہ بھی دوسری طرف تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

"یہ شب زفاف جیسی بھی گزری، یادگار تھی۔" نیند کی وادی میں کھونے سے پہلے اس نے سوچا تھا۔

☆☆☆

جب دو تین آوازوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تو اس نے ایثار کا کندھا ہلایا اور آواز بھی اونچی کی۔

ایثار!" اس نے سستی سے آنکھیں کھولیں۔

"اب کیا ہوا؟" اسے یاد تھا کل ان کی شادی ہوئی ہے۔ "تمہیں پھر بھوک لگی ہے یا کچھ سنانا رہ گیا تھا؟"

"اتنے مشکل ناپ اور تل لگانے کی کیا تک تھی بھلا؟" اس نے منہ بنا کے ناراض سا احتجاج درج کیا۔

ایثار نے پوری آنکھیں کھولیں۔ وہ شاور میں بھیگ کے آئی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ سومہ جو اسے جگانے کے لیے جھکی تھی سیدھی ہوئی۔ غسل خانے سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔

"ساری سمتوں میں گھما کے دیکھ لیا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا نہ پانی بند ہوا۔" دور ہو کے اس نے دوپٹا جھٹکا۔ ایثار نے اندر جا کر شاور بند کیا۔

"تمہیں کمرے اور واش روم کا ایک ٹور کروا دیتا ہوں ڈیمو کے ساتھ۔" اس نے مزید حادثوں کے پیش نظر واپس آ کر اعلان کیا۔

"کیا تم روز اتنی دیر سے اٹھتے ہو؟" وہ اس کا مدعا سمجھ گئی۔ جب وہ میسر تھا تو وہ کیوں 'ٹور' پر خوار ہوتی۔

"کیا تم ایک دن کے لیے اس کمرے میں آئی ہو؟"

"ابھی کل رات ہی تم نے کہا 'ساری زندگی کے لیے میرے حوالے ہو۔'" اس نے یاد دلایا۔

"اس میں یہ کام شامل نہیں کیے تھے میں نے۔" اس نے غسل خانے کی سمت اشارہ کیا۔

"مجھے پیچیدہ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا، نہ انسان نہ کچھ چیزیں۔" اس کا انداز پھر روٹھا سا تھا۔ نہ جانے کس سے ناراض تھی وہ یا شاید سب سے ناراض تھی۔

"لیکن اس کمرے کے باہر فی الحال سب کچھ کامپلیکیٹڈ ہے۔" ایثار نے یاد کروایا۔

"اسی لیے میرا دل نہیں چاہ رہا باہر جانے کا۔" وہ بستر پر بیٹھ گئی۔

"تو کیا باقی زندگی ہمیں اس کمرے میں بسر کرنی پڑے گی؟" وہ بھی بستر پر بیٹھ گیا۔

"میرا ہنسنے کا بھی دل نہیں چاہ رہا۔"

"رونے کا دل ہے؟"

"روؤں گی کیوں؟"

"زبردستی شادی ہو گئی، واش روم کے ناب سمجھ میں نہیں آ رہے، باہر سب پیچیدہ سا ہے جو تمہیں پسند نہیں، مہندی میں گول دائرہ بنا دیا، ڈریس لوز تھا، لپ اسٹک اور......"

"بس!" اس نے ہاتھ اٹھائے۔ "ورنہ میں دھاڑیں مار کے رو پڑوں گی۔"

"پھر اب تم ہی بتاؤ، اس سچویشن میں ہم کیا کریں؟" اس کے سوال پر وہ سوچنے لگی پھر بہت دیر بعد کسی فیصلے پر پہنچی۔

"صبر کے علاوہ ہم اور کچھ نہیں کر سکتے۔" ایثار نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔

"اور میرے ساتھ جو ظلم ہوا ہے، اس کی تلافی کے لیے تم میرے ساتھ اچھا بی ہیو کرو۔" لگے ہاتھوں اس نے کہہ دیا۔

"ظلم میرے ساتھ نہیں ہوا؟"

"تم انکار کر سکتے تھے، دادا ابا تمہاری بات مان لیتے۔"

"یہ تمہارا گمان ہے، دادا ابا ہر حال میں کل ہی شادی کروانا چاہتے تھے، تم نے کہاں دیکھا اور سنا کل انہیں۔"

"تو تمہارے ساتھ بھی زیادتی ہوئی ہے۔"

"ہم دونوں رو دھو نہیں رہے، نہ لڑنے مرنے کے لیے تیار ہیں کیا پھر بھی اسے زبردستی، زیادتی اور ظلم کہیں گے؟" اس نے اہم نکتہ اٹھایا۔

"ہم دونوں مجبور مگر شریف اور مجبور بچے ہیں اس لیے مہذب انسانوں جیسا بی ہیو کر رہے ہیں لیکن بدولت ہمارے گھر والوں نے ہمیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکا ہے، کوئی قیامت نہیں آتی اگر تمہاری شادی نہ ہوتی، دو دن لوگ گپ کرتے اور اپنی زندگیوں میں مگن ہو جاتے لیکن اب اس کے بعد... جانے کتنا صبر کرنا ہوگا اور وہ کب تک اور کیسے ہوگا مجھ سے۔"

اس کے اندر کہیں پہلے ہی یہ مایوس خیال جگہ بنا کا تھا کہ امن وامان سے یہ سب زیادہ دن نہیں چل سکے گا اور وہ اس کیفیت اور خیال کو بلند آواز میں کہنے یا سوچنے سے کترا رہی تھی۔

"ہمم۔ تو آج سے ہم دونوں ٹیم صبر!" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ سومہ نے چاروناچار ہاتھ تھاما۔

"ایک ہی ریکویسٹ ہے کہ یہ حاضر جوابی مجھ تک ہی محدود رکھو۔" اس نے سومہ کے ہاتھ چھڑانے سے پہلے مصافحے پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھا۔

"چپ رہنا میرے لیے مشکل ہے ویسے، پھر بھی کوشش کروں گی کہ دنگا فساد مجھے بھی پسند نہیں۔"

"تھینک یو۔" ایثار نے ہاتھ ہٹا کے اس کا ہاتھ آزاد کیا۔

وہ دونوں ایک ساتھ کمرے سے نکلے تھے۔ دادا ابا، نثار اور اشرف بیگ ناشتے کی میز پر موجود تھے۔ الفت ان کے پاس کھڑی تھیں۔ وہ سلام کرتی ایثار سے پہلے میز پر بیٹھی اور چائے کا تھرماس قریب کیا۔

"بیٹی کے گھر ناشتہ لانے کی بھی فکر نہیں۔" الفت نے بائیں طرف منہ کر کے کہا جیسے ادھر بیٹی والے دیکھ اور سن رہے ہوں۔

"مطلب میں یہ ناشتہ نہیں کر سکتی؟" کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے اس نے تھرماس لا یمان میں ہی روک لیا۔

"ایسی بات نہیں ہے بیٹا۔" اشرف بیگ نے جتے ہوئے کہا۔ جب کہ ان کی زوجہ کو اس کا یہ سنجیدہ جملہ تمسخر لگا۔

اس نے کپ بھرا اور تھرماس ایثار کی طرف کھسکا دیا۔ دادا ابا خاموش بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پر اطمینان تھا۔ انہوں نے وقت پر پوتے کی شادی کر دی تھی۔ انا کی تسکین چہرے سے ظاہر تھی۔ ساتھ ہی تسکین کا انہوں نے اس سے پہلے بھی کب سوچا تھا جواب فکر کرتے۔ باقی سب ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے۔

"امی مجھے فریش چائے بنوا دیں۔" تھرماس کی چائے پینا اسے پسند نہیں تھا۔ الفت نے وہیں سے کلثی کو آواز لگا کر چائے کا کہا۔

"تم نے کتنے دن کی چھٹیاں لی تھیں؟"

"وہ خود مالک ہے، چھٹیاں کیوں لے گا۔" دادا ابا کو سوال ناگوار گزرا۔

"میرا مطلب ہے، کل رات کی اس کی بکنگ ہے فلائٹ کی۔" ایثار کو بھی یاد آیا۔ "اوہ! یہ تو میرے ذہن سے بالکل نکل گیا تھا۔"

"اب یاد آ گیا نا تو کینسل کر دو۔"

"کینسل کس لیے بھئی؟ دولہا دلہن جائیں گے جیسے طے تھا۔" وہاں بس اشرف بیگ ہی خوش نظر آ رہے تھے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سومہ نے خفیف سا سر ہلا کر انکار کا خفیہ اشارہ کیا۔

"لیں دلہن خود نہیں جانا چاہتی!" الفت کی
بات پر ان دونوں نے چونک کر انہیں دیکھا۔
"تائی امی! ہفتہ بھر کے لیے کہیں جانا ہو تو کم
سے کم ہفتہ بھر پہلے سے تیاری کرنا ہوتی ہے، یہ تو پھر
ہنی مون ہے وہ بھی اس شادی کا جس میں ایک دن
پہلے دلہن بدل گئی۔" اس صاف گوئی پر سب اپنی اپنی
جگہ مقدور بھر ششدر تھے۔
"شارٹ نوٹس پر شادی کر لی آپ سب کا
سوچ کے تو ہر معاملے میں یہ امید نہ رکھیں، مجھے پلانڈ
طریقے سے سب کرنا پسند ہے۔" اس کی آواز میں
آخر تک پہنچتے پہنچتے ناراضی گھل گئی تھی۔
"ایک بات یاد رکھو، تم نے کسی پر احسان نہیں
کیا ہے اور میں بھی تو وہی کہہ رہی ہوں کینسل کر دو،
دلہن کی تیاری ہی نہیں ہے، وہ نہیں جانا چاہتی۔"
الفت نے پہلے خود کو سنبھالا۔ تب ہی تلخی چائے کے
کر آئی۔ اس نے دور سے سومہ کی بات سنی تھی اور اس
وقت ساس کو دیکھ کر اسے بڑا مزہ آیا۔
"ہاں تو دلہن کیوں نہیں جانا چاہتی، یہ اہم
ہے۔" ذرا دیر پہلے حاضر جوابی والا وعدہ وہ بھول گئی
تھی۔
"جب تم دونوں کا دل چاہے تب چلے جانا۔"
اشرف بیگ نے فضا میں پھیلی بے آرامی دور کرنا
چاہی۔
"جی پاپا۔" اس نے چائے کا کپ اٹھاتے
ہوئے کہا۔
"تم دونوں کے لیے آملیٹ بنا دوں؟" تلخی
نے پوچھا۔
"نہیں۔" دونوں نے ایک ساتھ کہا۔ الفت
جو پلٹ گئی تھیں پھر مڑ کر انہیں دیکھنے لگیں۔ ایثار کا
معمول کا ناشتہ ہی آملیٹ تھا۔
"مجھے کارن فلیکس دے دیں۔" ایثار نے
کہا۔ سومہ سر جھکائے چائے پیتی رہی۔
☆☆☆
وہ اپنے گھر میں سب سے ناراض تھی لیکن ادھر
جائے بنا چارہ بھی نہیں تھا۔ اس کا بہت سا ضروری
سامان اسے اپنے کمرے میں لانا تھا۔
"سب ٹھیک رہا؟ تائی امی کا رویہ کیسا ہے؟ اور
ایثار...... ہانیہ کے بارے میں کچھ کہا اس نے؟ تم
نے تو ضرور پوچھا ہوگا اس سے آخر اتنے دلوں سے
منگنی تھی ان کی...... دادا ابا نے کچھ کہا؟ مطلب کسی
نے ٹھیک یوں کہا تمہیں وقت پر ان کی عزت بچانے
کے لیے؟" عمارہ کے پاس اتنے سوال تھے کہ جواب
سننے کا بھی وقت نہیں تھا۔
"تم رکو تو وہ کچھ بولے بھی۔" بظاہر دور سے
سب سن رہی صاعقہ نے عمارہ کو ٹوکا۔ عمارہ چپ
ہو گئی۔ وہ فوراً کچھ نہ کہہ سکی۔
"اب بتاؤ بھی۔" عمارہ نے اس کے شانے
پر ہاتھ مارا۔
"سب ٹھیک رہا، کسی نے ٹھیک یو نہیں کہا نہ کسی
نے منہ بنایا، سب نارمل ہی ہیں جیسے پہلے تھے۔"
صاعقہ نے سکون کا سانس لیا مگر عمارہ کی تسلی نہیں
ہوئی تھی۔
"ایثار نے کچھ نہیں کہا؟"
"بہت کچھ کہا لیکن میں وہ پرسنل باتیں تمہیں یا
کسی کو بھی کیوں بتاؤں؟"
"واہ! ممی! دیکھیں اسے، ایک دن میں ہی
بدل گئی یہ تو" اس نے حیرت سے مڑ کر ماں سے کہا۔
"سومہ سمجھ دار ہے۔" صاعقہ نے کہا۔ اس
نے ماں کو دیکھا جو بکھرا سامان سمیٹ رہی تھیں۔ یہ
انہوں نے سچ کہا تھا یا ذو معنی بیان تھا یا اس میں اس
کے لیے کچھ اشارہ تھا، وہ سمجھ نہیں پائی۔
عمارہ اور پھر مازیہ دونوں کے پاس صرف
باتیں، سوال اور شکوک ہی نہیں تھے بلکہ اسے
پڑھانے کے لیے بہت ساری پٹیاں بھی تھیں۔
ان دونوں کے دل اپنے دادا ابا اور تایا کے گھر
والوں کے لیے ایک بھی اچھا خیال نہیں رکھتے تھے اور
اب ان کے نزدیک سومہ کو سارے بدلے لینے کا
موقع ملا تھا۔ اسے اتنی گھبراہٹ ہونے لگی کہ وہ اپنا

سامان لیے جلد ہی واپس آ گئی۔ وہ الماری میں اپنے
بیگ کھول کر کپڑے اور دیگر سامان رکھ رہی تھی تب
تائی کمرے میں آئی۔ اس کے پاس بھی اس کے لیے
نئی کبھی باتیں نہیں تھیں۔ وہ اپنی ممانی یعنی ساس
ماما! ابھی
کے مزاج سے اسے آگاہ کرنے آئی تھی۔
"نانا ابا اور نثار میرے ساتھ ہیں تو مجھے اتنی فکر
نہیں" "لیکن تم تو بالکل اکیلی ہو۔"
جاتے جاتے کہا اس کا جملہ اس کے ذہن سے
چپک گیا تھا۔ ایثار کے آتے ہی اس نے اپنا "اکیلا پن"
اس کے سامنے پیش کر دیا۔
"شادی ہوئی ہے کوئی جنگ کا بگل نہیں بجا کہ
لڑنے سے پہلے تمہارے ساتھ کون کون ہے، یہ
دیکھا جائے۔
"اس گھر کی تاریخ اور حال دیکھتے ہوئے
میدان جنگ بعید بھی نہیں۔"
"ایسا کچھ نہیں ہے نہ ہوگا، اچھا اور مثبت سوچو تو
سب ویسا ہی نظر آئے گا۔"
"یہ حقیقت سے نظر چرانا نہیں ہے؟"
سومہ! ہم بات نہ بڑھائیں، معاملات نہ
الجھائیں، مصلحتاً خاموش ہو جائیں تو آدھے مسائل
پیدا ہی نہیں ہوتے اور ہم دوسرا فریق بننے سے انکار
کر دیں تو جنگ چھڑ ہی نہیں سکتی۔" وہ چلتے ہوئے
اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔
"تم ابھی سے لڑائی، محاذ اور میرے ساتھ کون
جیسی باتوں کو ذہن میں جگہ دو گی تو یہ سب روز مرہ
کے معمول میں بھی شامل ہو جائے گا۔"
"اب تم یہ فلمی ڈائیلاگ کہو گے کہ یہی میرا گھر
ہے اور تمہارے ماں باپ ہی اب میرے ماں باپ
ہیں، انہیں میں......"
ایثار بے ساختہ ہنس پڑا اور اس نے منہ پھلا
لیا۔
"میں ایسا کچھ نہیں کہہ رہا، نہ تمہیں ایسا کچھ
سمجھنے کی ضرورت ہے، میرے ماں باپ تمہارے تایا
اور تائی امی ہی ہیں، انہیں کچھ اور نہ سمجھو۔"
"پھر؟"
"زیادہ نہ سوچو بلکہ کچھ نہ سوچو، کل ہی تم نے کہا
ہم مجبور اور شریف ہیں اور آج ایسی ام میچور بات!"
اس نے شرم دلانی چاہی۔
"اچھا۔" اس کا انداز اب بھی روٹھا سا تھا۔
"تمہارا کوئی نک نیم نہیں ہے؟"
"اتنا سا تو نام ہے، اسے بھی کیا توڑنا
مروڑنا، تمہیں اچانک نک نیم کہاں سے یاد آ گیا؟"
"جتنا تمہارا منہ پھولا رہتا ہے، سومہ سلامت
رکھ کر نک نیم غبارہ رکھا جا سکتا ہے۔" ایثار نے کہا
اور عادتاً پھر اس نے ویسا ہی منہ بنایا۔ ایثار ہنستے
ہوئے وہاں سے ہٹ گیا۔
☆☆☆
کام تو وہ شادی سے پہلے ہی چھوڑ چکی تھی، لہٰذا
اب چونکہ گھر میں ہوتی تھی۔ الفت نے صبح
کے ناشتے کی ذمہ داری اسے سونپی تھی۔ رات کا کھانا
وہ خود بناتی تھیں اور دوپہر کا تلخی۔ ایثار کے علاوہ گھر
کے باقی مرد نوکری پیشہ تھے۔
دونوں بہوؤں کے معاملے میں وہ معمولی اور
چھوٹی موٹی بات یا غلطی بھی نظر انداز کرنے کی قائل
نہ تھیں۔ تلخی جواب نہیں دیتی مگر کرتی اپنی مرضی تھی۔
اپنے کام اور معاملات میں وہ ان کا مشورہ یا حکم کچھ
نہیں سنتی تھی اور سومہ جواب دینے کی عادت سے
مجبور تھی۔
اس سے روٹیاں گول نہیں بنتی تھیں اور تقریباً
روز ہی اپنی خوش دامن کی جانب سے روٹی گول
بیلنے کی ایک نئی ٹپ ملتی جو آزمانے پر بھی اس کے لیے
کارگر ثابت نہیں ہو رہی تھی۔
"ہماری اماں نے سب سے پہلے ہمیں گول
روٹی بنانا ہی سکھائی تھی۔" ساس کا پسندیدہ طعنہ اکثر
بہو کی ماں سے ہی منسوب ہوتا ہے۔
"اس وقت سب کے پاس فرصت ہوتی تھی
تائی امی۔ اب تو ماؤں کے پاس اتنا وقت ہے نہ
بیٹیوں کے پاس۔" ابھی الفت نے منہ کھولا ہی تھا

کر اس نے آگے جوڑا۔

"اور نہ کھانے والے اب پلیٹوں میں دیکھتے ہیں، دیکھیں تایا ابا نیوز پیپر دیکھ رہے ہیں اور ایثار موبائل۔" الفت میاں اور بیٹے کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔

"پہلے کے زمانے میں مرد حضرات بھی اتنے فارغ تھے کہ عورتوں کے کام میں مین میکھ نکال کر ٹائم پاس کرتے تھے، سب یونہی فون کو برا بھلا کہتے ہیں ایک فائدہ تو یہ ہی ہے اس کا......" شکر تھا، پہلے کے زمانے کے اس کے دادا وہاں موجود نہیں تھے۔

"باتوں کے بجائے کام پر اتنی توجہ دیا کرو۔ میری روٹیاں بچپن سے ہی ایسی گول ہوتی ہیں جیسے پرکار سے دائرہ کھینچا ہو۔" انہوں نے اس کی بات بدلنے کی کوشش ناکام کی۔

"تائی امی! روٹی کسی بھی شکل کی ہو، بندہ کھالیتا ہے، کچی اور سخت ہو تو کھائی نہیں جاتی اور......" اس نے اشرف بیگ کو مخاطب کیا۔

"تایا ابا! روٹی کھانے میں کیسی ہے؟"

"اچھی ہے۔" وہ اب بھی اخبار میں گم تھے۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ صرف انہیں ہی دو بدو جواب دیتی تھی۔ وہ باتونی مشہور تھی اور سب کے ساتھ ہی اس کا رویہ ایسا تھا، اس لیے وہ اس پر 'زبان درازی' کا لیبل نہیں لگا پاتی تھیں۔

"آج کے دور میں تو گول روٹی پر ساس بہو والی لڑائی نہیں ہونی چاہیے، ویسے ان شاء اللہ ایک دن گول بھی بنانے لگوں گی۔" واپس باورچی خانے میں جاتے ہوئے اس نے کہا۔

ایثار یوں ناشتہ کر رہا تھا جیسے دونوں کی باتیں اس کے کانوں میں پڑی ہی نہ ہوں۔ اول تو اس کا مزاج ہی یہ تھا، دوسرے اس نے نثار کو دیکھا تھا۔ ایسے وقتوں میں وہ کبھی ماں کو خوش کرنے کے لیے ایک جملہ کہتا تو کبھی بیوی کے لیے اور اکثر اس کی ماحول نہ بگڑے کی یہ کوشش ہی ماحول بگاڑ دیتی تھی۔

☆☆☆

"پورے پندرہ دن ہو گئے ہیں، میں گھر سے باہر نہیں نکلی۔" اس کی طرف دیکھ کر سومہ نے اعلان کیا۔ وہ لیپ ٹاپ پر کوئی کام کر رہا تھا۔ جب اس نے بڑی دیر تک اس سے نظر نہیں ہٹائی تو ایثار نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"مجھ سے کچھ کہا؟"

"مجھے اکیلے بڑبڑاتے دیکھا ہے کبھی؟"

"اکیلے ہو گی تو میں کیسے دیکھ سکتا ہوں۔" وہ ابھی اس سے سیکھ رہا تھا۔ سومہ نے ہونٹ سختی سے بند کر کے اسے گھورا۔

"سوری!" وہ مسکرایا۔ "میں نے سنا نہیں پھر سے کہو۔"

"مجھے باہر جانا ہے۔"

"ابھی؟"

"شام میں یا رات میں۔"

"او کے ڈنر باہر کریں گے۔" چھٹی کے دن ہی وہ گھر میں ہوتا تھا۔

☆☆☆

ابھی وہ باہر جانے کی تیاری کر ہی رہی تھی کہ ایثار کی خالہ اور ان کی بیٹی آ گئیں۔ لیتی ہر اتوار کو میکے جاتی تھی۔ اسے ہی مہمان نوازی کے آداب نبھانے پڑے۔ الفت نے انہیں کھانے کے لیے روک لیا۔ اس نے منہ پھلا کر ایثار کو دیکھا جس نے بے بسی سے کاندھے اچکانے پر اکتفا کیا۔

ان دونوں کو بھی سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا پڑا تھا۔ کھانے کے بعد بھی ان کا جلدی اٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیتی اور نثار بھی آ گئے تھے۔

"حد ہی ہے اب تو!" پچھلے دو گھنٹوں سے وہ ثمین کے واہیات لطیفوں اور چھچھورے 'ون لائنرز' پر کلس رہی تھی اور اب اس کی برداشت جواب دے گئی۔ تائی امی الگ ان پر واری صدقے جا رہی تھیں۔

"ضرور ایثار نے انکار کیا ہو گا ورنہ ہانیہ نہیں تائی امی نے اسے ہی بہو بنانا تھا۔" اس نے سوچا۔

اس خیال نے پل بھر میں اس کی نظریں بھی بدل دیں اور اب تک خالہ بھانجی کی بے ضرر لگ رہی بات سے بے نکل گیا۔ گیارہ بجے جب وہ اٹھیں تو الفت نے ایثار کو انہیں گھر چھوڑ آنے کا حکم دیا۔

ان کے جانے کے بعد خالص بیویوں اور بہو والے انداز میں جتانے کے لیے وہ بھی اپنے میکے چلی گئی تھی۔ یہ الگ بات خود اس لاشعوری حرکت کے محرک سے بے خبر تھی۔ ایثار کی کار گیٹ سے اندر آئی تو وہ بھی اس طرف آ گئی۔

"سوری یار۔" اسے دیکھتے ہی ایثار نے معذرت کی۔

"میں نے پورا موڈ بنا لیا تھا، پڑا ہمٹ جاتا ہے اور مجھے پلاؤ پر گزارا کرنا پڑا۔"

"اب گھر آئے مہمانوں کو بھگایا تو نہیں جا سکتا۔" وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کمرے میں آئے۔

"ابھی چلو۔" آرائشی میز کے سامنے والی کرسی پر اس کا نکالا جوڑا رکھا تھا۔ قریب ہی سینڈل بھی تھی۔

"اب موڈ نہیں میرا۔" اس نے آگے آ کر چوڑیاں اور کان کے آویزے دراز میں ڈال دیے۔ سب عادت منہ پھولا تھا۔

"تیار نہ ہو، ایسے ہی چلو۔"

"باہر جانے کی سب سے بڑی ایکسائٹمنٹ میری تیاری ہوتی ہے۔" اس نے ملامتی نگاہ اس کے سپرد کرتے ہوئے اس کی معلومات بڑھائی۔

"تو تیار ہو کر چلو۔"

"ثمین کی باتوں نے سر میں درد کر دیا ہے۔" وہ کپڑے ہینگر میں لگا کر الماری میں رکھنے لگی۔

"کیسے برداشت کرتے ہو تم...... مجھے ایک بات پر ہنسی نہیں آئی اور تمہیں دیکھ کر لگ رہا تھا، اس سے اچھی بات پہلے سنی ہی نہیں تھی۔"

"مہمانوں کے ساتھ کرنا پڑتا ہے، اسے آداب اور مروت کہتے ہیں۔" اس کی مرضی نہ دیکھ کر وہ بھی سونے کی تیاری کرنے لگا۔

"مہمان نوازی میں مہمانوں کو خوش کرنا بھی شامل ہے۔"

وہ الماری سے ہٹ کر بستر درست کرنے لگی تھی۔

"ہم...... نظر آ رہا تھا کتنا، خیال تھا تمہیں اس کی خوشی کا۔"

"اس کی خوشی کا؟" وہ کار کی چابی اور موبائل تپائی پر رکھتے ہوئے ٹھٹکا۔ کچھ ایسا ہی حال سومہ کا بھی ہوا۔

"تم بھی تھک گئے ہو، مجھے بھی نیند آ رہی ہے جلدی سے چینج کر کے لائٹ بند کر دو۔" اس نے ذرا دیر پہلے والے جملے کا اثر زائل کرنے کے لیے تیزی سے کہا۔ ایثار اس کے قریب آیا اور انگلی سے اس کی ٹھوڑی اوپر کی۔

"تم جیلس ہو رہی ہو؟" اس کے چہرے پر خوش گوار اور متعجب سا تاثر تھا۔

"بیویوں والا پیارا ری ایکشن ہے یہ تمہارا۔"

"ایسا نہیں ہے۔" اس نے اس کا ہاتھ ہٹایا۔

"بس پلان خراب ہوا، اس لیے موڈ آف تھا۔" وہ وہاں سے ہٹ گئی۔ ایثار نے چاہتے ہوئے بھی مزید نہیں چھیڑا۔

رات میں کروٹ بدلتے ہوئے اس کی آنکھ کھلی تو وہ دوسرے سرے پر سومہ پلنگ کی پشت سے ٹیک کر بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا، ایسے کیوں بیٹھی ہو؟" اس نے سرہانے سے فون اٹھا کر وقت دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے تھے......" اس نے ٹیک ہٹایا اور تکیہ جگہ پر رکھ کر لیٹنے کی تیاری کی۔

"مجھے جیلس فیل ہو رہا تھا۔" ایثار کی طرف پشت کر کے لیٹتے ہوئے اس نے اقرار کیا۔

ایثار نے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

"تم اب تک جاگ کر یہ سوچ رہی تھیں؟"

"مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔" وہ دیوار کی سمت منہ کیے تھی۔

"اب آ گیا؟"

"ہمم۔"

"سو جاؤ، سویٹ ڈریمز!" وہ مسکرا رہا تھا۔ آنکھیں بند کرتے ہوئے سومہ کا چہرہ سرخ تھا۔ آج سے پہلے اسے یہ بات کبھی اس شدت سے محسوس نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر موجود ہوتا ہے۔

☆☆☆

"تم تو ایسے خوش ہو، وہاں جیسے لو میرج کر کے گئی ہو۔"

"جی؟"

"مطلب تمہیں کچھ تو اپنی نیوز دکھانا چاہیے دادا ابا کو اور باقی سب کو بھی آخر عزت رکھی تھی ان کی ہم نے۔"

"اپنی نیوز دکھانے سے کیا ہوگا؟"

"برے وقت میں کام آئے ہیں ہم ہی، جن کو الزام دیتے تھے کہ ناک کٹوا دی، یہ احسان جتانا تو بنتا ہے ہمارا۔"

"احسان تو وہ بھی جتا رہے ہیں ادھر کہ ممی ابو کو ان کی غلطی کے باوجود موقع دیا۔"

"اس کا موقع تم نے دیا ہے انہیں، پہلے دن سے اکڑ کے رہتیں......"

"مجھے سکھانے سے اچھا ہے تم خود چلی جاتیں۔"

"دیکھیں امی اسے......" عمارہ ماں کی طرف بلٹی اور وہ اٹھ کر چلی گئیں۔

اسے عمارہ کی بات کا اتنا برا نہیں لگا تھا جتنا ماں کی خاموشی نے دکھ دیا تھا۔ ادھر آئی تو تائی اور ان کی سہیلی کی باتیں سن لیں۔

"دادا کے آگے کچھ بول ہی نہیں پایا میرا بیٹا۔! تمہیں تو پتا ہے کتنا فرماں بردار ہے وہ میرا دل دکھتا ہے اسے دیکھ کے۔"

"کہا تم سے کچھ؟"

"کچھ کہتا کہاں ہے وہ لیکن ماں ہوں، سب جانتی ہوں۔ ایک تو اس لڑکی میں ذرا جو کچھ ہو جو منہ میں آئے بول دینے کی بیماری ہے اسے اور سنجیدہ مزاج ہے میرا بیٹا، کبھی کوئی تکرار اور بحث نہیں کی کسی سے اور اس کی ہی قسمت ایسی نکلی، سومہ اس کی پسند اور مزاج کے بالکل الٹ ہے، سب کے آگے سر جھکا دیا اپنی خوشی پیچھے ڈال دی۔ وہ پہلے ہی کم بولتا ہے اور اب یہ تو اسے منہ بھی کھولنے نہیں دیتی۔"

ان کے چہرے کے تاسف نے اسے دکھی نہیں کیا بلکہ ان سے زیادہ افسوس میں مبتلا کر دیا۔ اتنے دنوں میں وہ ان کے بیٹے کو ان سے زیادہ سمجھنے لگی تھی۔ وہ سنجیدہ مزاج نہیں تھا اس نے گھر کے امن اور سکون کے لیے خود کو ایسا بنا لیا تھا۔

یہ ماں بیٹے کو زبردستی دکھی بنائے بیٹھی تھیں کہ بہو اور شادی ان کی مرضی اور پسند سے نہیں ہوئی تھی اور ادھر دوسری ماں اور بہن اس بات پر نالاں تھیں کہ دشمنوں کے گھر وہ اتنی خوش کیسے رہ رہی تھی حالاں کہ اس گھر میں اسے زور زبردستی سے اسی لیے دھکیلا گیا تھا کہ ان کے دشمن ان سے راضی ہو جائیں۔

کمرے میں آئی تو ایثار پلنگ پر بیٹھا بڑے انہماک سے کوئی ڈاکیومینٹری دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ کہے بنا ہی اپنی جگہ لیٹ گئی۔ اسے دونوں طرف کی سوچ پر افسوس تھا اور سب سے زیادہ دادا ابا کے یہ رویے اسے ہمیشہ بے سکون رکھتے تھے۔ سب کو لگتا تھا، اسے ان سب کی پروا نہیں، وہ اپنی دنیا میں مگن رہتی ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ اس سرد جنگ میں شامل نہیں تھی مگر یہ جنگ سب سے زیادہ اس پر اثر انداز ہوئی تھی۔ سوچتے ہوئے اس نے کروٹ بدلی۔ اس کے خیالات پوری رفتار سے دوڑ رہے تھے۔ ایثار کو اس کی بے آرامی محسوس ہوئی۔

"تم ٹھیک ہو سومہ؟" اس نے ہاتھ بڑھا کے اس کا سر ہلایا۔

"ایک ایثار ہی ہے جس کی سوچ اور رویہ منفی نہیں۔" اس نے سوچا۔

وہ پہلے اس گھر کے مکینوں کے بارے میں زیادہ نہیں سوچتی تھی۔ عید بقر عید یا ایسے موقعوں پر وہ ان کے یہاں آتے تھے یا جب کوئی بیمار ہوتا تو ان کے لیے سب کو زبردستی گھسیٹ کر لے جاتے تھے۔ آتے جاتے سامنا ہوتا تو دعا سلام اور دو چار باتیں بس۔ ایثار کا انداز بھی دادا اور ماں باپ جیسا تھا۔ وہ انہیں دیکھتے اور مخاطب ہی ایسے کرتے تھے کہ وہ مجرم ہیں، گرے پڑے لوگ جن سے نرمی اور کریم سے بات نہیں کی جا سکتی۔ ایثار ایسا نہیں تھا۔ وہ حتی المقدور نظر انداز کر کے گزر جاتا تھا۔ کبھی بات ہوتی بھی تو انداز میں نفرت، حقارت یا تلخی نہیں ہوتی تھی۔

"سومہ!" وہ باہر سے آتے ہی ایسے منہ چھپا کے پڑی تھی۔ اسے لگا کہیں رو تو نہیں رہی۔ اس کا لہجہ پرتشویش تھا۔ وہ یوں ہی بیٹھے بیٹھے اس کے قریب آیا۔

"میں ٹھیک ہوں، تم دیکھو ٹی وی۔" اس نے تکیے میں چہرہ چھپاتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"کسی نے کچھ کہا؟" اس کی آواز بھیگی سی تھی۔

وہ واحد تھا جس کی سوچ طعنوں، شکایتوں اور رنجشوں کے گرد نہیں گھومتی تھی۔ وہ سب کو لے کر اور راضی رکھ کر چلنے والا انسان تھا۔ صاعقہ کی سوچ اس کے بچپن سے ہی گھر والوں کے لیے بغض اور برائی سے آلودہ کی یا اسے تو معصوم صاف آغوش شاید بچپن میں بھی نہیں ملی تھی۔ اس کا ذہن بھٹکنے لگا تھا۔

"سومہ!" ایثار کا ہاتھ اس کے سر پر رکھا ہوا۔ اس نے اس کا ہاتھ اپنے سر سے ہٹایا اور یونہی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں جکڑے رونے لگی۔

"اور......" وہ گڑبڑا گیا۔

"رو کیوں رہی ہو؟" اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کا اس کا چہرہ اپنی طرف کرنے کی کوشش کی۔

"ایسے ہی رونا آ رہا ہے۔" سیدھی ہو کر اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے۔

"تم اس طرف گئی تھیں، وہاں کسی نے کچھ کہا؟"

"میں کب کسی کی باتوں پر روتی ہوں۔" آنسو پونچھتے ہوئے وہ ہنسنے لگی۔

"تم تو اپنی رخصتی پر بھی نہیں روئی تھیں۔"

"وہی تو۔" وہ اٹھ بیٹھی۔

"وہی تو۔" اس نے اسی کے انداز میں کہا۔ "کوئی بڑی بات ہوئی ہے جو رو رہی ہو۔"

"مجھے بڑی باتوں پر رونا نہیں آتا......" وہ کچھ کہتا اس سے پہلے اس نے ہاتھ اٹھا کر فخریہ جتایا۔ "ہماری شادی پر نہیں آیا تھا۔"

"اچھا تو وہ چھوٹی بات بتا دو جس نے رلایا۔" وہ کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔

"تم باقی سب سے الگ ہو۔"

"اور تم تو ساری دنیا سے الگ ہو، تو کیا اس بات پہ مجھے بھی رونا چاہیے۔" وہ ہنسنے لگی۔ ایثار مسکرا دیا۔

عام صورت حال میں وہ کبھی سومہ کے لیے سوچ سکتا تھا نہ شادی کے لیے ہاں کر سکتا تھا۔ وجہ سومہ کے لیے پسندیدگی یا ناپسندیدگی نہیں تھی بلکہ دونوں خاندانوں کے بیچ کا تعلق تھا۔ پہلے سے کڑوے کسیلے رشتوں میں ایک نیا رشتہ قائم کر کے وہاں مٹھاس کی امید عبث تھی۔

وہ اسے اتنا ہی جانتا تھا جتنا گھر کے چوکیدار یا کام والی ماسی کو اور اب شادی کے بعد جیسے وہ ایک اجنبی سے آشنائی حاصل کر رہا تھا۔ روز کچھ نیا جاننا، پرکھنا، سمجھنا اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ دونوں سبک خرام تھے۔ کسی نے آگے بڑھنے میں پہل نہیں کی تھی۔ کچھ ان دیکھا، انجانا ان کے درمیان حائل تھا جو سب کچھ ٹھیک ہونے کے باوجود انہیں روکے تھا۔

☆☆☆

اس کی دوست کی منگنی تھی اور وہ ایثار سے کہہ چکی تھی کہ شام میں اسے اس کے گھر چھوڑ دے۔ اس نے چار بجے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد اس نے تائی امی کو بھی بتا دیا تھا۔ وہ نہا کر نکلی تو اس سے پہلے تائی امی تیار ہو کر اس کی منتظر تھیں۔

"ابھی آپا کا فون آیا تھا۔ ان کی ساس ہاسپٹل ایڈمٹ ہیں، میں ان کے ساتھ انہیں دیکھنے جا رہی ہوں وزٹنگ آورز ابھی ہیں۔ تم ذرا لیٹ جانا مغرب کے بعد۔"

"بھابھی تو ہیں نا۔" کسی ایک کی موجودگی گھر میں کافی تھی۔

"کچھ دیر پہلے اس کی بہن آئی تھیں، وہ دونوں شاپنگ کو گئی ہیں، میں نکل رہی ہوں۔" وہ دروازے سے ہی پلٹ گئیں۔ پہلی بار اس کا بیچ میں دماغ خراب ہوا تھا۔

"بھابھی کو بھی تو روکا جا سکتا تھا۔" جواب بھی اسے معلوم تھا۔ کیوں نہیں روکا۔ ان کے کچھ کہتے ہی ایسے موقعوں پر دادا ابا تنی کے حق میں اعلان کر دیتے تھے۔

اس نے ایثار کو پیغام بھیجا کہ مغرب کے بعد آئے اور ادھر سے آئے 'اوکے' پر وہ کتنی دیر تک اسکرین کو گھورتی رہی۔

شکر تھا کہ الف مغرب سے پہلے آ گئیں۔ اس نے بھی سوچوں کو لگام دی کہ کسی کی خوشی غارت نہیں کرنا تھی۔

وہ چوڑیاں کھنکاتی اور دوپٹا سنبھالتی اس کے بغل والی نشست پر بیٹھی تو ایثار نے بغور اس کا جائزہ لینے کے بعد کہا۔

"مہندی نہیں لگائی؟" سومہ نے اس 'جہالت' پر اسے بری طرح گھورا۔

"کچھ غلط کہہ گیا؟" اس نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے دوسرا سوال داغا۔

"تم کیا مہندی کو بھی لپ اسٹک اور لائنر کی طرح سمجھتے ہو؟"

"امی کو شوق نہیں اور گھر میں دوسری کوئی خاتون نہیں تھی اس لیے......"

"یہ معلومات عامہ ہے، جنرل نالج۔" وہ اس نازک وقت میں 'خاتون' پر ردعمل دینے کی متحمل نہیں ہو سکتی سو سہولت سے اسے نظر انداز کیا۔

"اس ترقی یافتہ دور میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"مہندی نے بھی کچھ ترقی کی ہے لیکن ابھی بہت ترقی باقی ہے۔" اس نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے سائیڈ مرر میں دیکھتے ہوئے جھک کر بال پیچھے کیے پھر سیدھا ہو کر گلے کی نازک سی چین اور لاکٹ کو درمیان میں درست کیا۔

"لینے کب آؤں؟" اس نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ پیر آگے کر کے، ذرا جھک کر سینڈلز کو دیکھ رہی تھی۔

"میں کال کروں گی تو آ جانا، زیادہ دور نہیں ہے۔" اب دوپٹا دوبارہ سے اوڑھتے ہوئے اس کی نظریں مناسب آئینے کی متلاشی تھیں۔

"تم سکون سے بیٹھ جاؤ۔" اس نے جس طرح کہا وہ چونک کر تھم گئی پھر دھیمے سے سیدھی ہو کر بیٹھی۔

"میں شادی کے بعد پہلی دفعہ اپنی سہیلیوں سے ملوں گی تو انہیں نظر بھی تو آنا چاہیے، پہلے اور اب کا فرق۔" عادتاً روایتاً ہی وہ روٹھ گئی۔

"میری شادی میں میری کوئی سہیلی بھی شامل نہیں ہوئی تھی۔"

"شادی سے پہلے والی سومہ مجھے یاد ہی نہیں ورنہ فرق بتاتا۔"

"کسی کو خوش کرنے کی کوشش کرو تو پہلا اصول یاد رکھو، سارے کا سارا سچ نہیں کہنا۔"

سومہ نے ہاتھ اٹھا کر بڑے درد بھرے انداز میں اسے سبق پڑھایا۔

"اس میں دکھی ہونے والی کون سی بات ہے؟ بلکہ خوش ہو جاؤ کہ تمہارا شوہر بھی نظر باز نہیں رہا۔"

"اپنی کزن 'یاد' ہونے اور نظر باز ہونے میں بھی بہت فرق ہے۔"

"میں تمہیں بھولا کہاں تھا؟" اس نے حیرت سے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ سومہ نے گہری سانس لی۔

"ہم یہ مذاکرات یہیں اینڈ کرتے ہیں ورنہ

مجھے غصہ آئے گا اور میں......" وہ پھر آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگی۔

"اوکے۔" وہ مان گیا۔

وہ مطلوبہ جگہ پہنچ گئے تو ایثار نے کار روکی اور اس کی سمت رخ کیا۔

"تمہاری تیاری میں کوئی کمی نہیں، میک اپ بھی ٹھیک ہے، تم اچھی لگ رہی ہو، ریلیکس ہو کر جاؤ اور انجوائے کرو۔"

"پہلے ہی کہہ دیتے، تب سے میں اتنی ہلکان تھی۔" کچھ تمام کر وہ اترنے لگی۔

"ٹھیک ہے۔" دروازہ بند کر کے وہ کھڑکی میں جھکی۔ "کال کروں تب آ جانا۔" اس نے مسکرا کر سر ہلایا۔ واپسی میں وہ اسے اندر لے گئی کہ اس کی ساری سہیلیوں کو اس سے ملنا تھا۔ اس کا بازو تھامے وہ اسے سب سے متعارف کروا رہی تھی اور وہ ایک ٹک سومہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی دوستوں میں کافی مقبول تھی۔ اس کی سہیلیوں نے ان دونوں کی ڈھیروں تصویریں بھی کھینچیں اور اب کار میں اسے سب موصول ہو رہی تھیں۔

"ہماری شادی سے اچھی تو یہ تصویریں ہیں۔" وہ فون میں تصویریں زوم کرتے ہوئے بڑی خوش تھی۔ "مجھے بتایا تو ہوتا میں بھی ریڈی ہو کر آتا۔" اس نے دل موہ لینے والی تیاری کے ساتھ مسکراتی سومہ کو دیکھا۔ وہ دفتر سے اسے لینے گیا تھا۔

"اچھا ہی ہوا، وہ ساری ایسے ہی......" وہ روانی میں بولنے لگی تھی کہ رک گئی۔

"یار! تم لگتی تو نہیں اتنی جیلس ٹائپ!" اس نے اسی وضع میں سر جھکائے فون کو دیکھتی سومہ کو دلچسپی سے دیکھا۔

"میں ہوں بھی نہیں اس ٹائپ کی۔" اس نے فون بند کر کے بیگ میں رکھا۔

"بس اپنی چیزوں کی حفاظت کی عادت ہے۔" اس نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے کھڑکی کی سمت چہرہ موڑ لیا اور ایثار کا بے ساختہ قہقہہ گونج اٹھا۔

☆☆☆

ایک شادی تو آناً فاناً ہو گئی تھی کہ اب عمارہ کی شادی پورے اہتمام سے کی جا رہی تھی۔ اصغر بیگ نے جب اس رشتے کے لیے ان کی رضا مندی مانگی تو دادا ابا نے 'جو تم سب کی مرضی' والا گول مول جواب دیا تھا۔ انکار نہیں کیا تھا یہ ہی ان کی رضا کا اشارہ تھا اور وہ بہت خوش تھے کہ سومہ سے ایثار کی شادی کا فیصلہ درست ثابت ہوا ہے۔ لہٰذا اب ان سے اتنے خفا نہیں جتنے پہلے تھے۔

اس کا بھی زیادہ وقت ادھر گزر رہا تھا۔ اپنی شادی میں جو ارمان رہ گئے تھے، وہ انہیں اب پورا کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ہر قدم پر سب اسے اس کی روکھی پھیکی شادی کی یاد دلا ہی دیتے تھے۔

اس وقت بھی ایثار نے اسے اپنے مخصوص روٹھے سے انداز میں کمرے کی سمت جاتے دیکھا۔ اس وقت دادا ابا اور اشرف بیگ کے ساتھ پھوپھا اور اس کے ماموں بھی تھے۔ وہ چاہ کر بھی فوراً ان کے گھیرے سے نکل نہیں سکا۔ کچھ دیر بعد ضروری فون کال کا بہانا بنا کر وہ اسے ڈھونڈتا کمرے میں آیا۔

"تم فنکشن چھوڑ کر ادھر کیوں آ گئیں؟" آج مایوں تھی اور وہ اسی کی مناسبت سے تیار ہوئی پلنگ پر آلتی پالتی مار کے بیٹھی تھی۔ اسے شوق تھا اور آج دل سے سجنے کا موقع ملا تھا۔ اس وقت وہ زرد گوٹا پٹی والے لمبے فراک میں چوڑیوں اور جھمکوں کے ساتھ ساتھ ماتھے پر ٹیکا بھی لگائے تھی۔ لائنر، مسکارے سے سجی آنکھیں، سرخ لپ اسٹک اور ہاتھوں میں مہندی، اس کی چھب آج معمول سے مختلف تھی۔

"میرے زخموں کے بخیے ادھڑ رہے ہیں، بھر بھر کے نمک پاشی ہو رہی ہے، ایک بار پھر ارمانوں کے خون کی یاد تازہ ہو رہی ہے......"

"ذرا آسان لفظوں میں اور اتنی سنگین مثالوں کے بغیر کہو پلیز۔"

"میری مایوں مہندی کچھ نہیں ہوئی، نہ کزنز نے

چھیڑا نہ اودھم مچایا، مجھ سے زیادہ وہ سب صدمے میں تھیں اور اب تک کہہ رہی ہیں، سومہ تمہاری باری کے مزے بھی ہم اب لے رہی ہیں، تمہاری شادی سے بور شادی آج تک نہیں دیکھی...... یہ اور وہ...... ان کی باتیں اور وہ سارے ہنگامے مجھے اپنی عجیب سی شادی کی یاد دلا رہے اور مجھے سچ میں افسوس ہو رہا ہے کوئی فنکشن ہوا نہ ڈھنگ کی تصویریں، میرے تو شادی کے کپڑے تک نہیں بنے تھے، کیا کیا نہیں یاد آ رہا، اس لیے آ گئی ادھر ورنہ میری شکل دیکھ کر پھر ایک نیا ٹریک شروع ہو جاتا تھا۔"

"تمہارا یہ افسوس ختم کرنے کے لیے کیا ہمیں دوبارہ شادی کرنا ہوگی؟" وہ اس کے سامنے جا کر کھڑا ہوا۔ سومہ نے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔

"جو ہو نہیں سکتا وہ کہہ کر اور دل نہ دکھاؤ میرا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" وہ بھی پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"ابو کہیں گے میری چھٹیاں نہیں ہیں، ممی کو خرچے یاد آئیں گے، عمارہ کہے گی جب میری ایک بار ہو رہی ہے تو اس کی دوبار کیوں اور بازیہ کہے گی آپی کی دوسری بار چھوڑیں اور میری منگنی بھی کر دیں......" وہ ذرا ٹھہری۔

"ہاں۔ تمہاری ہو سکتی ہے دوبارہ، پہلے والی کسی کو پسند نہیں تو سب خوشی خوشی اپنی پسند سے دوسری لانے کو تیار ہو جائیں گے۔"

"تمہارے ارمان تو پھر بھی رہ جائیں گے۔"

"یعنی......" وہ پوری اس کی طرف گھومی۔

"اس ساری بات میں تمہیں اپنی دوسری شادی پر اعتراض نہیں؟"

"یار! تمہارے ارمان ادھورے رہ جانے کا افسوس اس اعتراض سے بڑا ہے۔" اول دن سے ان کے بیچ کچھ بھی سیدھا تھا نہ سادہ تھا۔ وہ اس افسوس سے متاثر ہوئے بغیر سابقہ وضع میں آ گئی۔ وہ پیر لٹکائے ہی پیچھے بستر پر لڑھک گیا۔

"ویسے باقی سب کے ساتھ میری پسند بھی اہم ہے اور تم مجھے پسند ہو۔" ایثار نے کہا۔

"جھوٹ!" پٹ سے اور تیزی سے اس کے منہ سے نکلا۔

"بھولو مت، ہماری شادی سے دو دن پہلے تم ہانیہ سے شادی کرنے جا رہے تھے۔" اس نے پیچھے دیکھتے ہوئے اسے جتایا۔

"شادی سے پہلے تو مجھے تمہاری شکل بھی یاد نہیں تھی......" اس صاف گوئی پر وہ ٹھیک ٹھاک تلملا اٹھی۔

"پسند تو اب شادی کے بعد آئی ہو۔" اس نے فقرہ مکمل کیا۔ مڑ کر اسے ملامتی نظروں سے دیکھ رہی سومہ کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ وہ پھر سامنے دیکھنے لگی اور اسی وقت ایثار نے کھینچ کر اسے بھی پیچھے پلنگ پر گرا لیا۔

"تمہیں ہر وقت کسی نہ کسی بات پر کڑھتے رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔" اس نے سومہ کی طرف کروٹ لی۔ "جو ہونا تھا ہو گیا اور اچھا ہوا۔ میں خوش ہوں کہ میری زندگی میں ہانیہ نہیں تم آئیں۔"

"سچ میں؟"

"جی اور اس لیے اب ہماری شادی کا افسوس مت کیا کرو، ہاں تمہیں میں نہیں پسند تو پھر تمہارا افسوس کرنا بنتا ہے۔"

وہ چپ چاپ چھت کو دیکھنے لگی۔

"مطلب تمہارا افسوس نامہ جاری رہے گا؟" اس نے کہنی بستر پر ٹکا کر ہتھیلی کنپٹی پر رکھی۔ وہ اب بھی چپ رہی۔

سومہ......" ایثار نے پکارا۔

"میں سوچ رہی تھی، تم مجھے پسند ہو یا نہیں؟" اس نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ ایثار کے چہرے پر بڑی بے ساختہ مسکراہٹ پھیلی۔

"پھر؟" چند پل ان کے درمیان معنی خیز سی خاموشی چھائی رہی۔

"ایکسل شیٹ والی بکواس نظر انداز کر دوں تو تم مجھے برے نہیں لگتے۔"

"اسے ساری عمر نظر انداز ہی کرو اور آئندہ جو

ہونے کا اس کا رنج مت کرنا کہ جو ہوا، وہ ان کھوئی ......"
ہوں سے زیادہ اہم اور خوبصورت ہے
ایثار نے اس کے ماتھے کا الٹا پڑا ٹیکا درست
کیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ
چھوٹی موٹی سی خواہشوں کی پریاں ان کے درمیان
اتر آئیں۔ ان دھڑکتے لمحوں میں ایک خوبصورت
رسم پوری ہونے جا رہی تھی کہ دروازے کے قریب
قدموں کی چاپ ابھری اور سومہ جھٹ اٹھ کر کھڑی
ہو گئی۔

"آپ کو سب وہاں ڈھونڈ رہے ہیں سومہ
آپی۔" دروازے میں اس کی دس سالہ کزن ذکری
کھڑی تھی۔

"سب سے کہہ دو، سومہ آپی کہیں گم ہو گئی ہیں،
مل نہیں رہیں۔" وہ بھی اٹھ کر بیٹھا۔ تب ہی دور سے
دادا ابا کی پکار سنائی دی۔

"میں دادا ابا سے کہہ دیتی ہوں، تم کہیں گم
ہو گئے ہو۔ مل نہیں رہے۔" اس نے جھٹے ہوئے
آگے آ کر ذکری کا ہاتھ تھاما۔

"ان سے کہنا فضول ہے، وہ پاتال کھنگالنے کا
بلٹ رکھتے ہیں۔" وہ اس سے پہلے باہر نکل گیا۔

"یہ فرماں برداری!" اس نے ایک گہری
سانس خارج کی تھی۔

☆☆☆

تائی امی!" وہ پر جوش سی باورچی خانے سے
ہی آواز لگاتی باہر آئی۔

"کہاں گئیں؟" انہیں وہاں نہ پا کر اس نے
ایثار سے پوچھا۔

"دادا ابا کو بلانے گئی ہیں۔"

"دیکھو، کتنی گول روٹی بنی ہے مجھ سے۔" اس
نے فخریہ انداز میں پلیٹ ایثار کے سامنے رکھی۔ آج
اتوار تھا اور تائی اپنے میکے گئی ہوئی تھیں۔ دوپہر کے
کھانے سے پہلے یہ اس کی آخری روٹی تھی۔

"گول تو ہے۔" اس نے روٹی کو دیکھ کر سر
ہلایا۔

"اتنی اچھی روٹی بنائی اور اتنا ٹھنڈا ری
ایکشن!" اس نے کمر پر ہاتھ رکھا۔ وہ اتنے جوش
میں ساس کو دکھانے آئی تھی کہ آج ان کا شکوہ دور ہو
جائے گا لیکن وہ نہیں ملیں اور شوہر نامدار ذرا متاثر
نہیں ہوئے تھے۔

"ایسے کاموں پر حوصلہ بڑھانے کے لیے
انعام دیا جاتا ہے، ہاتھ چومتے ہیں لوگ، پیٹھ
تھپتھپاتے ہیں، یہ سب تو دور مجھے ڈھنگ سے
شاباشی دینے والا بھی نہیں کوئی۔"

اس نے منہ پھلایا۔ ابھی آگے مزید کہنے جا
رہی تھی کہ ایثار نے اس کا کمر پر رکھا ہاتھ ہٹایا اور اس
کے قول کے مطابق حوصلہ بڑھایا۔ سومہ کا منہ کھلا ہی
رہ گیا۔

"روٹی دو ہاتھ سے بنتی ہے۔" اس نے فوراً
دوسرا ہاتھ پیچھے کیا۔

"ویسے تم باتیں بھی بہت اچھی بناتی ہو۔" اس
کا پیچھے والا ہاتھ جھٹ کھلے منہ پر رک گیا۔

دور سے دادا ابا کی آواز آئی تو اس نے ہاتھ
چھڑایا اور باورچی خانے کی سمت دوڑ لگائی۔ چند
سیکنڈز میں ہی اتنا کچھ ہو گیا تھا۔ وہ باورچی خانے
میں بھی ہاتھ پیچھے کیے کھڑی تھی۔

"قابلی سومہ کی گول روٹی۔" ان دونوں نے
اپنی کرسیاں سنبھالیں۔ ایثار نے پلیٹ اٹھا کر ماں
کے سامنے رکھی۔

"آ جاؤ تم بھی۔" انہوں نے تنقیدی نظر ڈال
کر پلیٹ ایک طرف سرکائی اور باورچی خانے کی
سمت رخ کر کے اسے بلایا۔ کب تک ادھر چھپی
رہتی، آنا ہی پڑا۔

"ایک دو نہیں ساری روٹیاں ایسی گول بنی
چاہئیں۔" انہوں نے مشقت سے بنی گول روٹی
توڑتے ہوئے کہا۔ ہر شکل کی روٹی کے آخر بے شکل
نوالہ بننے والا فلسفہ بیان کرنے کے بجائے خلاف
عادت اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"اور ہر گول روٹی پر سومہ کا انعام پکا۔" ایثار

پہلی بار ماں اور بیوی کے درمیان کودا۔
"اسے کا ہے کا انعام!" الفت نے تنک کر کہا۔ "وہ تو ہمیں ملنا چاہیے کتنے دن سے مختلف نقشے کھا رہے ہیں۔"
وہ دونوں مسکراہٹ چھپانے چپ چاپ اپنی پلیٹوں پر جھکے تھے۔

☆☆☆

نثار کا تبادلہ حیدر آباد ہوا تھا اور وہ اگلے ہفتے لبنیٰ کو لے کر وہاں جا رہا تھا۔ اس نے آج یہ فیصلہ والدین کو سنایا تھا۔ الفت اس بات پر ناراض تھیں کہ اجازت تو دور اس نے مشورہ تک نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا وہ پہلے جا کر خود وہاں سب انتظامات کرے، چند ماہ رہ کر دیکھے اور سب مناسب لگے تو ہی لبنیٰ کو لے جائے۔ وہ غلط تو نہیں تھیں مگر نثار کا کہنا تھا مناسب ہو نہ ہو، یا جیسا بھی ہو جب وہ ہر حال میں بیوی کو ساتھ رکھنا چاہتا ہے تو ساتھ ہی لے جانا ٹھیک ہے اور بات بڑھتے بڑھتے روایتی رنگ اختیار کر گئی۔ آخر میں دادا ابو نے فیصلہ سنایا اور وہ دونوں اپنے کمرے میں چلے گئے۔
"آپ نے ایک کو اجازت دی تو دوسرا بھی یہ ہی کرے گا۔" الفت سسر کی خاموشی پر اور برہم ہو رہی تھیں۔ یہ ایک طرح سے ان کی حمایت تھی۔
"ایثار کی نوکری نہیں کہ اسے کہیں جانا پڑے۔"
"صاعقہ کی بیٹی کو آپ نے اس کی بیوی بنایا ہے، کل کو وہ اسی شہر میں الگ گھر لے کر رہنے کا شوشہ چھوڑ دے تو؟"
"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔"
"کیوں نہیں ہو سکتا؟ وہ نثار کے اس فیصلے کو وجہ بنائے گی کہ انہیں جانے دیا تو اب ہم بھی جائیں گے۔"
وہ اسے بلا ضرورت نہ صرف اس معاملے میں گھسیٹ رہی تھیں بلکہ صاعقہ کی بیٹی ہونے کی وجہ سے انہیں اس کی رو باوہ سرشت اور ... کا بھی یقین تھا۔ باورچی خانے میں کھڑی سومہ کو دکھ ہوا۔
"آپ بھی تو کچھ کہیں۔" الفت کو شوہر پر بھی غصہ تھا۔ پہلے وہ باپ کے سامنے چپ رہتے تھے، اب بچوں کے آگے۔
"کوئی کچھ نہیں کہے گا اب۔" دادا ابا کی کڑک دار آواز گونجی۔ "فیصلہ ہو چکا، نثار اور لبنیٰ ایک ساتھ حیدر آباد جائیں گے۔ ایثار اور سومہ ہمیشہ یہیں رہیں گے۔"
"لو جی ہو گیا فیصلہ!" اس نے سوچا۔ "جن کا لینا دینا بھی نہیں ان کا بھی۔"
"انہیں اپنی مرضی کرنے دی تو دیکھنا ایک دن ہم بوڑھے تنہا رہ جائیں گے اس گھر میں۔" اب وہ رو رہی تھیں۔
"ایثار!" دادا ابا کی پکار پر وہ چونکی۔ ایثار کب آیا؟ وہ اس وقت گھر نہیں آتا تھا۔
"کیا تم کبھی بھی یہ گھر چھوڑ کر جانا چاہتے ہو؟"
"دادا ابا! میرا......"
"ہاں یا نہ میں جواب دو۔" ان کا انداز حکمیہ تھا۔
"نہیں۔"
"ہو گئی تسلی۔ اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی۔" دادا ابا شاید اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ الفت اب اشرف بیگ کے سر تھیں کہ یہ سب غلط ہو رہا ہے۔ دادا ابا کو ان کی بیٹی پٹیاں پڑھا رہی ہیں۔ بیٹا "سسر دونوں ان ماں بیٹی کی مٹھی میں ہیں اور یہ سب دیکھ کر سومہ کے بھی جلد پر نکل آئیں گے۔"
"ایثار پر بھروسا رکھو، وہ ایسا کبھی نہیں ہونے دے گا۔" تایا ابا کی بات پر وہ اسٹول پر بیٹھ گئی۔ سب کو ایثار پر بھروسا تھا، ایسے میں کیا وہ بھی اس پر بھروسا کر سکتی تھی؟ کیا یہ دونوں باتیں ایک ساتھ ممکن تھیں؟ ایک بار پھر اس کا ذہن بھٹکنے لگا۔ اسے ہمیشہ یہی دھڑکا لگا رہتا تھا اچانک کسی دن، کسی بات پر ایثار ... اسے ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیا جائے گا اور بس یہیں آ کر اس کی سوچ مفلوج ہو جاتی تھی۔
جانے وہ کتنی دیر تک باورچی خانے میں بیٹھی رہی۔ وہ اپنے لیے چائے بنانے آئی تھی مگر سب بھول کر جب وہ وہاں سے نکلی تو ہال میں صرف الفت بیٹھی تھیں۔ وہ ان کے سامنے سے گزر کر جانے لگی تو ان کی آواز آئی۔
"تم اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ ایثار تمہیں اس گھر سے لے جائے گا۔"
"میں نے کب کہیں جانے کا کہا اور میری کس بات سے لگا آپ کو کہ میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں؟" وہ بہت سنجیدہ تھی۔
"ہونہہ! یہ ڈھکوسلے ایثار کے سامنے کرنا۔" ان کا انداز آج ہمیشہ سے مختلف تھا۔
"سب جانتی ہوں میں اندر اندر تم ماں بیٹی کی کیا کھچڑی پک رہی ہے۔"
خود ساختہ مفروضات کا کوئی علاج نہیں، اس کے سامنے کوئی دلیل اور ثبوت کارگر ثابت نہیں ہوتا۔ اتنے دنوں سے ان کے سلوک کو دیکھتے ہوئے اسے لگنے لگا تھا کہ تائی امی اسے اتنا ناپسند نہیں کرتی ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ تھی کہ کسی اور کی حرکت، کسی اور کا غصہ اور معتوب وہ ٹھہری۔
وہ بات بڑھائے بنا وہاں سے جانے لگی کہ پھر پیچھے سے انہوں نے کہا۔
"یاد رکھو، دادا کے ایک حکم کی دیر ہے، ایثار تمہیں ہاتھ پکڑ کر باہر کر دے گا اور وہ دن آئے گا ضرور۔"
وہ تیزی سے اپنے کمرے میں آ گئی کہ وہ مزید زہر افشانی نہ کریں۔
جب سے سوچتے سوچتے اس کا ذہن سارے خدشات اور متوقع صورت حال سوچ چکا تھا۔
ایثار غسل خانے سے باہر نکلا تو وہ کمرے کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔
"کہاں تھیں تم؟ کال کی تو فون بھی یہیں تھا تمہارا اس طرف گئی تھی؟" اس نے تولیہ کرسی کی پشت پر ڈال کر اسے دیکھا
"ہیلو!" اس نے سامنے آ کر چہرے کے آگے چٹکی بجائی۔ "میں یہاں تک بھری ہوں......" اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھا۔
"دھکا بھی لگا نا تو بری طرح پھٹ پڑوں گی۔" اس نے تنبیہی انداز میں کہہ کر اکیلے رہنے کی خواہش کا عندیہ دیا اور اس کی سمت پشت کر لی۔ ایثار پھر سامنے آیا، اس کے سر پر وہیں ہاتھ رکھا جہاں اس نے رکھا تھا اور اس کا رخ پورا اپنی طرف کیا۔
"دھکا لگ گیا، اب پھٹ پڑو، خالی کر لو خود کو۔" اس نے ہونٹ بھینچ کر اور پلکیں جھپکا کر پھر کچھ تنبیہ کرنا چاہی لیکن الفاظ منہ سے نکلے ہی نہیں۔
"رونے میں کیا شرمانا۔" ایثار نے جیسے حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا اور وہ واقعی پھٹ پڑی۔
"ارے تم تو اس معاملے میں کافی بے شرم ہو......" اس نے ماحول ہلکا کرنا چاہا۔ وہ دونوں ہاتھ سے چہرہ ڈھانپے زار و قطار رو رہی تھی۔
"اتنے آنسو کس بات پر؟" اس نے شانوں سے پکڑ کر اسے پلنگ پر بٹھایا۔ وہ کچھ کہے بنا روتی رہی۔ ایثار نے بمشکل اسے چپ کرایا۔
"تم اتنی نا سمجھ یا کمزور تو نہیں کہ یوں رونے لگو۔" وہ بھی اس کے سامنے ٹک گیا۔
"ایثار! تم اور میں بہت مختلف ہیں، ہم دونوں کا مزاج، زندگی برتنے اور گزارنے کا طریقہ بھی الگ ہے، دادا ابا اب تک ابو اور امی کو سزا دے رہے ہیں، انہوں نے انہیں معاف نہیں کیا، تائی امی بھابھی کو دل سے قبول نہیں کر پائیں اور ہم دونوں ... " وہ رک گئی۔
"ہم دونوں کیا؟"
"ہم دونوں اتفاق سے اس بندھن میں بندھ گئے ہیں ورنہ یہ ناممکن تھا۔"
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے، ہم جیسے بھی

بندھے ہوں، اب راضی ہیں اور یہ کافی ہے۔"

"یہ کافی نہیں ہے ایثار!" اس کی آنکھ میں پانی جمع ہونے لگا۔ وہ واضح طور پر حیران ہوا، اس کے چہرے سے الجھن مترشح تھی۔

"امی یا دادا ابا نے پھر کچھ کہا ہے تم سے؟" اس نے انکار میں سر ہلایا۔

"یہ تو صاف ہے تم ان کی باتیں اور میری نہ سن چکی ہو۔" اس نے سر جھکا لیا۔

"تمہیں الگ ہونا ہے؟" اس کی آواز میں حیرت تھی نہ بے یقینی۔ عام سے انداز میں اس نے پوچھا تھا۔

"نہیں لیکن ہم دونوں کو زندگی سے مختلف چیزیں چاہئیں، ہماری اس سے توقعات اور مقصد بھی مختلف ہیں۔"

"وہ کیا؟"

"مجھے انصاف اور تمہیں امن و سکون۔"

"میں نے کوئی ناانصافی کی تمہارے ساتھ؟" اب کے وہ حیران تھا۔

"ابھی تک تو نہیں۔"

"تم اوور تھنکنگ کا شکار ہو سومہ! مجھے صرف تم چاہیے ہو۔ جو جیسی ہو ویسی اور کچھ نہیں، میری کوئی ڈیمانڈ نہیں۔"

"میری ہے۔"

"اور میں وہ پوری کیوں نہیں کر سکتا؟" اس نے ایک گہری سانس لی۔

"ہمارے بیچ ایک دیوار کا فاصلہ تھا، اس کے باوجود تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ میری بے تحاشا باتیں دراصل میرے اندر کی بے کلی اور خلا ہے جو میری آواز کے شور سے کچھ کم ہو جاتا ہے۔

کسی بڑے مفکر یا فلاسفر نے کہا تھا 'انصاف کے بنا امن ناممکن ہے' اور میرا یقین بھی یہی ہے۔ میرے تیس سالہ تجربے اور مشاہدے کے بعد میرا ایمان ہے کہ انصاف کے بنا امن اور سکون نہیں رہتا، نہ دل میں نہ زندگی میں نہ گھروں میں نہ رشتوں میں۔

سکون کے لیے محبت کافی نہیں، ممی ابو کی زندگی اس کی مثال ہے۔ انہوں نے گھر والوں کے خلاف جا کے محبت حاصل کی تھی مگر بعد میں ان ہی گھر والوں کی وجہ سے زیادہ وقت لڑتے رہتے ہیں۔ دادا ابا نے انہیں گھر میں جگہ دے دی، دنیا کے لیے ممی کو قبول بھی کر لیا لیکن معاف نہیں کیا۔

پوتے نے محبت کی، تو اسی نے محبت کی ان کی خوشی خوشی شادی کروا دی، کم سے کم اس کے بعد تو انہیں ممی ابو کی رسی چھوڑ دینی چاہیے تھی مگر ابو کی نافرمانی اور غلطی کی قیمت وہ اب تک وصول کر رہے ہیں۔

دو بیٹوں کے خاندان اور ان کے بچوں کے ساتھ دادا ابا نے ایک سا رویہ نہیں رکھا، عدل نہیں کیا۔ وہ ممی ابو سے خفا تھے بھی تو ہم تینوں کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ بچپن سے ہمیں وہی پیار اور توجہ دی ہوتی جو تمہیں اور نثار بھائی کو دی تو ہمارے دل میں بھی شاید ان کی وہی عزت اور مقام ہوتا جو تمہارے دل میں ہے، وہ تو ہمارے نام تک نہیں لیتے ہیں،

وہ سربراہ تھے تو ظاہر ہے ان کے بعد سب نے اس رویے کی تقلید کی اور ابو، وہ دادا ابا کو پہنچائی تکلیف کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش میں اکثر بیوی بچوں کے ساتھ ناانصافی کر جاتے ہیں، ان کا رویہ بھی عدل کے منافی ہے، رشتوں کا مقام یہاں کسی نے متعین کیا ہی نہیں تو اس کے تقاضے اور حدود کیا طے کرتے کہ کسی کو خوش رکھنے کہاں تک جانا ہے، کہاں سے دوسرے کے ساتھ زیادتی شروع ہوتی ہے، کسی کا دل خوش کرنے کے لیے دوسرے کا دل دکھانا کب تک ٹھیک ہے۔

دادا ابا اور پھر ابو ممی کے رویے نے ہم سب کو اس گھر سے متنفر اور دور رکھا۔ ممی ابو کو پوری کوشش کرنی چاہیے تھی بلکہ یہ ان کا فرض تھا کہ ہم بچے اپنے دادا اور تایا کے گھر والوں سے بدل نہ ہوں۔" وہ ذرا سا رکی۔

"مجھے کہتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا لیکن ممی ابو نے پہلی اور آخری اولاد والا پروٹوکول اور محبت بیچ والی کو نہیں دی، میں ہمیشہ پیچھے رہی یا نظر انداز ہوتی رہی۔ ان کی اس ناانصافی نے مجھے ہمیشہ بے چین رکھا، میں نے کبھی اس بات کو دل میں نہیں رکھا، ہمیشہ اظہار کیا کہ عماد اور ماریہ کی اہمیت مجھ سے زیادہ ہے مگر اس کے بعد بھی میں بے سکون ہی رہی، اس امتیاز کی وجہ سے میری مکمل شخصیت میں کئی خلا ہیں، کئی کمیاں ہیں۔

محبت اور پسند پر اختیار نہیں ہوتا ہے، کوئی ہمیں زیادہ پسند ہے، کسی سے ہمیں زیادہ محبت ہے تو اس معاملے میں ہم کچھ نہیں کر سکتے لیکن ایک چیز جو اس سے زیادہ اہم اور ہم انسانوں کے اختیار میں ہے۔ وہ ہے سلوک میں انصاف اور مساوات، ظاہری رویوں میں اعتدال اور برابری۔ محبت کم زیادہ کریں کہ اکثر اس معاملے میں انسان بے بس ہے مگر سلوک تو ایک سا کریں، ظاہری رویے سے دوسرے کو کمی کا احساس تو نہ کرائیں اپنی والدین۔

میرا اور ممی ابو کا معاملہ ہے۔ اس میں تم کچھ نہیں کر سکتے، میں محض اس لیے کہہ رہی ہوں کہ اس عدم توازن نے مجھے وہ بنایا جو میں آج ہوں اور انصاف کے معاملے میں کمپرومائز نہیں کر سکتی۔"

وہ کچھ حیران اور کچھ اداس بغور اسے سن رہا تھا۔ نہ جانے کب سومہ کے ہاتھ اس کے ہاتھ میں آگئے تھے۔ اسے نہیں علم تھا دیوار کے اس طرف بظاہر عام سی اور خوش مزاج کزن کس محرومی کا شکار رہی ہے۔

"تم اختلاف، بحث اور لڑائی سے بچتے اور امن قائم رکھنے کی خاطر سب کی سن لیتے ہو، مان لیتے ہو، خود کو بھی پس پشت ڈال دیتے ہو اور مجھے اب ڈر لگ رہا ہے کہ سب کو خوش رکھنے والا تمہارا مزاج ایک دن ہمارے درمیان بھی یہی سچویشن لے آئے گا جہاں انصاف کا ترازو بیلنس نہیں رہے گا اور جہاں ناانصافی ہو، وہاں دل میں برائی آ ہی جاتی ہے، امن سکون قائم نہیں رہتا۔

تمہارے امن قائم رکھنے والے رویے سے ہو سکتا ہے میرے دل میں بھی تائی امی اور باقی سب کے لیے تلخی، جذبات اور انتقامی خیالات جمع ہو جائیں۔

میں نے ساری عمر خود کو ان سے بچایا ہے، میں نے کوشش کی کہ اس گھر کے مکینوں کی طرح اپنے دل میں دوسروں کے لیے تلخی نہ رکھوں، شکوے اور باتیں جمع نہ کروں، خوامخواہ کسی کو ناپسند نہ کروں، میرا ایکپر، عادتیں اور زیادہ بولنا بھی اس لیے ہے کہ مجھے اپنی زندگی میں اور کوئی ناانصافی نہیں چاہیے، میں نے عہد کیا ہے کسی کو اپنے ساتھ زیادتی اور ناانصافی کرنے نہیں دوں گی....."

آنسو گالوں پر پھسل آئے اور اس نے سر جھکا لیا۔

"اب تم اتنے اہم ہو گئے ہو کہ مجھے بہت کچھ برا لگ جاتا ہے جو پہلے نہیں لگتا تھا۔ تمہیں بھی پتا ہے میرے اندر بیویوں والی محبت سے پہلے بیوی والی جلن جاگی تھی، مجھ پر ہر وقت یہ خوف سوار رہتا ہے، دادا ابا تمہیں کچھ حکم دیں گے اور تم....." اس سے بولا نہیں گیا۔

"سومہ!" ایثار نے ہاتھ چھوڑ کر اس کے آنسو پونچھے۔

"میں تمہیں اس کے لیے کبھی معاف نہیں کروں گا۔" اس کا لہجہ ہی تاسف بھرا نہیں تھا۔ چہرے کے تاثرات بھی افسردہ تھے۔

"آں.....؟" اس کی حیرانی بڑی بے ساختہ تھی۔

"آج سے پہلے کسی نے اتنا گھبرا کے آئی لو یو نہیں کہا ہوگا....."

ایثار نے بڑے دکھی انداز میں کہا۔ وہ اس وقت بے حد دکھی تھی، اس نے مان لیا تھا ان کا ایک ساتھ رہنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے اور اگلی بات وہ یہی کہنے جا رہی تھی مگر ایثار کی بات پر اگلی سانس

باتیں اس کے ذہن سے محو ہو گئیں۔
"اور وہ بھی ایسا روتے ہوئے۔"
"میں اتنی سیریس ہوں اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے!" وہ بیچ میں خفا ہو گئی۔
"مجھے یقین ہے تم سیریس ہو تم بھی یقین کرو، میں مذاق نہیں کر رہا۔" وہ مسکرایا مگر چہرہ پرسوچ تھا۔
"تمہارا تجربہ، مشاہدہ، تجزیہ سب ٹھیک ہے۔ یہ سب تھوڑا بہت میں نے بھی کیا ہے، سنو گی؟"
سومہ نے سر ہلایا۔
"زندگی میں آئیڈیل بچویشنز نہ کے برابر ملتی ہیں۔ تم جس کی امید کر رہی ہو، وہ ناممکن تو نہیں لیکن آئیڈیل ہی ہے کہ محبت کم زیادہ ہو مگر رویے انصاف کے ترازو کو بالکل بیلنس رکھیں۔
سکون اور امن کے لیے سب سے پہلی قربانی ہمیں خود دینا پڑتی ہے۔ محبت، سکون، انصاف، سارے رشتے اور ان سب کی خوشیاں، اپنے دونوں ہاتھوں میں اتنا ہی سمیٹنا چاہیے جتنا سنبھال سکیں، سب کچھ قریب اور پرفیکٹ رکھنے کی کوشش مسلسل مشقت ہے کہ یہ نہ پھسلے، وہ نہ چھوٹے، بندہ بس تھکتا ہے، انجوائے کچھ نہیں کرتا۔
رشتوں میں بھی ترجیحات سیٹ کر لیں تو آسانی ہو جاتی ہے، جیسے مجھے اس تعلق میں ہر حال میں ایمان دار رہنا ہے، یہاں بغض نہیں پالنا، زیادہ الجھنیں پیدا ہونے لگیں تو تھوڑا فاصلہ رکھ لینا ہے، یہ تعلق اتنا خاص ہے کہ تھوڑا کمپرومائز کر لینا ہے، یہ اتنا اہم ہے کہ اس کے لیے تھوڑا جھک جانا ہے وغیرہ۔
ہاں یہ مانتا ہوں کہ والدین کا رویہ سب بچوں کے ساتھ ایک سا ہونا چاہیے، یہاں انصاف لازم ہے مگر اس کے علاوہ سب کچھ برابری کا یہاں کم ہی ملتا ہے یعنی میری اتنی محبت اور فکر ادھر بھی ہو، یا جتنا میں ایڈجسٹ کر رہا ہوں، بالکل اتنا ہی مقابل بھی کرے، ایک بار میں جھکا تو اگلی دفعہ وہ ہی جھکے، معافی اور درگزر کا حساب بھی برابری کا رہے، ایسا نہیں ہوتا بلکہ ان سب میں ایک پلڑا ہمیشہ جھکا ہی رہتا ہے، ان شارٹ تعلقات میں پرفیکٹ جسٹس اور بیلنس مشکل ہے۔" وہ ذرا دیر کو ٹھہرا تھا۔
"ان سب کے ساتھ کہوں گا کہ مجھ پر بھروسا کرو سومہ! پرفیکٹ زندگی اور پرفیکٹ ماحول کا وعدہ نہیں کرتا لیکن میری وجہ سے تمہارے اندر کوئی بے کلی بے چینی نہیں اترے گی یہ وعدہ۔ یہ سچ ہے کہ مجھے گھر اور اپنی زندگی میں شانتی پسند ہے لیکن یہ بھی یاد رکھو میں ان ریز عمل فیصلے نہیں کرتا۔"
ذرا دیر پہلے روتے ہوئے وہ سوچ چکی تھی کہ انہیں الگ ہو جانا چاہیے کہ ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ وہ دونوں ساری عمر اس تنگ رسی پر چلیں، ہمیشہ خدشات سر پر ڈولتے رہیں اور گھر والے انہیں الگ کرنے پر کمربستہ ہوں، اس سے اچھا تھا اس وقت راستے الگ کر لیے جاتے۔
اسی خیال نے اتنا رلا دیا تھا مگر اس پل ایثار کی بات اسے نادم کر گئی۔ وہ حد درجہ ناامید اور قنوطیت کا شکار ہو گئی تھی جبکہ وہ مثبت اور پرامید تھا۔
"میں اب بھی مانتی ہوں ایثار! کہ عدل کے بنا امن ممکن نہیں اور میں اتنی مایوس ہو گئی تھی کہ ابھی تم سے کہنے والی تھی ہمیں آگے بڑھنے کے بجائے ابھی الگ ہو جانا چاہیے۔" اس نے سر جھکا کے اعتراف کیا۔
"اور میں مانتا ہوں کلیئر پرائرٹیز کے ساتھ رشتہ اور سکون قائم رکھنے کی صرف ہماری اپنی خواہش ہی کافی ہوتی ہے پھر ہم اس کی خاطر خوشی خوشی سب کچھ کر لیتے ہیں، اور......" اس نے پھر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے۔
"میں کہنے والا تھا اب جب کلیئر ہے کہ ہم اس ساتھ سے خوش ہیں تو ہمیں خوشی خوشی التوا میں پڑے معاملات بھی نپٹا لینے چاہئیں۔" سومہ نے سر اٹھایا اور ایثار کی نگاہوں سے ہوتی معاملات کی تشریح اسے سرخ کر گئی۔

☆☆☆

"ارے ادھر کیوں آگئے؟" آہٹ پر وہ پلٹی تو ایثار اندر آرہا تھا۔
"گرمی ہے بہت، وہیں بیٹھو بس ہو گیا میں بھی آرہی ہوں۔" اس نے آخری روٹی توے سے اتارتے ہوئے کہا۔ اتوار کا دن ہی وہ دوپہر میں گھر ہوتا تھا۔
"میں گول روٹیاں چیک کرنے آیا ہوں۔" اس نے بات بات میں جھانکا۔
"آج تو ایک بھی پرفیکٹ گول نہیں بنی۔" وہ ہنسنے لگی۔
"اور تم اس پر خوش ہو؟"
"دکھی کیوں ہوتا اس بات پر؟"
"یہ ہوتا ہے، جب بنا محنت کے انعام ملے تو لوگ محنت سے جان چراتے ہیں۔" اس کی بات پر اسے زور سے ہنسی آگئی۔ اسی وقت الفت اندر آگئیں۔
"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" انہوں نے حیرت سے بیٹے کو دیکھا۔ انہیں یاد نہیں آیا اس سے پہلے کب وہ ادھر آیا تھا۔
"بہت بھوک لگی ہے امی! اس لیے دیکھ رہا تھا کتنا وقت ہے۔"
"بیٹھو لگا رہی ہوں میں نبیل۔" انہوں نے کراہت چھپانے کی کوشش کرتی سومہ کو ناگواری سے دیکھا۔
"خیال رکھا کرو، لیٹ نہ ہو۔"
"جی۔" خلاف معمول اس نے جتایا نہیں کہ دیر نہیں ہوئی ہے ابھی دو بجے ہیں اور یہ ہی وقت ہے کھانے کا۔
"آپ دادا ابا اور تایا ابا کو بلالیں، تب تک میں کھانا لگا رہی ہوں۔" اس نے مصروف انداز میں کہا۔ وہ کچھ کہے بنا چلی گئیں۔
"مرچ مسالے حساب سے ڈالا کرو، یہاں کوئی مریض تو نہیں ہے۔" پہلا نوالہ منہ میں رکھتے ہی انہوں نے تنک کر کہا اور بغور ان کا چہرہ دیکھتی عادت کے برعکس وہ چپ ہی رہی۔ اسے اس تنکنے کی وجہ سمجھ میں آگئی تھی۔

☆☆☆

اگلا دن ایک نیا امتحان لینے بیدار ہوا تھا۔ بازار میں تائی امی سے ہانیہ کی امی ٹکرا گئی تھیں اور ایک دوسرے کے لیے زمانے بھر کا غصہ دبائے دو عورتوں کا سامنا حسب دستور طوفان لے آیا۔ الزام تراشی اور نئے نئے انکشافات کے دوران رازوں سے پردہ اٹھا اور اصل تباہی سومہ کی زندگی میں مچی۔
جس دن ہانیہ نے زیادہ مقدار میں نیند کی گولیاں نگل لی تھیں۔ اس دن صبح اسے فون کال موصول ہوئی تھی جس میں اسے ایثار کی غلط عادتوں اور برے کردار سے باخبر کیا گیا تھا۔ ہانیہ نے جب یہ بات گھر میں کہی تو فون کا وقت سب کو مشکوک لگا۔
سب کا خیال تھا یہ کسی حاسد اور دشمن کی شرارت ہے۔ انہوں نے اپنی طرف سے اچھی طرح چھان بین اور تسلی کرنے کے بعد ہی رشتہ طے کیا تھا۔ ایثار کے متعلق ان کی معلومات میں کوئی قابل گرفت بات نہیں تھی۔ معاشرے میں اور جان پہچان والوں میں دادا ابا کا نام اور مقام تھا۔
بزرگوں کا خیال تھا اس نازک وقت میں ایسی بات کہنا یا تصدیق کی کوشش کرنا کہیں شادی مشکل میں نہ ڈال دے کہ دادا ابا کا مزاج بھی سب جانتے تھے۔ غور و فکر اور مشورے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ابھی کسی سے کچھ نہ کہا جائے۔ شادی کے بعد دیکھا جائے گا کب اور کس سے کہا جائے کہ رشتہ ہر لحاظ سے اچھا تھا۔ کوئی اسے اس مشکوک فون کال کی وجہ سے کھونا نہیں چاہتا تھا۔
بڑوں کا یہ فیصلہ ہانیہ کو منظور نہیں تھا اور جب کسی نے اس کے تحفظات کو توجہ اور اہمیت نہیں دی تو اس نے نیند کی گولیاں کھالیں۔ پڑھی لکھی سمجھدار اور باشعور بیٹی کی اس حرکت نے اس کے والد کو بھی آئی سی یو میں پہنچا دیا۔ اس کی امی نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ شوہر اور بیٹی کی حالت کے بعد وہ کسی قیمت پر

اس شادی کے لیے راضی نہیں تھیں۔ ان کے نزدیک یہ رشتہ ہی منحوس تھا اور یہ اللہ کی جانب سے بروقت اشارہ تھا کہ آگے نہ بڑھا جائے۔

اس کے بعد ہانیہ کے چچا نے دادا ابا کو فون پر نکاح سے منع کر دیا۔ ہانیہ نے کافی دن بعد ماں کو بتایا کہ فون کس نے کیا تھا۔ وہ اپنے بہی خواہ کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی لیکن جب اسے ایثار اور سومہ کی شادی کا علم ہوا تو اسے اپنے استعمال کیے جانے اور بے وقوف بن جانے پر شدید غصہ آیا تھا۔ اس کے بعد بھی ہانیہ کے والد کی طبیعت کے پیش نظر بڑوں نے طے کیا تھا کہ اسے مزید لمبا نہ کھینچا جائے۔

ظاہر ہے آمنے سامنے یہ سب کہنے سننے کے بعد گرما گرمی، بحث اور لڑائی جھگڑے ہونے ہی تھے۔ ساری احتیاط اور درگزر آج بے کار ثابت ہوئی تھی۔ اصل الزام اس مخبر کا نام معلوم ہونے کے بعد ہی لگے تھے اور اب الفت غصے سے کانپ رہی تھیں۔

"یہ سب ان کی ملی بھگت تھی ابا! اسی لیے تو فوراً بیٹی دے بھی دی ہمیں یہی تو ان کی منشا تھی، ہم کیسے ان کے ہاتھوں کھلونا بنے۔ ہمارے خون میں نہیں ایسی چالاکیاں......" ان کی اونچی آواز سن کر وہ دونوں بھی کمرے سے باہر نکلے تھے۔

"کیا ہوا امی؟" ایثار نے پوچھا۔ انہوں نے اسے ان سنا کر کے پیچھے کھڑی سومہ کو کھینچ کر سامنے کیا اور کوئی کچھ پاتا، اس سے پہلے ہی کمرہ زنا نے دار تھپڑ کی گونج سے بھر گیا۔

"امی!" ایثار اپنی آنکھوں کے سامنے رونما ہوئے واقعے پر بے یقین سا ماں اور بیوی کے بیچ آیا۔

تکلیف کے مارے سومہ کے آنسو نکل آئے تھے۔ وہ حیران تھی مگر بے یقین نہیں، وہ لاشعوری طور پر ہمیشہ اس لمحے کی منتظر رہتی تھی۔ سب کچھ ٹھیک ہوتے ہوئے بھی اس کی چھٹی حس اسے ہمیشہ اشارے دیتی رہتی تھی۔ الفت ... [illegible] نے

ایثار کو ایک طرف کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"نکلو ابھی میرے گھر سے، کوئی جگہ نہیں ہے تمہاری یہاں۔" وہ اسے کھینچتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھیں۔ ایثار تیزی سے دونوں کے آگے آیا اور سومہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چھڑایا۔

"یہ کیا کر رہی ہیں امی آپ......"

"تم چپ رہو۔" وہ پھر سومہ کی سمت لپکی تھیں کہ ایثار نے اسے اپنے پیچھے چھپایا۔

"کوئی کہیں نہیں جا رہا ہے، آپ کس لیے اتنا غصہ ہیں؟"

الفت مارے غصے کے کچھ بول نہیں پا رہی تھیں۔ انہیں سومہ کو نظروں سے دور کرنا تھا اور وہ دیوار بن کر کھڑا تھا۔

"ہانیہ کی سوسائیڈ کی کوشش اور شادی سے انکار......" اشرف بیگ کی تھکی سی آواز ابھری۔

"اس دن مازیہ نے اسے فون کر کے تمہارے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کہی تھیں کہ تمہارا کردار ٹھیک نہیں ہے اور بھی ایسے ہی جھوٹ۔"

سومہ کو پورا کمرہ گھومتا محسوس ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ایثار کا بازو تھاما۔ ایثار کو بھی دھچکا لگا تھا۔

"یہ ان سب کی ملی جلی سازش تھی، شادی تڑوانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ یہ اس گھر میں آئے، ہمارے سر پر مسلط ہو، ایسے تو یہ کبھی نہ ہو پاتا، ابا! آپ بلائیں انہیں اور اسے چلتا کریں ابھی اور اسی وقت، میں اب ایک سیکنڈ بھی برداشت نہیں کر سکتی اسے۔"

"اس میں سومہ شامل نہیں ہے امی۔" ایثار کی آواز اسے دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اس کی جانب ایک نظر ڈالے بنا ہی یقین سے کہا تھا۔ زندگی کی بڑی بڑی خوشیاں کبھی کبھی ایسے حالات میں ملتی ہیں جب ان پر رونا ہی آتا ہے۔

"دیکھا...... دیکھ رہے ہیں آپ......" وہ تیورا کر سسر اور شوہر کی پلٹیں۔

"کیسے اس کی طرف داری کر رہا ہے......"

انہوں نے سر پر ہاتھ مارا۔ پیچھے کھڑی سومہ کی گرفت اس کے بازو پر ڈھیلی پڑی، ایثار نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے ہونٹ خشک اور سفید ہو رہے تھے۔ بحث چھوڑ کر اس نے اسے قریب صوفے پر بٹھایا اور خود ہی پانی لینے باورچی خانے میں گیا۔ پانی پینے کے بعد ہوش بحال ہوئے تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اپنے لیے ان چہروں پر شفقت اور محبت تو اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی مگر اس وقت وہاں جو نفرت تھی وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

"تم ٹھیک ہو؟" ایثار نے پوچھا اور وہ سر گھما کر اسے دیکھنے لگی۔

"یہاں نفرت نہیں ہے۔" اسے خوشی ہوئی اور مسرت کا یہ احساس اگلے پل درد کی لہر بن کے اسے رلا گیا۔

"اسے گھر چھوڑ آؤ ایثار۔" دادا ابا کی سرد آواز آئی۔ وہ کھڑا ہوا۔

"بحث مت کرو ایثار۔" اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی الفت نے ٹوکا۔

"میں خود چلی جاؤں گی۔" وہ کھڑی ہوئی۔ ایثار اس کی طرف مڑا۔

"مجھے بھی اپنے گھر والوں سے کچھ سوال کرنے ہیں۔" اس نے باہر جانے والے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

"وہیں رہنا، اب واپس آنے کی ضرورت نہیں ہے۔" الفت نے کہا۔

"دادا ابا! امی پاپا!" دہلیز کے قریب اس نے ایثار کو سنا جس نے باری باری سب کو مخاطب کیا تھا۔

"آپ مجھ سے یہ توقع نہ رکھیں کہ میں سومہ کو سزا دوں گا، اس سے بدلہ لوں گا یا اسے چھوڑ دوں گا۔"

اسے خوش ہونا چاہیے تھا کہ ایثار کی طرف سے اسے جو شبہ رہتا تھا۔ وہ غلط نکلا تھا مگر وہ خوش نہیں ہو سکی۔ اب اسے اپنے انصاف انصاف کی پکار بے معنی لگ رہی تھی۔ غلطی، خطا، گناہ سب اس کی بہن نے کیا تھا تو اس وقت انصاف کا تقاضا کیا تھا؟ اس کا دل بری طرح ڈوب رہا تھا۔ وہ اسے ہاتھ پکڑ کر باہر نہیں نکال رہا تھا بلکہ یہ اس کے خود وہاں سے چلے جانے کا وقت تھا۔

"اس کا فیصلہ ہم کریں گے۔" دادا ابا کی گرج دار آواز پر اس کا دل کانپا تھا۔ پورچ تک ان کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"شادی کا فیصلہ ہمارا تھا۔ یہ فیصلہ بھی ہمارا ہوگا۔" اپنے حصے میں آتے ہوئے اس نے آخری بات سنی تھی۔

☆☆☆

پہلے تو مازیہ نے ماننے سے انکار کیا اور کہا یہ ہانیہ بدلہ لینے کی کوشش ہے۔ لیکن جب اس کے کڑے استفسار پر مازیہ نے روتے ہوئے اعتراف کیا تو اسے دو چار تھپڑ لگانے اور برا بھلا کہنے کے بعد صاعقہ نے 'ایکشن پلان' مرتب کیا۔

"کسی کے سامنے قبول کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب سے یہی کہیں گے ہم کہ ہانیہ اور اس کے گھر والے جھوٹ کہہ رہے ہیں، مازیہ نے کسی کو فون نہیں کیا تھا، سومہ سے شادی انہیں برداشت نہیں ہو رہی ہے، اس لیے جھوٹ کے سہارے یہ رشتہ تڑوانا چاہتے ہیں۔"

"اگر ان کے پاس ریکارڈنگ ہوئی تو؟"

عمارہ کا سوال غلط نہیں تھا۔

"ایسا ہوتا تو وہ اب تک سنا چکے ہوتے۔" صاعقہ بری طرح جھنجھلائی ہوئی تھیں۔

"اگر سنا بھی دیا تو کوئی فرق نہیں پڑتا اگر ہم ڈٹے رہیں، مازیہ! تم وہ سم توڑ کر پھینک دو۔" مازیہ جیسے ذہنی طور پر وہاں تھی ہی نہیں۔

"سن رہے ہیں نا آپ؟" انہوں نے شوہر کو پکارا۔

"مہربانی کر کے اپنے ابا کے سامنے پھسل مت

جانا۔ یہاں بھی آپ کی بیٹی کا سوال ہے، خدا کے واسطے اب بچوں کا سوچیں۔" انہوں نے ہاتھ جوڑ دیے۔

اصغر بیگ چپ تھے لیکن پریشانی ان کے چہرے سے ہویدا تھی۔ وہ سچ کہہ کر باپ کے سامنے ایک بار پھر سر نہیں جھکانا چاہتے تھے۔ اس کے مقابلے میں ڈھٹائی سے جھوٹ کہہ کر سر اونچا رکھنا انہیں آسان لگ رہا تھا۔ انہیں لگ رہا تھا کہ سچ مان لیا تو وہ کبھی ان کی شکل نہیں دیکھنا چاہیں گے۔

"اور سومہ کا کیا؟ وہ اسے نہ لے جائے تو؟" عمارہ کا اگلا سوال تھا۔

صاعقہ نے بیٹی کو دیکھا۔ وہ پتھریلے سے تاثرات لیے بیٹھی تھی۔

"تم ایثار کو منانے کی کوشش کرو، وہ مان جائے تو باقی سب کی ضرورت بھی نہیں۔"

"ایثار مانے گا؟ وہ کب گھر والوں کے خلاف گیا ہے۔" عمارہ ہمیشہ درست نکتے اٹھاتی تھی۔

"ایسا ہوا تو...." صاعقہ نے گہری سانس لی۔

"ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے، سومہ یوں بھی شادی کے لیے تیار نہیں تھی، ہم نے ہی زبردستی کی تھی، اس کے لیے اچھا ہی ہوگا اگر ابھی الگ ہو جائے۔"

"آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب ایسے ہی سنبھالا جا سکتا ہے سب۔" وہ شوہر کو دیکھ کر کچھ نرم پڑیں۔

"اگر ابھی کمزور پڑ گئے تو ساری عمر سر نہیں اٹھا پائیں گے۔ ویسے انہیں غیروں کی باتوں پر یقین کر کے یوں سومہ کو گھر سے نکالنے سے پہلے ہم سے پوچھنا چاہیے تھا لیکن وہ ہمیں اپنا سمجھتے ہی کہاں ہیں، وہ تو بہانے کی تلاش میں رہتے ہیں، کب ہمیں شرمندہ کریں، نیچا دکھائیں، باتیں سنائیں، الزام لگائیں۔" وہ اس وقت چوری اور سینہ زوری کی تصویر بنی ہوئی تھیں۔

"مجھے ابا کا سامنا کرنے کے خیال سے ہی گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ اتنی مشکل سے شادی کے بعد وہ ذرا نرم پڑے تھے اور اب پھر......" وہ چپ ہو گئے۔ ان کی فکر، پریشانی، گھبراہٹ کچھ چھپا نہ تھا۔

"اب تم بھی کچھ کہو۔" عمارہ نے سر جھکا کر خاموش سومہ سے کہا۔

"ہاں، تم کچھ الٹی سیدھی حرکت مت کرنا بلکہ کوئی کچھ نہیں کہے گا، اس بار صرف میں بات کروں گی۔ یہ قصہ ہمیشہ کے لیے ختم ہی ہو جائے تو اچھا، اب تو ہم ہی پہل کر دیں گے تعلقات ختم کرنے میں۔ آپ کو باپ سے ملنا ہے تو ملتے رہیں اب ہمارا کوئی لینا دینا نہیں ہوگا ان سے۔" صاعقہ نے ایک اور فیصلہ سنایا۔

"ایسا انتہائی قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں۔" اصغر بیگ نے نحتی سے کہا۔

"بہت سن لی آپ کی، اب آپ مجھے اور بچوں کو مجبور نہ کریں، ہم آپ کو نہیں روکتے مگر آپ ہم سے امید نہ رکھیں۔"

اصغر بیگ غصے میں اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے وہ کچھ کہتے اس سے پہلے سومہ کی آواز ابھری۔

"مجھے لگتا تھا آپ دونوں نے میرے ساتھ ہمیشہ بہت غلط کیا، اپنے ساتھ ہوئی ناانصافی کا مجھے ہمیشہ افسوس رہا لیکن آج میں پہلی بار اس کے لیے خوش ہوں ممی کہ میں آپ سے عمارہ، ماڑیہ جتنی قریب نہیں، میرے اندر نفرت نہیں۔"

"کیا بکواس ہے اب یہ؟" عمارہ کی آواز اونچی تھی۔

"ابو!" وہ باپ کی طرف مڑی۔ "آپ نے کبھی دادا ابا سے پیر پکڑ کر، ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی؟ ان سے کہا ان کی نافرمانی کا آپ کو پچھتاوا اور افسوس ہے؟ انہیں ناراض کر کے ایک جائز کام کیا اور پھر انہیں راضی کرنے کے لیے ان کی اتنی ناجائز باتیں مانتے گئے کہ آپ کا اور ممی کا اس کو لے کر ہمیشہ جھگڑا ہوتا رہا۔ آپ نے اپنے گھر اور اپنے

والد کے لیے کوئی حد مقرر ہی نہیں کی کہ اس حد سے آگے جا کر دونوں میں سے کس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

آپ دونوں کی لڑائیوں کے دوران سنی باتوں اور اس ماحول کا اثر ہے کہ آپ کے بچے تایا، تائی دادا اور کزن جیسے رشتوں میں اور ان رشتوں کے لیے اپنے جذبات میں خلوص اور محبت شامل نہیں کر سکے اور آج ہمارا یہ حال اسی وجہ سے ہے ابو کہ یہاں بیٹھ کر جھوٹے سچے پلان بنا رہے ہیں۔

صرف فاصلے اور برائی ہی نہیں بلکہ ان کی تکلیف اور پریشانی سے حظ اٹھانے والی بیمار سوچ نے ماڑیہ سے فون کروایا تھا، اس کے اس جھوٹ نے دادا ابا کو ہمیشہ کے لیے منا لینے کا موقع دیا، آپ نے بیٹی کی مرضی، اس کی خوشی نظر انداز کر کے اسے اپنے مطلب کے لیے استعمال کیا اور اب....." اس نے ماں کی دیکھا۔

"اب ایک اور غلطی کے جواب میں معافی مانگنے کے بجائے آپ خود کو شرمندگی اور ندامت سے بچانے کے لیے جھوٹ کہیں گے اور اپنے مطلب، انا اور نفرت، محبت کے لیے پھر بیٹی کی مرضی اور خوشی داؤ پر لگائیں گے۔ دادا ابو اور تایا ابا کی فیملی کے لیے آپ کی جو سوچ ہے۔ وہ آپ کو اس سے آگے بڑھنے ہی نہیں دیتی، اب بھی آپ کو یہ سوچنے کی فکر نہیں کہ حالات اس نہج پر آئے تو کیسے اور کیوں، آپ کی اولاد میں اتنا زہر اور نفرت بھری ہے کہ ماڑیہ کو زندگیوں سے کھیلنا بھی ہنسی مذاق لگا اور آپ اب بھی اس پر فکر مند نہیں، آپ کے رویوں نے بچوں کی زندگی اور مزاج کس قدر بگاڑ دیے ہیں، اس پر سوچنے کے بجائے آپ اب بھی الٹے سیدھے طریقوں سے ان لوگوں سے نپٹنے کا سوچ رہے ہیں۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

"میری سوچ آپ سب سے مختلف ہے، مجھے جھوٹ اور فریب کا سہارا نہیں چاہیے۔ مجھے اپنی شادی بچانی ہے اور اس کے لیے جو کرنا ہوگا، میں کر لوں گی۔"

"زیادہ جذباتی مت بنو سومہ۔" عمارہ نے نحتی سے کہا۔ "تمہیں کب سے دنیا اور لوگوں کی اتنی سمجھ آ گئی ہے؟ ممی اور ابو تم سے زیادہ سمجھدار اور تجربہ کار ہیں، وہ جو کہہ رہے ہیں چپ، چاپ کرو۔"

"اپنے معاملات میں خود سلجھا لوں گی، کوئی میرے لیے کچھ نہ کرے۔"

"سومہ! تم ایثار کے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو ایسا ہی ہوگا ہم اس۔"

"میرے بارے میں سوچنے یا فکر کرنے کی ضرورت نہیں ممی۔" اس نے صاعقہ کی بات کاٹی تھی۔

"آپ دونوں وہی کریں جو اب تک کرتے رہے ہیں، آپ دونوں کا مقصد ہی الگ ہے، ابو دادا ابا کو راضی اور خوش رکھنا چاہتے ہیں چاہے اس کوشش میں بیوی بچے ناراض ہوتے رہیں اور ممی یاز دوالے کے ساتھ ہمیشہ محاذ کھلا رکھنا چاہتی ہیں پھر بھلے گھر کا سکون برباد ہو، بچے برباد ہوں۔ مبارک باد کہ آپ دونوں اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔"

"سنو سومہ...." ابو اٹھ کر اس کے پاس آئے۔

"ابھی ابھی میں نے اپنی ترجیحات طے کی ہیں، اب مجھے خود ہی میری زندگی اور گھر سنبھالنے دیں، مجھے میرا مقصد پورا کرنے دیں ابو۔"

پیچھے سب اسے آوازیں دیتے مگر وہ رکی نہیں۔

"جانے دیں، جب وہاں کوئی نہیں گا نہیں تو خود ہی آ جائے گی۔" عمارہ نے ماں باپ کو تسلی دی۔

کیاری پھلانگ کر اس طرف آتے ہوئے اس کے ذہن میں ایثار کی باتیں گونج رہی تھیں جن پر اسے اس وقت یقین نہیں تھا۔ رشتوں میں واضح ترجیحات اور امن سکون کی چاہ ہو تو کچھ مشکل ناممکن نہیں رہتا۔ وہ پہلے اپنے کمرے میں جا کر ایثار سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن راہداری میں جانے سے پہلے ہال سے آتی دادا ابا کی آواز پر وہ دروازے کے باہر

رک گئی۔

"کیوں بحث کر رہے ہو، تم نے اس وقت جیسے بات مان لی تھی اب بھی مان لو۔"

"دادا ابا! یاد کریں، آپ نے عمارہ کا نام لیا تب میں نے صاف انکار کر دیا تھا، ان کے نہ کرنے سے پہلے ہی۔ اس کے بعد آپ نے سومہ کا کہا تو میں نے ہاں کی تھی۔ شادی کوئی معمولی بات نہیں تھی، ساری زندگی کا سوال تھا، اب بھی بالکل وہی سچویشن ہے۔ ساری عمر کا سوال ہے، معمولی بات نہیں۔" وہ اس انکشاف پر حیران تھی۔

"سب کچھ جاننے کے بعد بھی تم کیوں ضد کر رہے ہو؟" الفت اب بھی اتنی ہی برہم تھیں۔

"مازیہ کی غلطی کی سزا میں سومہ کو نہیں دے سکتا۔ آپ سب کے لیے۔ قابل قبول اس لیے نہیں کہ آپ کے نزدیک انصاف کی اہمیت ہی نہیں ہے۔"

"ایثار!" اشرف بیگ کی تنبیہی آواز آئی۔

"گستاخی معاف ابو! لیکن یہ سچ ہے دادا ابا کا رویہ چاچا کی فیملی کے ساتھ متعصبانہ رہا ہے اور باقی سب کا بھی اور شاید ان ہی رویوں کا اثر ہے کہ مازیہ نے وہ حرکت کی، میں اسے درست نہیں کہہ رہا مگر سب کو اپنا احتساب کرنے کی ضرورت ہے، میں ہمیشہ آپ سب کی بات مانتا رہا کہ میرے لیے گھر کا سکون و امن ہمیشہ اولین ترجیح ہے اور مجھے کسی نے کہا ہے عدل کے بنا امن ممکن نہیں، اگر اس وقت میں نے سومہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا تو ساری عمر سکون کے لیے ترستا رہوں گا، وہی برائی، نفرت اور انا کی کہانی دہرائی جائے گی، میں آپ سب کی بات نہیں مان سکتا، سومہ کو چھوڑنا میرے لیے ممکن نہیں۔"

"تو پھر تم اسے لے کر اس گھر سے ہمیشہ کے لیے جاسکتے ہو۔"

دادا ابا کی سرد آواز اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑا گئی۔ وہ ایثار کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کے لیے یہ دھچکا تھا۔ وہ اپنا اصول توڑ کر اس طرف آئی تھی لیکن کیا ایثار بھی ایسا کرے گا؟ وہ چپ تھا اور سومہ کا دل بھی رکا ہوا تھا۔

"بابا! امی!" کچھ دیر بعد ایثار کی آواز ابھری۔

"اگر آپ دونوں کا بھی یہی فیصلہ ہے تو میں سومہ کو لے کر چلا جاؤں گا۔" امن کی جو قیمت اس وقت اس سے مانگی گئی تھی، وہ امن کے منافی تھی۔

انہیں بیچ کی راہ نکالنا تھی۔ وہ اندر جانے کے لیے آگے بڑھی لیکن اس سے پہلے پیچھے سے مازیہ دوڑتی ہوئی اندر داخل ہو چکی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا پیچھے وہ سب شاید اسے روکنے بھاگے آرہے تھے۔ سومہ ہال کے اندر داخل ہو کر دروازے میں رک گئی۔

"دادا ابا! میں نے ہانیہ کو فون کیا تھا، میں اپنی غلطی مانتے ہوئے آپ سب سے معافی مانگنے آئی ہوں......" وہ سر جھکا کر دادا ابا کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ وہ بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹے۔

"آپ مجھے معاف کریں یا سزا دیں، مجھے سب منظور ہے، کہیں گے تو میں ہانیہ اور اس کے گھر والوں سے بھی معافی مانگ لوں گی بس آپ اس کی سزا آپی کو نہ دیں۔" سب دم بخود تھے۔ مازیہ مسلسل رو رہی تھی۔

"یہ تربیت کی ہے تم نے بیٹیوں کی؟" دادا ابا نے دروازے کے اس طرف کھڑے بیٹا، بہو کو دیکھا۔ ان کا لہجہ تحقیر بھرا تھا۔

"دادا ابا! آپ نے کبھی نثار بھائی اور ایثار بھائی کو ڈانٹا نہ ان پر چیخے چلائے، آپ ہمیشہ ان سے نرمی اور پیار سے پیش آتے تھے، آپ ان کے نام لیتے تھے اور ہمیں اے لڑکی کہہ کر بلاتے تھے، مجھے آپ کا ان کے لیے یہ پیار اچھا نہیں لگتا تھا، میں ان کی وجہ سے آپ کو نادم اور پریشان دیکھنا چاہتی تھی، میں چاہتی تھی کہ آپ ایک بار تو ان سے اسی حقارت اور غصے سے بات کریں جیسے ہم سے کرتے ہیں......" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

• غلطیاں، کمیاں اور زیادتیاں بھی اتنی محسوس نہ ہوں اگر موازنے کے لیے کوئی اور نہ ہو۔

"مجھے نہیں پتا تھا ہانیہ ایسا انتہائی قدم اٹھا لے گی، میں نے وہ سب اس لیے کہا تھا کہ ایثار بھائی کے بارے میں یہ افواہ اور اس وجہ سے شادی ٹوٹ جانے کی شہرت پر آپ کی بہت سبکی ہوگی اور آپ......" اس کا سر جھکا ہوا تھا اور آنسوؤں کی زیادتی بولنے میں رکاوٹ بن رہی تھی۔

"آپ کا رویہ ایک بار تو ان کے ساتھ ویسا ہوگا جیسا ہمارے ساتھ ہے، آپ ان پر غصہ ہوں گے، ڈانٹیں گے، برا بھلا کہیں گے......" "ستم ظریفی یہ تھی کہ دادا ابا نے پھر بھی ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔

"تم اپنے گھٹیا کرتوت کا الزام مجھے دے رہی ہو۔" دادا ابا کی آواز جذبات کی زیادتی کی وجہ سے کانپ رہی تھی۔

"ن......نہیں......نہیں......" اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر جھٹ سر جھکا لیا۔ سومہ آنسو ضبط کرتی آگے آئی۔ اس کے اندر سکون اتر آیا تھا۔ اسے دونوں گھروں کے بیچ سچائی اور ایمان داری کا فقدان تو بے چین، رکھتا تھا جو اس وقت ختم ہوا تھا۔

"مازیہ!" وہ اس کے پاس نیچے بیٹھ گئی۔ "تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے لیکن یہ اچھی بات ہے کہ تمہیں اس کا احساس ہو گیا۔"

اس نے انگریزی میں کہتے ہوئے اسے گلے لگایا۔ وہ دونوں آواز سے رو رہی تھیں۔

"دیکھ لیں اب یہ بے غیرتی بھی۔" الفت نے قہر آلود نظر ساعقہ، اصغر بیگ اور عمارہ پر ڈالی۔

"یہ بے غیرتی نہیں ہے امی۔" ایثار ان دونوں کے قریب آیا۔

"مازیہ نے نہ صرف اپنی غلطی کا اقرار کیا ہے بلکہ سب سے معافی بھی مانگی ہے اگر کوئی اپنی غلطی جان کر معافی مانگے تو اعلیٰ ظرفی یہ ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے۔" اس نے جھک کر سومہ کے شانے پر ہاتھ رکھا تو اس نے بہن کو خود سے الگ کیا اور اسے لے کر کھڑی ہوئی۔

"رویے بھی رنگ، قد اور نقوش کی طرح نسل در نسل آگے بڑھتے ہیں، دادا ابا کا عدم انصاف، نفرت اور تعصب آپ میں آیا اور ان سے ہماری جنریشن میں......" اس نے ہال اور ہال کے باہر موجود افراد کو مخاطب کیا تھا۔

"آپ سب کے اختلافات اور ناپسندیدگی کے باوجود میں اور سومہ ساتھ رہیں گے، ہم بچے نہیں نہ یہ کوئی کھلونے اور چاکلیٹ کی بات ہے کہ آپ کہیں بیٹا لے لو تو تھام لیا اور کہیں تمہارے لیے ٹھیک نہیں تو واپس کر دیا۔ اس بات پر ہم کوئی کمپرومائز نہیں کریں گے، کسی کو منانے کی کوشش کریں گے نہ اس بات پر شرمندہ ہوں گے، نہ اس بات پر اپنے بچوں کے ساتھ کوئی نامساوی برتاؤ ہونے دیں گے۔ یہ نفرت، تعصب اور ناانصافی اگلی جنریشن میں نہ جائے، اس کے لیے کسی کو تو یہ سلسلہ توڑنا ہوگا، یہ کام آج میں اور سومہ کرتے ہیں، ہمیں دادا ابا، مازیہ یا آپ کسی سے شکایت نہیں، اگر کبھی تھی تو آج ہم ختم کرتے ہیں، ہم کسی کے لیے دل میں برائی یا غصہ نہیں رکھیں گے، ہمارے بچوں کے دل میں آپ سب کا یکساں احترام اور محبت ہوگی، ہم اپنے رویے اور سلوک سے ان کے دل میں نفرت اور تعصب نہیں بھریں گے، آپ ہمیں قبول کریں نہ کریں اس سے......"

"مجھے قبول ہے۔" اشرف بیگ کی بھیگی سی آواز پر سب چونکے تھے۔

"مجھے بھی۔" ذرا دیر بعد مازیہ کی دھیمی ڈری سہمی آواز آئی۔

حالانکہ مازیہ کی قبولیت کی اہمیت نہیں تھی لیکن چھوٹی ہی سہی پہل مشکل ہوتی ہے۔ چاہے پرانی زنجیر کا پہلا حلقہ توڑنا ہو یا نئے آغاز کا پہلا قدم دھرنا ہو اور آج یہ دونوں مشکل کام ہو چکے تھے۔ ایک زنجیر ٹوٹی تھی اور ایک نازک سی زنجیر آہن سے زیادہ مضبوط ہوئی تھی۔

☆☆☆

زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔ الفت کا رویہ پہلے سے زیادہ روکھا تھا۔ دادا ابا اس کے ساتھ بالکل چپ تھے مگر ان دونوں نے اپنے رویے پہلے سے ہی رکھے تھے۔ مازیہ کا زیادہ وقت ادھر گزرنے لگا تھا کہ یہاں اس کے ہم خیال زیادہ تھے۔ وہ اشرف بیگ کے ساتھ جا کر ہانیہ کے گھر والوں سے بھی معافی مانگ آئی تھی۔

گھر کا کھنچا کھنچا اور سرد ماحول دیکھ کر اشرف بیگ نے انہیں الگ ہونے کا مشورہ دیا تو ایثار نے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا اور اس نے سب کے ساتھ رہنا چنا۔

اس نے رشتوں میں اپنی ترجیحات طے کر لی تھیں، اب ان کے لیے کچھ بھی کرنے میں اسے تامل نہیں تھا اس کے لیے اگر عدل کا ترازو ڈولتا رہے، اسے یہ بھی منظور تھا اور ایثار کو اب امن قائم رکھنے کی کوشش میں عدل نہ پیچھے رہ جائے، یہ خیال رہتا تھا۔

ان سے پہلے بڑوں نے نفرت، ناراضی، بدلہ، ملال اور ندامت جیسے اچھے اور برے احساسات کی بیڑیوں سے خود کو باندھ رکھا تھا لیکن ان دونوں نے اپنے اصولوں اور فلسفوں کو پیروں کی زنجیر بننے سے روک دیا تھا۔

کچھ مزاج اور لوگ کسی نازک لمحے میں، لفظوں کے نشانے پر لگتے ہی بدل جاتے ہیں جیسے اشرف بیگ اور مازیہ کے ساتھ ہوا تھا، کچھ بدل بھی رہے ہوں تو پردہ ڈالے رہتے ہیں کہ یہ ان کے لیے شکست تسلیم کرنے جیسا ہوتا ہے، انہیں انا سب سے عزیز ہوتی ہے جیسے دادا ابا اور کچھ وقت اور صبر طلب ہوتے ہیں جیسی ان سب کو الفت، صاعقہ اور اصغر بیگ سے امید تھی اور کچھ بقول مازیہ کتے کی دم کی طرح ہوتے ہیں جیسے عمارہ۔

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ عمارہ کے لیے انکار کر کے میرے لیے ہاں کی تھی؟"

"بتانے سے کیا ہوتا؟"

"تھوڑی تو تسلی ہوتی کہ تمہارے ساتھ زبردستی نہیں ہوئی ہے۔"

"یہ تم اب کہہ رہی ہو، تب مشکوک ہو جاتا تھا۔"

"ہاں......!" اسے یاد آیا۔ "تم نے کہا تھا تم نظر باز نہیں۔"

"اس پر تو میں اب بھی قائم ہوں۔" سومہ نے گھورتے ہوئے منہ پھلایا۔

"ایک منٹ...... تم کیا سمجھ رہی ہو...... ہاہاہا......" سمجھ میں آتے ہی وہ زور سے ہنسا۔

"تمہیں لگ رہا ہے، میں پہلے سے تمہیں پسند کرتا تھا؟" اس نے منہ نہیں کھولا لیکن جواب واضح تھا۔"

"تو اپنی یہ خوش فہمی دور کر لو، میں اپنی اس بات پر اب بھی قائم ہوں کہ شادی سے پہلے والی تم مجھے یاد نہیں۔"

"پھر؟" اسے یہ سچائی کوئی خاص پسند نہیں آئی۔

"عمارہ مجھے پسند نہیں تھی لیکن تم نہ اچھی لگتی تھیں نہ بری مطلب رسک لیا جا سکتا تھا۔"

"کسی کا دل دکھے، اتنا سچ مت کہا کرو۔" وہ اٹھ کر جانے لگی کہ اس نے ہاتھ پکڑ کر واپس بٹھایا۔

"اب تو تم ہی پسند ہو اور بے حساب پسند ہو، میں تو مازیہ کا شکر گزار ہوں، ساری عمر اس کا احسان مند، اس کا قرض دار رہوں گا، کبھی کبھی رات بھر نیند نہیں آتی کہ اگر اسے فون کال کا آئیڈیا نہ آیا ہوتا تو کیا ہوتا...... اس کے آگے نیند اڑ جاتی ہے، لگتا ہے یہ سب خواب نہ ہو، صبح جاگوں اور تم میرے پہلو میں ہونے کے بجائے بازو کے گھر میں ہو......"

"اتنی بڑی بڑی باتیں کرتے ہو اور لے لیا بدلہ!" اس نے منہ پھلا کر اس کی بات کاٹی۔

"ہاہ! کون سا اور کیسا بدلہ یار؟"

"اتنا گھما پھرا کے تو میں نے بھی نہیں کہا تھا۔"

"ہاہاہا......" ایثار کا قہقہہ چھت پھاڑ قسم کا تھا۔

☆☆

یہ کہانی ہے ایک لڑکی احل کے عشق کی۔ ایسا عشق جس نے اسے دنیا کی ہر شے سے بے نیاز کر دیا ہے۔ وہ عشق جو
ہر شے سے ماورا ہے۔

رحیمہ احمد ایک بڑی حویلی کی بڑی بہو ہیں۔ لیکن قدرت نے انہیں اولاد سے محروم رکھا ہے۔ وہ اپنے دیور اور نند کے
..ں کو اپنا بچہ سمجھتی ہیں، حویلی کا سارا انتظام انہوں نے سنبھال رکھا ہے۔ وہ ایک بچی کو یاد کرتی رہتی ہیں جو ان کی زندگی
..ں کچھ وقت کے لیے آئی تھی۔ گھر میں اتنے افراد ہونے کے باوجود تنہائی محسوس کرتی ہیں۔ اس گھر میں ان کے تین دیور
..تے ہیں چوہدری حیدر یعقوب اور ان کی بیوی رفعت جہاں ان کے چار بچے ہیں۔ یاسر......اسود......فاطمہ اور مومنہ۔
یاسر ایم کام کے بعد بینک میں ملازمت کر رہا ہے۔ اس کی بات اپنی پھوپھی کی بیٹی رباب کے ساتھ طے ہو چکی
..ے۔ اس سے چھوٹا اسود سندھ یونیورسٹی سے ایم بی اے کر رہا ہے۔ تیسرے نمبر کی فاطمہ تھی اس کی منگنی خالہ زاد خرم سے
..چکی ہے۔ وہ جرمنی میں ہوتا ہے۔ سب سے چھوٹی مومنہ جو یونیورسٹی میں جانا چاہتی تھی اجازت نہ ملنے پر کالج میں بھی
..خلہ نہیں لیا تھا۔

چوہدری سلیمان یعقوب اور آسیہ کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ہمایوں بی کام کے بعد باپ دادا کی زمینیں سنبھال رہا
..ہ بیٹا بابر فرسٹ ایئر میں اور بیٹی گل چہرہ نہم میں تھی۔

سب سے چھوٹے دیور چوہدری سفیان یعقوب اور دیورانی ارم کی دو بیٹیاں چار سال کی عروہ اور ساڑھے تین سال
..کی جویریہ تھی اور دلی۔

ان کی دو نندیں تھیں۔ فردوس اور یاسمین، یاسمین شہر میں رہتی جبکہ آپا فردوس ان کے گھر کے برابر میں ایک
..ڑے بار وچھے رہتی تھیں۔ ان کے پانچ بچے تھے بیٹے۔ مظہر، اطہر اور طاہر بیٹے اور رباب، مہرتاب بیٹیاں تھیں۔

اسود رحیمہ احمد کو بہت پیارا تھا۔ انہوں نے اس سے ایک وعدہ لے رکھا ہے۔

چوتھی قسط

وہ کوئی جواب دیے بنا باہر نکل گیا۔ ٹھوکر مارنے کو راہ میں پڑی کوئی چیز نہ ملی تو اس زور سے مکا دیوار پہ مارا کہ اپنا ہی ہاتھ زخمی کر ڈالا۔

چھ سال چار مہینے اٹھارہ دن بعد جس وقت ان کی بیٹی نے اس گھر میں قدم رکھا، اس وقت مسلمانوں کی مساجد سے فجر کی آوازیں کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ وہ لپک کر آگے بڑھیں اور پھر ٹھٹک کر رک گئیں۔ اور پھر اپنی کم عقلی پہ خود ہی ہنس پڑیں کہ آج بھی وہ اپنی بیٹی کو تین سال دس ماہ اٹھارہ دن کی بچی سمجھے ہوئے تھیں جسے وہ دیکھتے ہی جھپٹ کر اپنی گود میں اٹھا لیتیں۔ حالانکہ انہوں نے تو اس جدائی کا پل پل گن رکھا تھا۔

وہ ماتھے پہ ہاتھ مارتے ہنستے ہوئے آگے بڑھیں اور اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ اپنے گلے سے لگا لیا۔ بچی کو شاید یہ ملن، یہ ملاپ پسند نہ آیا تھا یا اسے اب اس دیوانی ممتا کی ضرورت نہ رہی تھی۔ وہ ان کی بانہوں میں کسمسا کر رہ گئی۔ گائتری دیوی نے آہستہ سے اسے خود سے الگ کیا اور اسے غور سے دیکھا۔ وہ ان کی بیٹی، ان کی درگا کہاں رہی تھی۔ درگا ہوتی تو ایسی غیر نہیں اجنبی نظروں سے انہیں دیکھتی بھلا۔

"یہ تمہیں نہیں پہچانتی گائتری۔" رام مہیشوری نے اپنی نئی سنوری بیوی پہ نگاہ ڈالتے ہوئے بہت درد، بہت ضبط سے کہا اور کمرے میں چلے گئے۔

"یہ ہمیں نہیں پہچانتی۔ ہم تو پہچانتے ہیں ناں۔" نند لال نے ان کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بچی کی طرف دیکھا جس کا نقش نقش گائتری دیوی سے چرایا ہوا تھا اور اس کے بائیں کان کی سرخ لو پہلی نگاہ پڑتے ہی حافظے میں محفوظ رہ جاتی۔ یہی تو وہ نشانی تھی جس نے کل انہیں چونکایا تھا اور پھر وہ ساری معلومات لے کر ہی چوہدری گھر سے نکلے تھے۔ اور انہیں مطلع کیا تھا۔ آج اتنے سالوں بعد وہ اپنی بہن اور اپنے بہنوئی کے سامنے سرخرو ہوئے تھے۔ سر اٹھا کر بات کرنے کے قابل ہوئے تھے۔

گائتری دیوی نے بھائی پر سے نظریں ہٹا کر پھر اپنی بیٹی کی طرف بھیگی نظروں سے دیکھا جو بار بار اپنے سر پہ اوڑھا ہوا دوپٹہ ٹھیک کر رہی تھی۔ جس کے ہاتھ میں ایک پیراشوٹ بیگ تھا۔

انہوں نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر اس کے ماتھے پہ رخساروں پہ کئی بوسے دیے اور پھر سے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

"اتنی چھوٹی سی تھی جب کھوئی تھی۔ وقت تو لگے گا ناں پہچاننے میں، اپنا سمجھنے میں۔" انہوں نے اس کے بالوں پہ اپنے لب رکھتے ہوئے دل کو سمجھایا اور خود کو تسلی دی۔ مگر وقت دن، پھر مہینے پھر برس بن بن کر بیت گیا۔ ان کی بیٹی نے انہیں کبھی اپنا سمجھا نہ مانا۔ نہ انہیں ماں قبول کیا اور نہ ہی رام مہیشوری کو باپ۔ وہ اب رام مہیشوری کو "ڈیڈی" نہ پکارتی۔ "ڈیڈی" کہتی۔ وہ بھی اتنے سپاٹ اور بے تاثر لہجے میں کہ وہ سوچتے کہ وہ بہرے کیوں نہیں ہو جاتے۔ وہ اب ان کی ٹھوڑی کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر انہیں اپنی طرف متوجہ نہ کرتی تھی۔ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر کوئی فرمائش نہ کرتی تھی۔ وہ انہیں گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر لپک کر ان کی طرف نہیں آتی تھی۔ دور کھڑی خالی نگاہوں سے دیکھتی رہتی تھی۔

پھر تو ہر آنکھ نے دیکھا۔ رام مہیشوری جب جب اپنی بیٹی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ان کی اندر انسانوں جیسی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان کے چہرے پہ کرب ہوتا ہے ان کی آنکھ میں نمی ہوتی ہے۔ بیوی کو بھی عورت کے بجائے اپنی غم گسار اپنی ساتھی سمجھنے لگتے ہیں۔

اپنے اور بیٹی کے بیچ فاصلے کو مٹاتے مٹاتے اسے اپنا بنانے کی کوشش کرتے کرتے رام مہیشوری اس دنیا سے چلے گئے۔ اپنی دوری کو مٹاتے مٹاتے اسے اپنا بنانے کی کوشش کرتے کرتے گائتری دیوی اس دنیا میں جی رہی تھیں۔ ٭٭٭

گائتری دیوی نے ماضی کے دردناک باب کو بند کرتے ہوئے جلدی سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور اپنے کمرے کے دروازے پہ کھڑی پارو کو دیکھا۔

"آ گیا جگدیش؟"

"جی۔"

"ہاں لگاؤ کھانا۔ میں آتی ہوں۔"

پارو مالکن کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر، ان کا بھیگا سا لہجہ محسوس کر کے ہمدردی کی ایک نگاہ ان پہ ڈالتی ہوئی سر ہلا کر چلی گئی۔

انہیں اچھا نہیں لگا۔ وہ ہمیشہ خود کو بہت مضبوط ظاہر کرنے کی کوشش کرتی تھیں مگر کامیاب نہ رہتی تھیں۔ عورت کو کمزور یا طاقتور اس کی اولاد بناتی ہے۔ یہ ان کے بخت تھے کہ ان کی اولاد کمزور کر دینے والوں میں سے تھی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھیں۔ واش روم میں جا کر منہ دھویا اور واپس کمرے میں آ کر آئینے کے سامنے اپنا جائزہ لیا اور کمرے سے باہر نکل آئیں۔ بیٹی کی روئی روئی سرخ ڈوروں والی آنکھوں کو دیکھا اور اس نے ماں کی گلابی ہوتی آنکھوں کو۔ دونوں کا غم ایک نہ تھا ورنہ مل کر ایک دوسرے کے کندھے پہ سر رکھ کر رو لیتیں۔

جگدیش مہیشوری نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے دونوں کی طرف دیکھا۔

"کون مر گیا؟" آستین کو اوپر کی طرف فولڈ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ دونوں چپ رہیں۔

"اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں تمہاری؟" اب وہ بہن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی خود پہ جمی نگاہ ہمیشہ اسے گڑبڑا دیتی تھی۔ دل تو چاہا، بھاؤ سے کہہ دے۔ "پری سے ہی پوچھ لیں۔" ظاہر ہے کہہ نہیں سکتی تھی، اس لیے یک لفظی جواب دیا۔

"اچھی۔"

"ہونہہ۔ مجھے پتا چلا ہے کہ پانی ہاسٹل کا پیا نہیں جاتا تم سے۔ امر سے کہوں گا، واٹر ڈسپنسر لے کر بھجوا دے گا تمہارے روم میں۔" ہنکارا بھر کر پلیٹ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس نے کہا۔ "کیا جاہلوں کی طرح پلیٹ بھر دی ہے۔" اب وہ لاجونتی پہ برس رہا تھا۔ اس نے پلیٹ اتنے زور سے پرے کی کہ اس میں سے کڑھی کے چھینٹے اور چاولوں کے کئی دانے میز پہ جا پڑے۔ لاجونتی نے ایک سلگتی ہوئی نگاہ بھی پرمیشور پہ ڈالی اور ضبط سے ہونٹ کاٹتے ہوئے دوسری پلیٹ اس کے سامنے رکھ کر اس میں ابلے چاول ڈالنے لگی۔

گائتری دیوی نے ہمدردی بھری نگاہ سے بہو کی طرف دیکھا۔ جس کے رخساروں کی ہڈی پہ ہلکی ہلکی سی چھائیاں نظر آنے لگی تھیں۔ دو سال پہلے ہی جب بیاہ کر آئی تھی تو کھلتے گلاب جیسی تھی۔

"سنا ہے راجیو کا باپ سو تولہ سونا اور گاڑی دے رہا ہے بیٹی کو جہیز میں۔" ممی بیٹے سے کہہ رہی تھیں۔ اصل سے وہاں بیٹھنا دو بھر ہوا۔

"ہاں تو مہیشوری پیچھے رہیں گے کیا۔ ہم درگا کو اس سے زیادہ دیں گے۔" جگدیش نے ممی کی بڑی پریشانی کو دور کیا۔ وہ مطمئن ہو کر کھانا کھانے لگیں، جبکہ اس کی بھوک مر گئی۔ لاجونتی بے نیازی بیٹھی رہی اور دو چار نوالے لے کر اٹھ گئی۔ وہ نند سے کچھ زیادہ دلیر تھی۔ بیچ کھانے میں اٹھ سکتی تھی۔

"تم پھر سے پری سے کانٹیکٹ میں ہو؟" اس کے اٹھ جانے کے بعد ممی نے بیٹے کو گھورا۔ اس نے ہاں میں جواب دیا نہ ہی ناں میں۔ کولڈ ڈرنک کا گھونٹ بھرتے ہوئے محض ہنس دیا۔

"مجھے وہ لڑکی بالکل پسند نہیں۔" ممی کو اس کی ہنسی نے کافی کچھ سمجھا دیا تھا۔

"وہ بھی آپ کے بارے میں کچھ ایسے ہی خیالات رکھتی ہے۔" اس نے گلاس میز پہ رکھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ ممی ایک پل کے لیے چپ سی ہوئیں۔

"جب میں نے تم سے کہا تھا کہ اتنی ہی پسند ہے وہ لڑکی تو شادی کر لو اس سے۔ تب منع کر دیا۔ تب تمہیں لاجونتی کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آتا تھا۔ اب پھر یہ کیا قصہ شروع ہوا ہے؟"

"ارے ممی۔ کوئی عورت ایسی ہوتی ہے جس

سے شادی کی جاسکتی ہے اور کوئی عورت۔ ایسی جس سے شادی نہیں کی جاسکتی۔" بات کرتے کرتے بہن پہ نظر پڑی تو لفظ بدل ڈالے ورنہ کہنا تو وہ یہ چاہتا تھا کہ کچھ عورتیں محض وقت گزاری کا دلکش سامان ہوتی ہیں۔ بیوی بننے کی اوقات نہیں ہوتی ان کی۔

"درگا۔ جاؤ میری میڈیسنز لے آؤ میرے بیڈروم سے؟" ممی نے اسے وہاں سے اٹھایا۔

اصل تو بہانا چاہتی تھی۔ دوائیں پارو کے ہاتھ بھجوا کر پھر واپس نہ آئی۔ جبکہ کھانے کی میز کے گرد بیٹھے ماں بیٹے میں ابھی "پری" پہ گفتگو جاری تھی۔

ممی کو جب سے پتا چلا تھا، رہ رہ کر لاجونتی کا خیال آتا۔ انہیں ہر حال میں بیٹے کے بھٹکتے قدموں کو موڑ کر اسے گھر کی طرف واپس لانا تھا۔

"ایسا کیوں کر رہے ہو جگدیش؟"

"ممی۔ رام مہیشوری کی بیوی ہو کر یہ سوال۔ چچ چچ۔ کچھ مزا نہیں آیا۔ ڈیڈی کو آپ تب رجھاتیں دیتی تھیں جب وہ دو بچوں کے باپ تھے۔ میرا تو ابھی کوئی بچہ بھی نہیں۔" جگدیش کسی بات کا اثر کم ہی لیتا تھا۔

"ضروری نہیں ہے کہ تم اپنے باپ کے نقش قدم پہ ہی چلو۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ غلط ہے جگدیش۔"

ممی کی بات پہ اس نے بڑا قہقہہ لگایا۔

"غلط صحیح کی تعریف شریف عورت سے زیادہ کوئی نہیں کرسکتا ممی۔ کیونکہ اس کے پاس کچھ غلط کرنے کی نہ آزادی ہوتی ہے نہ حق۔ اس کی لگام ذرا ڈھیلی کرکے دیکھیں۔ کتنا صحیح پہ قائم رہتی ہے وہ۔"

جگدیش مہیشوری کے اپنے خیالات تھے، اپنے نظریات تھے جن کو تبدیل کرنا کم از کم گائتری دیوی کو ناممکن سا لگنے لگا تھا۔ ابھی بھی ساری گفتگو بے نتیجہ رہی۔

☆☆☆

تمہاری انجمن سے اٹھ کے دیوانے کہاں جاتے
جو وابستہ ہوئے تم سے وہ فسانے کہاں جاتے

قبلہ چوہدری ہمایوں سلیمان آج بزم آرائی کے موڈ میں تھے۔ اس پہ یوں ہی دورے پڑتے تھے۔ ایک گانا پسند آگیا تو سارا دن نا صرف وہی سنتا ہے بلکہ ایک ایک کو پکڑ کر سنواتا ہے اور پھر اگلا بندہ جب تک کہہ نہ دیتا کہ واہ کیا بول ہیں، واہ کیا آواز ہے، واہ کیا سُر ہیں۔ اس کی جان نہیں چھوڑنی۔ یعنی کہ جو چیز چوہدری ہمایوں سلیمان کو پسند ہے، اس کی تعریف سب پہ لازم ہے۔

آج شاعری کی طرف دل راغب ہوا تو دیوان کے دیوان پڑھے جا رہا تھا۔ اور دیوان بھی کس پہ، انجمن آرا پہ۔ اور کپڑے استری کرتی انجمن آرا کی توجہ بالکل بھی اس کی طرف نہیں تھی۔ جن دنوں اسود گھر پہ ہوتا تھا، اس کا سارا دھیان اسی طرف لگا رہتا۔ وہ برآمدے میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پہ بیٹھا تھا اور سامنے پلاسٹک کی میز پہ مومنہ اس کے لیے ناشتا لگا رہی تھی۔ وہ رات دیر سے سویا تو صبح اٹھا بھی دیر سے۔ ناشتے کا مخصوص ماحول ختم ہو چکا تھا، بچے اسکول جا چکے تھے، صحن اور برآمدے میں جھاڑو پوچا کیا جا چکا تھا۔ ڈسٹنگ ہو چکی تھی اور آسیہ کی لگائی مشین آدھے کپڑے دھو چکی تھی۔

جگنو کی روشنی ہے کاشانہ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

ہمایوں کی آواز ایک دم سے پھر گونجی۔

"دے ہمایوں۔ نہ پڑھا اتنے شعر انجمن پہ۔ اس نے اپنے آپے میں نہیں رہنا۔" ارم اس کا انجمن نامہ سن کر کہہ رہی تھی۔

"اچھا پھر کس پہ پڑھوں شعر۔ ارم پہ۔ ارم (جنت) کی طرف لوگوں کا دھیان جاتا نہیں، وہ دنیا کی انجمن میں کھوئے رہتے ہیں۔" چوہدری ہمایوں سلیمان کو فلاسفر بننے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگی۔

"ارم کی طرف جس کو دھیان کرنا چاہیے، وہی نہیں کرتا تو کسی اور سے شکوہ کیا۔" ارم اپنی سمجھ کے مطابق سمجھ کر غمگین ہوئی۔ سویرے سویرے سفیان کے ساتھ ہونے والی تازہ جھڑپ یاد جو آگئی۔ "اسے لگا ہے، میں کوئی یتیم، مسکین لاوارث ہوں۔ جیسا چاہے سلوک کرلے۔"

"اب اتنے ظالم بھی نہیں ہیں چاچو ہمارے۔" ہمایوں ہنسا۔

"ہاں۔ تم نے تو اسی کی سائیڈ لینی ہے چاچا جو ہوا۔ میں تو ٹھہری اوپری (پرائی)۔" ارم مزید دکھی ہوئی۔ ہمایوں پھر ہنس دیا۔

"رات حبہ کو تھپڑ مارا تمہارے اچھے چاچو نے، آدھا گھنٹہ روتی رہی بے چاری۔ نیند میں بھی ہچکیاں لیتی رہی۔" ارم کو اس کی غیر سنجیدگی بھا نہ رہی تھی اس وقت۔

"آپ نے شکایت لگائی ہوگی۔"

"لو۔ یہ جرم بھی میرے کھاتے لکھ دو۔" ارم نے نظریں چرا کر کہا۔ "ویسے اس کے دماغ پہ غصہ سوار رہتا ہے، لڑنے مارنے کا تو بہانا چاہیے ہوتا ہے۔"

اسود کے لیے پراٹھے بنا کر باقی کا آٹا اور مکھن کا پیالہ فریج میں رکھتے ہوئے رحیمہ احمد نے تاسف سے ارم کی طرف دیکھا۔ اکیلے میں وہ اسے کئی بار سمجھا چکی تھیں کہ وہ یوں ہر ایک کے سامنے سفیان کی خامیوں کا ذکر یا اس کی برائی نہ کیا کرے۔ اس سے میاں بیوی کا رشتہ خراب ہوتا ہے۔ اور یہ کم عقل۔ دل کی بری نہ تھی مگر نادان تھی۔

"مومنہ۔ پانی۔" اسود نے ناشتا شروع کرنے سے پہلے میز پہ سجے لوازمات پہ نظر دوڑائی۔ سب کچھ تھا، پانی نہیں تھا۔ اگر تو ہوتے یہاں چوہدری صاب تو مومنہ ڈانٹ کھا لیتی۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ کھانے کی میز پہ سب سے پہلے رکھا جانے والا اور سب سے آخر میں اٹھایا جانے والا پانی کا جگ ہونا چاہیے۔

"میں لاتی ہوں پانی۔" انجمن نے استری وہیں چھوڑی۔

"رہنے دو تم۔ مومنہ دیتی ہے۔" موبائل کی اسکرین پہ نظر دوڑاتے ہوئے اسود نے منع کیا۔ وہ دل مسوس کر رہ گئی۔

"کیا موڈ ہے اسود؟" ہمایوں انجمن نامہ چھوڑ کر باہر جانے لگا تو اس سے پوچھا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" اسود نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے بنی کا ایک چکر لگا کر پھر سے ہاریوں کے ساتھ کچھ معاملات طے کرنے ہیں۔"

"اچھا تم چلو۔ میں آتا ہوں پھوپھو اور مظہر سے مل کے۔"

"ہاں آجانا۔ مجھے ایک بات کرنی تھی تم سے۔"

"خیر؟" اسود نے پراٹھے کا لقمہ توڑتے ہوئے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ ارم اور رحیمہ احمد نے بھی الجھے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ ہاں خیر ہی ہے۔" موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے تسلی دی اور حبہ، ولی کو پورے صحن کا ایک چکر لگوا کر برآمدے کے آگے اتارا۔ موٹر سائیکل گیٹ تک لے کر گیا۔ اتر کر سرخی گیٹ کا بڑا سا پھاٹک کھولا۔ موٹر سائیکل باہر نکالی۔ واپس آکر پھاٹک بند کیا اور چھوٹے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ باہر گھر پہ ہوتا تھا تو ابو، تایا ابو اور ہمایوں کے موٹر سائیکل کے لیے گیٹ کھولنے اور بند کرنے کی ذمہ داری اس کی ہوتی تھی جس پہ وہ بہت چڑتا تھا۔

"امی! خالہ کا فون آیا تھا۔ وہ بتا رہی ہیں کہ خرم پاکستان آ رہا ہے۔" اسود ناشتا کرکے کچن کے دروازے تک آیا اور رفعت جہاں کو رات آنے والے فون کی بابت آگاہ کیا۔ دوپہر کے کھانے کی تیاری کرتی فاطمہ کا دل زور سے دھڑکا۔

"خیر سے آئے۔" امی بھی خوش ہوئی تھیں جان کر۔

"کہہ رہی تھیں کہ فاطمہ کو رخصت کرنے کی تیاری کریں۔"

فاطمہ کے چہرے پہ لالی جھلکی۔ بھائی سے حیا آئی تو چہرہ دوسری طرف کرلیا۔

"ہاں ان شاء اللہ۔ تمہارے ابو سے کہہ رہی تھی میں کہ یاسر اور فاطمہ کی شادی اکٹھے کر دیتے ہیں۔ پوچھ رہے تھے کہ تیاری کتنی ہے۔ میں نے کہا، زیور بنا لیا ہے۔ کپڑے بھی بن ہی گئے ہیں۔ باقی برتن بستر فرنیچر تو دینا نہیں۔ فاطمہ نے کون سا پاکستان میں رہنا ہے۔ ہاں یاسر کا کمرہ ڈالنا ہے اور شادی کے باقی اخراجات۔ وہ تو مردوں کے کام۔ ہماری طرف سے ایک طرح تیاری ہی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ سوچیں گے۔ تم کیا کہتے ہو اسود؟" امی نے تفصیل سے بتاتے ہوئے مشورہ لیا۔

"ماں سے مشورہ لیا آپ نے؟ وہ کیا کہتی ہیں؟" اسود کے نزدیک اپنی رائے سے زیادہ رحیمہ احمد کی رائے اہم تھی۔

"آج بات کروں گی۔" امی نے سر ہلا کر کہا۔

ایک وقت تھا کہ وہ رحیمہ احمد کی اس اہمیت پہ جلتی تھیں، کڑھتی تھیں، مقابلے بازی پہ اتر آتی تھیں۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ ان کی بیوگی کے بعد ان کی خوب صورتی سے خائف رہنے لگیں۔ مگر اب ایسا نہیں تھا۔ وہ رحیمہ بھابھی کی اہمیت کو تسلیم کر چکی تھیں۔ دیر سے ہی پر یہ سمجھ بھی انہیں آ چکی تھی کہ رحیمہ باجی نہ ان کی دشمن ہیں نہ ہی ان کے بچوں کی اور نہ ہی وہ ان کے شوہر کو ان سے چھیننے کا ارادہ رکھتی ہیں۔

☆☆☆

نہر کے کنارے قطار میں بھاگتی ان چھ سات گاڑیوں کو دیکھ کر گنگا کے مٹی سے بھرے پھٹی ایڑیوں والے پیروں میں ایک انچ بھی اوپر اٹھنے کی سکت نہ رہی۔

جب تک وہ گاڑیاں لال حویلی کے پہلو میں کھڑی سفید کوٹھی کے گیٹ کے پار جا کر نظروں سے غائب نہ ہوئیں اس کے پپوٹوں میں بھی، اس کے پیروں کی طرح کوئی حرکت نہ ہوئی۔ جیسے ہی سفید کوٹھی کے گیٹ کے دونوں حصے پھر سے آپس میں مل کر ایک ہوئے، ننگی تاروں نے اس کے بدن کو جیسے چھو لیا۔ اس نے جھرجھری لی اور ہانپتی کانپتی اپنے گھر کی طرف بھاگنے کی سی رفتار کے ساتھ چلنے لگی۔

باڑھ پار کرتے ہی درانتی اور گھاس ایک طرف پھینکے اور خود زمین پر بیٹھ کر سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"ہے رام۔" اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔

"کی تھیو (کیا ہوا)؟" کملا نے اس کے قریب آ کر فکرمندی سے پوچھا۔

گنگا نے ہاتھ پرے کرتے ہوئے سر اٹھا کر اس کی طرف خالی خالی نگاہوں سے دیکھا، جواب کوئی نہیں دیا۔ یہی نگاہیں جب گھوم کر برتن مانجھتی مالا پر گئیں تو ان میں ہراس بھر گیا۔ وہ اٹھ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

"مالا۔ جا تو اپنے ماما کے گھر جا۔ تلسی کو بھی لے جا۔"

یہ چودھویں سال کو چڑھتی بھرے بھرے جسم والی مالا دیگچی ہاتھ سے رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"یہ لے یہ رکھ پیسے۔" گنگا نے گھاگھرے کے نیفے کو ذرا سا ڈھیلا کرتے ہوئے اس میں یوں انگلیاں چلائیں جیسے کبھی ازار بند ڈالنے کے لیے کچھ نہ ملے تو انگلیوں کی مدد سے اسے نیفے میں آگے کیا جاتا ہے۔ اور نیفے میں سے سو سو کے تین مڑے تڑے نوٹ نکالے۔

"موہن۔ او موہن۔" روپے مالا کی ہتھیلی پہ رکھتے ہی وہ موہن کو ڈھونڈنے چل پڑی جو مالا اور تلسی کو دوسرے گوٹھ چھوڑ کر آتا۔

مالا حیران پریشان سی وہیں کھڑی تھی جبکہ کملا سمجھ گئی تھی گنگا کے اس قدم کی وجہ۔ وہ خود بھی پریشان ہوئی۔

گائتری دیوی نے غور سے بیٹی کا چہرہ دیکھا۔

اس گھر میں داخل ہوتے ہوئے اس کا چہرہ یوں نہ دمکتا تھا۔ یہ گھر اور اس گھر کے مکین اس کے لیے ان چاہے تھے، وہ یہاں کبھی آنا نہیں چاہتی تھی مگر چھٹیوں میں آنا پڑتا تھا۔ گن گن کر چھٹیاں گزارتی اور پھر واپسی کی راہ لیتی۔ جیسے جیسے اس کے جانے کے دن قریب آتے، اس کے چہرے کی دمک دیکھنے سے تعلق رکھتی۔ مسرت اس کے ہر انداز سے جھلکتی یا شاید گائتری دیوی ہی زیادہ حساس ہو گئی تھیں۔

یہ کروڑ پتی عورت ایک بھکارن تھی۔ خالی کاسہ لیے ہر جذبے کو حسرت سے تکا کرتی۔ اس کے کشکول میں کبھی اس کی اولاد نے محبت، توجہ جیسی کوئی چیز نہ ڈالی تھی۔ یہ جذبے جانے کہاں لٹا آتے تھے۔

"پھر کب آؤ گی درگا؟" وہ اس جوش کے ساتھ اسے پیکنگ کرتے دیکھ کر پوچھے بنا نہ رہ سکیں۔

اس نے ہاتھ روک کر ممی کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا کہ کہہ دے "میرا بس چلے تو...... کبھی نہیں" مگر کہہ نہ پائی۔

"جب چھٹیاں ہوں گی۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"چھٹیاں کب ہوں گی؟"

"کیا ممی...... مجھے کیا پتا۔" اس نے بیزاری سے کہتے ہوئے سفید رنگ کا ایک جوڑا ہینگر سے نکال کر بیگ میں رکھا۔

"یہ سوٹ...... یہ کب لیا درگا؟ میں نے نہیں دیکھا۔" ممی نے اس سفید جوڑے کی بابت پوچھا جس کے دامن اور آستینوں پہ ہلکے گلابی رنگ کی کڑھائی تھی۔ وہ گھر لے کر تو آئی تھی مگر پہننے کا موقع نہ آیا تھا۔

"یہ سوٹ...... یہ تو......" وہ بوکھلا گئی۔

"فضہ...... فضہ نے گفٹ کیا ہے۔"

ممی نے سر ہلایا۔ انہوں نے یقین کر لیا تھا پھر بھی اس کے ہاتھ میں کپکپاہٹ اتر آئی تھی۔ وہ خواہ مخواہ بیگ میں رکھے کپڑوں کو ادھر ادھر کرنے لگی۔

"تم نے بتایا تھا کہ وہ اپنی پڑھائی کا خرچ بھی بمشکل پورا کرتی ہے۔ اس لیے اس سے ایسے تحفے نہ لیا کرو جو اس پہ بوجھ بنیں۔ بلکہ ہو سکے تو اس کی مدد کرنے کی کوشش کیا کرو۔"

اس نے ممی کی نصیحت پہ اثبات میں سر ہلایا اور ان کے کمرے سے نکلتے ہی اطمینان بھرا سانس لیا۔ پھر اس نے مڑ کر بیڈ سے اس سوٹ کا دوپٹہ اٹھایا اور اپنے چہرے تک لے گئی۔

"ماں۔" بے آواز کہتے ہوئے اس نے دوپٹے پہ اپنے لب رکھ دیے جس میں رحیمہ احمد کی مہک تھی۔ جس کے ہلکے گلابی رنگ کے پھولوں میں ان کے ہاتھ کا لمس تھا۔ ٹانکے ٹانکے میں ان کا پیار تھا۔

اس بار اسود آیا تو اس کے لیے یہ تحفے لے کر آیا تھا۔ اس نے بے تابی سے اسی وقت کھول لیا۔ اسود مسکراتا رہا تھا۔

"میرے پاس آج بھی وہ کپڑے، وہ جوتے پڑے ہیں۔ جو اس رات ماں نے میرے لیے بیگ تیار کرتے ہوئے اس میں رکھے تھے۔ اور لان کے وہ جوڑے بھی جو انہوں نے سردی کا موسم ہونے کے باوجود بیگ میں رکھ دی تھی۔ شاید وہ جانتی تھیں کہ مجھے اب لوٹ کر نہیں آنا۔" وہ خوشی کے ساتھ تحفہ دیکھتے دیکھتے اداس ہونے لگی تھی۔

"بابا تو کہتے تھے کہ تم لوٹ کر آؤ گی؟" اسود نے اسے اداسی کے بھنور سے نکالنے کی کوشش کی۔

ورنہ سچ بات تو یہ تھی کہ اس چاندنی رات کے تاریک لمحے اس کے لیے بھی عذاب ناک تھے۔

اس رات بچے سو رہے تھے۔ اچانک اس کی آنکھ کھلی تھی کیونکہ اس کے ابو اور امی اس کے پلنگ کے پاس کھڑے ہی باتیں کر رہے تھے۔ نیند سے جاگنے کے سبب اسے بات تو سمجھ میں نہ آئی تھی مگر اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ وہ پریشان ہیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا امی؟"

"کچھ نہیں، تم سو جاؤ۔" جواب ابو نے دیا تھا۔

امی ابو پھر اس کی چارپائی کے پاس سے ہٹ کر کمرے سے باہر چلے گئے تھے۔ وہ بھی اٹھ کر ان کے پیچھے آ گیا۔ اور ایسا منظر دیکھا کہ پھر اس رات تو کیا اگلی کئی راتیں وہ پوری نیند نہیں لے پایا۔

ماں احمل کو سینے سے لگائے ہوئے تھیں اور شاید وہ رو رہی تھیں۔ امی اور آسیہ چاچی ان کے پاس کھڑی تھیں، پھوپھو فردوس بھی بھاگی بھاگی چلی آ

رہی تھیں۔ وہ بھاگ کر امی کے پاس آیا۔

"امی! کیا ہوا؟"

امی نے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ کوئی جواب نہ دیا مگر احتل کی منتوں ترلوں نے جواب دے دیا تھا۔ وہ کہیں نہیں جانا چاہ رہی تھی اور ماں اسے بھیج رہی تھیں۔

وہ بھاگ کر کمرے میں گیا۔ یاسر کو جگایا۔

"احتل جا رہی ہے۔"

یاسر گہری نیند میں تھا، نہیں اٹھا۔ وہ فاطمہ کی طرف بھاگا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ سب اٹھ جائیں اور جاتی ہوئی احتل کو روک لیں۔ فاطمہ اٹھ گئی تھی، مومنہ بھی اٹھ گئی تھی مگر اسے جانے سے کوئی نہ روک پایا تھا۔

"سچ ...... بابا ایسے کہتے تھے؟ اور کیا باتیں کرتے تھے وہ میری۔" احتل گلابی پھولوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ وہ چونکا اور پھر مسکرا کر بابا کی باتیں بتانے لگا۔ اس نے بابا کی زندگی کے آخری دن، ان کی دروازے پہ جمی منتظر نگاہیں، ان کی مایوسی سب کچھ حذف کر کے صرف آس و امید کی باتیں کی تھیں۔

"درنگا۔" ممی اچانک کمرے میں واپس آئیں۔ وہ اس قمیص کو ہاتھ میں لیے اس پہ بنے پھولوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے جانے کیا سوچ رہی تھی۔ وہ ٹھٹک گئیں۔ کیا ان کی بیٹی ان سے کچھ چھپا رہی تھی، کوئی جھوٹ بول رہی تھی۔

"جی ممی۔" وہ چونکی، بوکھلائی اور پھر جلدی سے قمیص کو تہہ کر کے بیگ میں رکھتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

"ہاں ...... میں کہنا بھول گئی تھی کہ پوجا کے لیے تم بھی اچھا سا گفٹ لے لینا اپنی طرف سے۔ اسے اچھا لگے گا اور راجیو کو بھی۔" ممی کو اپنے دوبارہ آنے کی وجہ یاد آئی۔ راجیو کی بہن کی شادی تھی اور وہ چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹی بھرپور طریقے سے اس میں شرکت کرے۔

"اوکے ممی۔" ان کی توقع کے خلاف اس نے تابعداری سے سر ہلایا تو پہلے تو انہیں یقین ہی نہیں آیا، پھر ہلکا سا مسکرائیں۔

"راجیو بھی جامشورو میں ہی مہران یونیورسٹی میں ہوتا ہے، پھرامر نے بتایا کہ وہ دو تین بار درگا سے ملنے بھی آیا تھا۔ لگتا ہے ان کی اچھی انڈراسٹینڈنگ ہو گئی ہے۔" گائتری دیوی اپنے ہی اندازے لگانے لگیں۔

☆☆☆

"میں راتی تیری آواز سنی تے ویکدی رہے گی کہ پھوپھی نوں سلام کرن آوے گا۔ (میں نے رات تمہاری آواز سنی تو منتظر رہی کہ پھوپھی کو سلام کرنے آؤ گے)"

دروازہ پھوپھو فردوس نے کھولا تھا اور اب ایک گھٹنے پہ ہاتھ رکھے ذرا سا جھک کر چلتی ہوئی کہہ رہی تھیں۔ اسود شرمندہ سا ہوا۔

"میرے گوڈے گٹے کیے کم جوگے نہ رہے۔ تیں تے آپی تج کے تینوں ویکھن آ جاندی۔ (میرے گھٹنے اور ٹخنے کسی کام کے نہیں رہے ورنہ خود ہی بھاگ کر تجھے دیکھنے آ جاتی)"

"آپ دوا لے رہی ہیں۔" اسود نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں چارپائی پہ بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"اس عمر کی جدوں سارے ساتھ چھڈ جاندے تیں تے دوا دا ساتھ ہی رہ جاندا اے۔ پھوپھے تیرے نوں اپنی تکلیف دساں تے پچاہ بیماریاں اُتوں اپنیاں یاد آجاندیاں نے۔ ہور اولاد...... اولاد دی ایہوں جی پیڑی کہ مجال اے دو ساہ ماں لاگے بہہ جاوے۔ (اس عمر میں جب سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں تو دوا کا ساتھ ہی باقی رہتا ہے۔ تمہارے پھوپھا کو اپنی تکلیف بتاؤں تو اسے پچاس بیماریاں اپنی یاد آ جاتی ہیں۔ اور اولاد...... اولاد بھی ایسی بری کہ مجال ہے دو گھڑی ماں کے پاس بیٹھ جائے)"

وہ پھوپھو کے شکوے شکایتیں سنتا رہا۔ پھوپھو

کڑوے مزاج کی تھیں، اوپر سے گفتگو صرف طنزیہ۔ اس لیے سب ان کے پاس بیٹھنے سے احتراز کرتے تھے۔ اور ہمایوں بدتمیز جان بوجھ کر مزے لینے کے لیے ان کے پاس بیٹھتا تھا۔

"مظہر کہاں ہے پھوپھو؟"

"گان ڈیا ہوئے گا گیت بڈی دے۔ (گا رہا ہوگا گیت بیوی کے)" پھوپھو نے مظہر کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کہا تو وہ مسکرائے بنا رہ نہ سکا۔

اندر کمرے میں بیٹھی مہرتاب اسود کی آواز سن چکی تھی۔ آواز تو اس کی وہ دیوار پار سے رات سے سن رہی تھی اور ماں سے زیادہ بے قرار تھی اسے دیکھنے کے لیے، مگر منتظر ہی رہی کہ امی کو سلام کرنے یا مظہر اطہر سے ملنے آ جائے اور وہ نہ آیا۔ شاید رات دیر سے پہنچا تھا، اس لیے۔

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

کتنا اچھا کتنا منفرد سا لگتا تھا وہ خاندان بھر کے لڑکوں سے۔ جس جگہ بیٹھتا تھا، سحر سا باندھ دیتا تھا۔ اس کی صورت، اس کا لباس، اس کا انداز، اس کا لہجہ، اس کی چال...... سب قاتل۔

"نی رباب...... میرو...... بار آؤ۔ پائی آیا اے، چاہ بناؤ اودے لئی۔ (باہر آؤ۔ بھائی آیا ہے۔ اس کے لیے چائے بناؤ)"

"امی بھی ناں ...... بھائی ہی بنانا تھا تو صرف رباب کو آواز دیتیں۔" مہرتاب بڑبڑاتی ہوئی پیچھے ہٹی۔ کمرے میں دو تین چکر کاٹے، رہ نہ سکی تو آئینے میں صورت دیکھ کر لٹ ٹھیک کی، آنکھوں کے گرد کاجل کی لکیر کھینچی، مسکرائی اور باہر آ گئی۔ پھر مسکرائی۔

"کیسی ہو مہر؟" اس کے سلام کو جواب دیتے ہوئے اسود نے پوچھا۔ اس کا اتنا سا پوچھ لینا ہی مہرتاب کے لیے کئی دن مسکانے کا بہانا بن جاتا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

"کالج جا رہی ہو؟"

"اے کی کتھے جائے کالج۔ رباب دا بی اے دا آخری سال اے۔ اودی کلاس ہوندی تکیں۔ ایدی بی ایس دی کلاس ہوندی اے۔ پر پراہ ذمہ داری چکدے تکیں۔ گڈی تے پہلے ای خراب رہندی اے۔ سوچیا سی ...... مومنہ دی داخلہ لے گی تے دوناں بہناں نوں رکشہ لوا دیاں گے۔ پر مومنہ تے کہندی اے، اونے یونیورسٹی جانا اے۔ (یہ اکیلی کیسے جائے کالج۔ رباب کا بی اے کا آخری سال ہے۔ اس کی کلاس ہوتی نہیں۔ اس کی بی ایس سی کی ہوتی ہے۔ مگر بھائی ذمہ داری اٹھاتے نہیں۔ گاڑی پہلے ہی خراب رہتی ہے۔ سوچا تھا کہ مومنہ بھی داخلہ لے گی تو دونوں بہنوں کو رکشہ لگوا دیں گے۔ لیکن مومنہ تو کہتی ہے کہ اس نے یونیورسٹی جانا ہے)" جواب پھوپھو فردوس نے دیا۔

"ہوں......" اسود نے کچھ سوچتے ہوئے رباب کے ہاتھ سے کپ لیا۔ وہ کچن میں ہی دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ جلدی سے دیور کے لیے چائے بنا لائی تھی۔ ہونے والے سسرالیوں کی خدمت کرنے میں وہ بڑی مستعد تھی۔

"مومنہ لے رہی ہے یونیورسٹی میں داخلہ" سوال پوچھتے ہوئے مہرتاب کے دل میں خواہش تھی کہ اسود منع کر دے۔

"دیکھتے ہیں۔" اسود نے مختصر سا جواب دیا۔

"جانا سی تے ایسے سال جاندی۔ سال ضائع کرن دی کی لوڑ سی؟ (جانا تھا تو اسی سال جاتی۔ سال ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی)" پھوپھو فردوس کی تو ذرا سمجھ میں نہ آئی تھی اپنی بھتیجی کی۔

"پہلے تو اجازت نہیں ملی تھی ماموں سے۔ کہتی ہے ...... اب احتل بھی ہے ہاسٹل میں ...... اب اجازت مل جائے گی اسے۔" احتل کا نام لیتے ہوئے مہرتاب نے غور سے اسود کی طرف دیکھا۔ جانے کیا کھوجنا چاہتی تھی۔

"اسود! اوداں میں خوش تکیں تیرے توں

۔(اسود! ویسے میں خوش نہیں تم سے)'' انہوں نے پیر کی انگلیاں دباتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔
''کیوں پھوپھو؟'' اسود نے اچنبھے سے پوچھا ۔حالانکہ یہ ایسی کوئی حیرانگی والی بات بھی نہ تھی ۔پھوپھو فردوس کم ہی کسی سے خوش ہوتی تھیں۔
''کی لوڑ سی یکے قصے نوں فیر شروع کرن دی۔(کیا ضرورت تھی ختم ہوئے قصے کو پھر سے شروع کرنے کی)''
''میں سمجھا نہیں پھوپھو۔''
''اس ہندنی نوں ویکھ ای لیا سی۔تے پائی ریمہ نال کیوں طواڈتا۔(اس ہندو کو دیکھ ہی لیا تھا تو رحیمہ بھابی سے کیوں طواڈالا۔''
''اوہ......'' اسود اب سمجھا۔ ''پھوپھو وہ ہندنی نہیں امت الاحد ہے۔''
''اکو گل اے۔(ایک ہی بات ہے)'' انہوں نے نخوت کے ساتھ ہاتھ جھٹکا۔
''ایک ہی بات نہیں ہے پھوپھو...... جو امت الاحد ہوتی ہے، وہ کبھی ہندنی نہیں ہو سکتی۔'' اسود نے مضبوط لہجے میں کہا۔اسے پھوپھو کی بات پسند نہیں آئی تھی اور ان دونوں ماں بیٹی کو اس کی۔
''بُھل گیا کی؟ کی کیتا سی اِناں ظالماں نے میرے مردے پراہ دے نال۔(بھول گئے کیا ......کیا کیا تھا ان ظالموں نے میرے مرتے ہوئے بھائی کے ساتھ)''
''کوئی کچھ بھی نہیں بھولا ہے پھوپھو۔آپ شاید بھول رہی ہیں کہ آپ کے بھائی کے لیے کیا تھی احتل۔''
'' جانندی آں ...... جانندی آں۔(جانتی ہوں)'' پھوپھو نے ہاتھ جھٹک کر کہا اور پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگیں۔اسود نے جلدی سے چائے ختم کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔
''مظہر کو بتا دیجیے گا کہ میں ہمایوں کے پاس ہوں۔وہیں آجائے۔''
''کھانا کھا کر جائے گا۔'' ...ب جلدی سے آگے بڑھی۔مگر وہ رکا نہیں تھا۔شائستگی کے ساتھ معذرت کرکے نکل گیا۔وہ ڈوبتے دل کے ساتھ کمرے میں واپس آئی۔
''ٹھیک ہے کہ اس نے امی کے سامنے جان بوجھ کر احتل کا نام لیا تھا۔وہ چاہتی تھی کہ امی اسود کو تنبیہ کریں تاکہ وہ احتل سے دور رہا کرے۔مگر وہ امی کی زبان کو بھول گئی تھی جو اس لڑکی کا ذکر کرتے ہی کونین کی گولی ہوجاتی۔اب اسے یہ فکر ستا رہی تھی کہ اسود خراب موڈ کے ساتھ ان کے گھر سے گیا ہے۔''

☆☆☆

اسود پھوپھو فردوس کے گھر سے اٹھ کر اوطاق میں آگیا تھا۔ابو کو سلام کرتے ہوئے نئے چہروں پہ نظر ڈالی اور ہمایوں کے ساتھ دوسری چارپائی پہ بیٹھ گیا۔نئے چہروں نے بھی بڑے اشتیاق کے ساتھ اس خوبصورت جوان کی طرف دیکھا جو شہری شہری سا لگتا تھا۔
'' چوہدری صاب کا بیٹا ہے۔'' ایک نے دوسرے کے کان میں سرگوشی کی۔
''یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔'' پرانے چہروں میں سے کوئی کان میں تعارف کروا رہا تھا۔جس تک آواز جاتی وہ حد درجہ متاثر ہوکر اسے تکتا۔
''اسود...... یہ نئے ہاری ہیں۔دو ہفتے پہلے ان کا خاندان تھر سے یہاں آیا ہے۔دو بھائی اور ان کے بیوی بچے ہیں۔'' چوہدری صاب نے مختصر سا تعارف کروایا۔اسود نے سر ہلاتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ان سے دوچار باتیں کیں اور ہمایوں کو لے کر اٹھ گیا۔
''کیا ہمیں مزید ہاریوں کی ضرورت تھی؟'' اسود ہمایوں سے پوچھ رہا تھا۔
''نہیں۔''
''پھر؟''
''تھر کے حالات جانتے ہو۔بھوکے مر رہے ہیں لوگ۔بے چارے اپنا گھر بار چھوڑ کر ادھر ادھر بھٹک رہے ہیں۔آج مصیبت میں ہم ہاتھ نہ پکڑیں تو کل ہمارا ہاتھ کون پکڑے گا۔''
...عام سے حلیے میں پھرنے والا یہ عام سا زمین ...ار باتیں ایسی کر جاتا تھا کہ سننے اور دیکھنے والا اس پہ رشک کرنے پہ مجبور ہوجاتا۔اسود نے بھی اسے دیکھا اور بس دیکھ کر رہ گیا۔
''مینج ہوجائے گا؟''
وہ یہ سوال پوچھے بنا نہ رہ سکا۔کیونکہ ایک ہاری مطلب اس کا پورا خاندان۔
دکان، فیکٹری، بھٹی اکثر جگہوں پہ مالک کام پہ رکھتے ہوئے صرف تنخواہ دینے کے پابند ہوتے ہیں جبکہ زمین دار ایک ہاری نہیں رکھتا اس کا پورا خاندان پالتا ہے۔دو وقت کی روٹی، سال بھر میں سب کے لیے کم سے کم بھی عید دیوالی پہ سوٹ۔بچے بیمار ہے یا مائی پیٹ سے ہے، اس کو اسپتال لے جانا، اس کی دوا، ڈاکٹر کی فیس...... مرگ پہ کفن دفن ......بچی بچے کی شادی ہے تو زیور نہیں تو کپڑے، جوتے، برتن اس کے علاوہ شادی کے کھانے کا انتظام سب زمین دار کی ذمہ داری...... کبھی فصل جل جائے، سنڈیاں کھا جائیں، کیڑے لگ جائیں، ریٹ گر جائے، بے وقت کی برسات ہوجائے تو زمین دار کو صرف اپنی اور اپنے کنبے کی فکر نہیں ستاتی بلکہ خود سے جڑے کئی خاندانوں کی فکر ان کی نیندیں حرام کرتی ہے۔کسی اور کی نظر میں یہ سب نہیں آتا۔سب کو ایک زمین دار نظر آتا ہے جو طرے دار پگڑی پہنتا ہے، کئی ایکڑ، مربعے زمین کا مالک ہے۔انہیں نظر آتی ہیں وہ زمینیں جو سونا چاندی اگلتی ہیں۔زمیندار بھی اس پہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور خوش رہتا ہے کہ اس کی عزت بنی ہوئی ہے۔
''اللہ مالک ہے۔'' ہمایوں نے ایسا توکل پچھلی نسلوں سے پایا تھا۔
''اور وہ غلام علی اور اس کی فیملی کا پتا چلا کچھ؟''
''نہیں۔'' ہمایوں اداس ہوا اور پریشان بھی۔
چوہدری صاب نے غلام علی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جاگیردار حاکم علی سے بات کریں گے۔اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔دو دن بعد غلام علی اور اس کا پورا خاندان راتوں رات غائب ہوجائے گا۔
انہوں نے اپنے گھر کافی دور ڈال رکھے تھے، اس لیے ان کے جانے کا علم صبح کو ہوا۔وہ رات کے اندھیرے میں کسی اور زمین دار کے پیر پکڑنے گئے تھے۔چوہدری صاب نے کہہ تو دیا تھا کہ وہ حاکم علی سے بات کریں گے۔لیکن اس وڈیرے کی رگ رگ کو وہ خاندان جانتا تھا۔وہ صرف باتوں پہ ماننے والے لوگ نہ تھے۔اس کے لیے یا تو ان سے جھگڑا مول لیا جاتا یا لمبی چوڑی رقم ادا کی جاتی۔
چوہدری صاب شریف لوگ تھے۔وہ غریب ان کو اپنی وجہ سے مصیبت میں ڈالنا نہ چاہتے تھے۔اس لیے اتنی بڑی دھرتی پہ کوئی اور ٹھکانا ڈھونڈنے چل پڑے۔بھاگا ہوا ہاری خانہ بدوش ہوجاتا تھا۔اس کی قسمت میں ایک جگہ ٹک کر رہنا نہیں ہوتا۔
چوہدری صاب کو جانتا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے گئے ہیں یا انہیں اٹھوالیا گیا ہے۔اگر مرضی سے گئے تھے تو غم نہ تھا اور اگر ان کے ساتھ کچھ غلط ہوا تھا تو حتی المقدور کوشش کرتے انہیں بازیاب کروانے کی۔
''ایک لیلا آم کے پیڑ کے ساتھ باندھ گئے ہیں وہ۔'' ہمایوں نے چوہدری صاب کو جب بتایا تھا تو ان کی آنکھ میں نمی سی اتر آئی تھی۔
جاتے جاتے غلام علی نے اپنے محسنوں کا کچھ قرض ادا کرنے کی حقیر سی کوشش کی تھی۔وہ ایسا نہ بھی کرتا تو چوہدری صاب کے خاندان سے کوئی ان کا پیچھا نہ کرتا۔اور رجسٹر پہ ان کے ناموں کے صفحات میں موجود بقایاجات پہ لکیر لگا دی جاتی۔اتنی بڑی زمین پہ کہیں نہیں ہی سہی، کم کم ہی سہی، آٹے میں نمک کے برابر ہی سہی چوہدری صاب اور ہمایوں جیسے زمین دار موجود تھے۔
'' پچھلے زمین دار کے پاس کتنا قرضہ تھا؟'' اسود نے پوچھا۔
''آٹھ ہزار باپ کی بیماری پر لیے تھے اور

ڈھائی ہزار اس کے مرنے پہ۔" ہمایوں کا لہجہ رندھ گیا۔

اسود لرز کر رہ گیا گو کہ ایسا ستم وہ پہلی بار نہ دیکھ رہے تھے۔ لاکھوں تو دور کی بات چند ہزار کے عوض انسان کی جان، اس کی عزت، اس کی پگڑی گروی رکھی ہوئی ہے۔ یہ چند ہزار تو ادا ہو جاتے ہیں مگر اس پہ چڑھا سود چار ہندسوں سے ہوتے ہوئے پانچ میں پہنچ جاتا ہے۔ آخری سانس تک ساتھ چلتا ہے اور پھر اگلی نسل کی پہلی سانس کے ساتھ ہی اس کی قسمت کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے باغ میں آ گئے تھے۔ اسود نے گھوم پھر کر ہر درخت کا جائزہ لیتے ہوئے بور میں سے نظر آتی بے حد چھوٹی چھوٹی کیریوں کو دیکھا۔

"اتنا جاندار آم نہیں بنے گا۔" اسود نے ہرے رنگ کی کیریوں کو بغور دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا۔ ہمایوں نے سر ہلایا۔

"گوڈی بھی کی، کھاد بھی ڈالی مگر پچھلی دفعہ کی نسبت پھل اتنا بڑھا پھولا نہیں۔ پانی جو ضرورت سے کم ملا۔"

"ہوں...... ٹیوب ویل کی درخواست کا کیا ہوا؟"

"چکر تو لگا رہا ہوں...... دیکھو......" ہمایوں نے جواب دیا۔

"ہاں بولو...... کیا بات کرنی تھی۔" اسود پشت پہ ہاتھ باندھے اس کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔

"تم سے اظہار محبت کرنا تھا۔ گھر میں موقع ہی نہیں ملتا۔" ہمایوں نے جوائنٹ فیملی کی بہو بن کر باریک سے لہجے میں کہا تو اسود ہنس دیا۔

"مومنہ یونیورسٹی جانا چاہتی ہے تو تم تابو کو راضی کر دو ناں۔"

اسود تھوڑی دیر چپ سا ہوا۔ مومنہ کی اس خواہش سے وہ انجان نہ تھا مگر اسے بھی اندازہ نہ تھا کہ اس ضد میں وہ اپنا سال ضائع کر ڈالے گی۔ اس دفعہ وہ اسے سمجھانے کا ارادہ لے کر آیا تھا۔

"ہمارے گھر میں بیٹے بیٹی میں کبھی تفریق نہیں ہوئی۔ اس سلسلے میں بھی نہیں ہونی چاہیے۔ تم بات کرو گے تو تابو مان جائیں گے۔ تم ہو ناں وہاں...... پھر مسئلہ کیا ہے؟"

واقعی ابو کا راضی کرنا کوئی اتنا مشکل کام نہ تھا اگر وہ انہیں تسلی دیتا کہ وہ ہے ناں وہاں۔ مگر اس نے ایسا نہ کیا تھا۔

"ہمایوں...... میں پڑھتا ہوں، پڑھاتا بھی ہوں، اس لیے وہاں حیدرآباد میں میری زندگی کچھ اور ہے۔ مومنہ وہاں ہو گی تو میرا دھیان اس کی طرف ہی رہے گا۔ بس پھر اسے لانے لے جانے میں ہی لگا رہوں گا۔"

"ہاں تو بھائی ہو، اٹھانا یہ ذمہ داری۔"

"او یار...... مشکل ہے۔ چلو دیکھتا ہوں۔ سوچتا ہوں۔"

☆☆☆

یہ مہر تاب کی خوش فہمی تھی کہ اسود اس کی ماں کی تنبیہ کا کچھ اثر لے گا۔ ڈھلتی شام میں نیا انگوری جوڑا پہن کر جب اس نے سرمئی گیٹ پار کیا تو وہ سامنے ہی بیٹھا تھا رحیمہ مامی کے پاس۔ ویسے تو صحن میں ارم اور فاطمہ بھی بیٹھی جانے کون سی باتیں کر رہی تھیں۔ ارم کے بچے بھی وہیں کھیل رہے تھے۔ مگر اس کی نظر میں وہی سب سے پہلے آیا۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہوئیں اور قدم ڈھیلے پڑے۔

"مہر...... جلدی آؤ...... جلدی۔" باورچی خانے سے نکل کر کمرے کی طرف جاتی مومنہ کی نظر اس پہ پڑی تو پرجوش ہو کر اسے پکارا۔ سب نے ایک دم نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اسود نے بھی۔

وہ ابھی کمرے میں نہ جانا چاہتی تھی۔ وہ صرف چوہدری اسود حیدر کو دیکھتے رہنا چاہتی تھی۔

"آپا کی طبیعت کیسی ہے مہر؟" ارم نے پوچھا تو وہ ان کے بڑھے ہوئے بلڈ پریشر کے بارے میں بتانے لگی۔ جوڑوں کے درد کی جو کیفیات آج تھیں، وہ تو بیان ہوئیں ہی ساتھ پچھلے ہفتے کی کسی رات اچانک بڑھ جانے والی شوگر کا بھی تفصیلاً ذکر ہوا۔

"وہ مرغی کا گوشت نہیں کھا پائی۔ جب وہ مجھے بتا رہی تھی تو وہ رو رہی تھی ماں۔" مہر تاب مومنہ کی دوسری پکار پہ برآمدے کی طرف آنے لگی تو اس کے کانوں میں اسود کے الفاظ پڑے۔

وہ کس کی بات کر رہا تھا؟

"میں اپنے ہاتھ سے مرغی کا سالن بنا کر دوں گی۔ وہ کھائے گی۔ میری بیٹی کی زبان سے ذائقہ چھین لیا گیا، وہ واپس اس ذائقے کو محسوس کرے گی اسود...... ان شاء اللہ۔"

رحیمہ مامی جس جوش و جذب کے ساتھ بات کر رہی تھیں، وہ یقیناً احتل کا ذکر ہی تھا۔ وہ مرے ہوئے قدموں کے ساتھ فاطمہ اور مومنہ کے کمرے میں چلی آئی۔

"مہر......" مومنہ نے آگے بڑھ کر جوش سے اس کا ہاتھ تھاما۔ "آج دو دو اچھی خبریں ہیں میرے پاس۔"

مہر تاب بولی کچھ نہیں، سوالیہ انداز میں ابرو اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"فاطمہ اور یاسر بھائی کی شادی۔"

"کیا؟" موضوع ہی ایسا تھا کہ وہ مزید نراش نہ رہ سکی۔

"ہاں۔" مومنہ اسے خالہ کے فون اور گھر میں چلتی گفت و شنید اور مشوروں کے بارے میں بتانے لگی۔ مہر تاب بھی کچھ دیر کے لیے احتل کا غم بھولی۔

"اور دوسری خبر سنو۔"

"اچھا...... ابھی دوسری باقی ہے۔ میں سمجھی ایک فاطمہ کی شادی، دوسری رباب کی۔" مہر تاب پرتجسس ہوئی۔

"ارے نہیں...... میں اگلے سال یونیورسٹی جا رہی ہوں۔"

"کیا!!" مہر تاب کے گلے میں پھندا سا اٹکا۔ "تمہیں اجازت مل گئی؟"

"ملی تو نہیں مگر مل جائے گی۔" مسرت مومنہ کی آنکھوں سے جھلکتی تھی، لہجے میں بولتی تھی۔ ایسے ہی تو چوہدری ہمایوں سلیمان دیوانہ تھا اس کے لیے۔

"مگر کیسے؟"

"ہمایوں نے کی ہے اسود بھائی سے بات۔ اسود بھائی راضی ہو گئے تو ابو تو مان ہی جائیں گے۔"

"تو تم نے ہمایوں سے کام نکلوایا۔ شرم تو نہیں آتی بے چارے کی محبت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے۔" وہ جانے کیوں برہم ہوئی تھی۔

"محبت وحبت کو مارو گولی۔ میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ یہ میرا حق ہے۔"

"تمہارا سال ضائع ہو جائے گا۔"

"فرق نہیں پڑتا۔" مومنہ نے لاپروائی سے جواب دیا۔

مہر تاب اسے دیکھ کر رہ گئی۔ جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ احتل کی طرف جانے والے کئی رستے کھلنے لگے ہیں۔ اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا جو ندی کے دو کناروں کو ملانے والا پل چوہدری اسود حیدر نہ ہوتا۔

☆☆☆

وہ صدی بھی کبھی چڑھے گی کیا جب ان کے شکم اتنے بھرنے لگیں کہ ان کے جسموں پہ گوشت کی تہیں چڑھ جائیں۔

رام کوہلی نے اپنے گھر کے مردوں، بچوں، عورتوں، بھیڑوں، بکریوں، گدھوں اور کتوں پہ باری باری نظر ڈالی۔ سب کے پیٹ اپنی پشت سے یوں جڑے ہوئے تھے جیسے اندر بڑا سا چمچ پن لگا ہوا ہو۔

گھٹنوں کے بل چلتے رینگتے ہوئے کشن نے اس کے پاس پہنچ کر اس کی ٹانگ پکڑی اور اس کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ پھر اپنی فتح پہ تالی جو بجائی تو گر پڑا۔ اس نے جھک کر اسے اٹھایا اور اپنے پاس چارپائی پہ بٹھاتے ہوئے اس کا سرخ و سفید چہرہ دیکھا۔

یہ انقلاب کبھی آئے گا کیا کہ جلد کا جو رنگ لے

کر پیدا ہوتے ہیں، اسی رنگ کے ساتھ مریں بھی۔ یہ جو سفید، گندمی، گلابی، سانولے بچے ہیں کبھی یک رنگی نہ ہوں کبھی سیاہ رنگی نہ ہوں۔ جیسے اس کے ماں باپ، چاچے، چاچیاں، پھوپھیاں، ماسیاں سب کے جسموں کو بے درد وقت نے جلا جلا کر کوئلہ بنا ڈالا۔

کشن اب اس کے کندھے کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے آہستہ سے اس کے ہاتھ سے اپنی قمیص چھڑائی اور اسے بٹھا کر باہر نکل آیا۔ جہاں منگل گدھا گاڑی میں گدھے کی غیر موجودگی کے باعث اس کے حصے کا کام انجام دیتے ہوئے گدھا گاڑی کے ہتھوں کو اپنے بازوؤں سے کھینچ تان کر بچوں کو سیر کروا رہا تھا۔ اس نے جو شلوار پہن رکھی تھی، اس کا کسی زمانے میں ضرور کوئی رنگ رہا ہو گا مگر اس وقت اسے صرف بدرنگ کہا جا سکتا تھا۔

منگل نے رامو کے پیچھے اپنے باپ کو دیکھا تو ڈر کر ہتھے چھوڑتے ہوئے بھاگا۔ اس کا باپ ہاتھ سے اسے دو چار گالیاں دے کر واٹر پار کر گیا۔ توازن بگڑنے کے باعث گدھا گاڑی میں سوار بچے پہلے اوپر کو اٹھے پھر چیختے چلاتے لڑھک کر نیچے آنے لگے۔ جب تک رامو نے آگے بڑھ کر ہتھوں کو تھام کر ان کی مدد کرنی چاہی وہ گر گرا کر اٹھ بھی چکے تھے اور اب اپنے کپڑے جھاڑ رہے تھے۔

کپڑے کیا تھے صرف لیرایاں محض چیتھڑے۔ وہ بھی بھاگن اور روپا کے علاوہ کسی بچے کے تن پہ پورے نہ تھے۔

وہ دن بھی کبھی طلوع ہو گا کیا جب ہر بچے کا جسم مکمل ڈھکا ہو گا۔ ماؤں کو ایک جگر کے ٹکڑے کو شلوار اور دوسرے کو قمیص پہنا کر ستر پوشی نہ کرنی پڑے گی۔ جانے ایک ماں کس من کے ساتھ ایک جوڑے سے دو تن ڈھانپتی ہو گی۔

اس کو اپنے جسم پہ موجود مکمل اور قدرے اچھی حالت میں موجود لباس بچھو بن کر ڈنک مارنے لگا۔ وہ تیزی سے وہاں سے ہٹ گیا۔

واٹر کے پاس اس کا ننھا کزن مٹی بھری ہتھیلیاں ملائے واٹر کا پانی پی رہا تھا...... گدلا پانی جس میں مینڈک پھدک کر باہر کنارے تک آیا اور پھر بچوں کے چھیڑنے پہ واپس واٹر میں چھلانگ لگا دی۔

وہ موسم بھی کبھی آئے گا، جب ان کو صاف اور ٹھہرا ہوا پانی پینے کو ملے گا۔ ہمارے بچے ہیرو اور سونی کی طرح گیسٹرو اور ڈائریا سے نہیں مریں گے۔

اسے اپنے دو ننھے کزنز یاد آئے جو پچھلے سال اس بیماری سے چل بسے تھے۔ ان سوچوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے اس نے ساون کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ وہ اپنے گھر کی کانٹوں بھری باڑھ کے پچھواڑے پہنچا تو ایک طرف خموادھ ننگا زمین پہ بیٹھا ہوا تھا۔ اسی وقت کملا کاکی بھی جھاڑی کے پیچھے سے کھا گھرا ٹھیک کرتی ہوئی نکلی۔

وہ سورج بھی کبھی نکلے گا جس دن ہم ایسا ایک گھر بنا پائیں جس میں ایک غسل خانہ ہو۔ ایک لیٹرین ہو۔ کسی کو کھیتوں کے اندر، کسی کو جھاڑیوں کے پیچھے نہ جانا پڑے۔

سوال...... سوال بہت تھے اکیسویں صدی کے رام کولہی کے پاس۔ جواب کوئی نہ تھا۔

☆☆☆

میں بھی پاکستان ہوں، تُو بھی پاکستان ہے
تُو تو میری جان ہے
تُو تو میری آن ہے
تُو میرا ایمان ہے
میں بھی پاکستان ہوں، تُو بھی پاکستان ہے

"شاباش۔" عروہ چپ ہوئی تو چوہدری صاحب نے خوش ہو کر شاباشی دی۔

"تابو...... میں...... میں۔" مچھر دانی میں چوہدری صاحب کے بازو پہ سر رکھ کر لیٹی حبہ اٹھ بیٹھی۔

"جی...... نانی! آپ سناؤ۔" اس علاقے میں بچی کو پیار سے اکثر اماں، نانی، کبھی کھری، کبھی ڈڑی کہہ کر بلایا جاتا ہے۔ چوہدری صاحب بھی بچیوں کو یوں ہی مخاطب کرتے تھے۔

"میں بھی پاتستان (پاکستان) ہوں تُو بھی...... تابو...... "تُو" نہیں کہنا ناں "آپ" کہنا ہے ناں۔" لہک لہک کر گاتی حبہ کو ماں اور فاطمہ باجی کے قول یاد آئے تو نغمہ وہیں رہ گیا، آداب یاد آ گئے۔ سب ہنس دیے۔

یہ چوہدری صاحب کا گرمیوں کا روزانہ کا معمول تھا۔ نماز عشاء ادا کرنے کے فوراً بعد مچھر دانی میں چلے جاتے اور تمام بچوں کو بلا لیتے۔ پھر ان سے تقاریر، نظمیں سنتے۔ جنرل نالج کے سوالات کرتے۔ اسکول میں ہونے والے کلاس ورک اور گھر ملنے والے کام کے بارے میں پوچھتے۔ اور جس بچے نے اس دن کسی ٹیسٹ میں اچھے نمبر لیے ہوتے، اسے شاباشی کے ساتھ خرچی بھی ملتی۔

بچوں کو یہ محفل بہت اچھی لگتی۔ سردیوں میں تو مغرب ادا کرتے ہی وہ ماؤں سے کہتے کہ بچوں کو کمرے میں لے جائیں۔ باہر ٹھنڈ لگ جائے گی۔ مچھر کاٹ لے گا۔ بچے گرمیوں کی اس بیٹھک کا انتظار کیا کرتے۔

"چلو عروہ...... نانی...... اب اپنے گھر کا پتا سناؤ۔" چوہدری صاحب نے دوسری چارپائی پہ بیٹھے بچوں میں سے عروہ کو پھر پکارا۔

"چوہدری سفیان یعقوب...... چوہدری نگر...... نزد میرواہ...... تحصیل بدین...... ضلع بدین۔" اس نے کھڑے ہو کر پتا سنایا۔

"شاباش۔"

"تابو...... میں۔" حبہ کیوں پیچھے رہتی۔ وہ لیٹی لیٹی پھر اٹھ بیٹھی۔

"جی جی...... منجھی ڈڑی۔"

"چوری سفان یقوب...... چوری نگر......"

سب بچے منہ پہ ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگے تھے۔ کولر میں برف ڈالتی فاطمہ کو بھی ہنسی آ گئی۔

"چوری نہیں چوہدری کہتے ہیں۔" عروہ نے استانی جی بن کر تصحیح کی۔ وہ سال ڈیڑھ سال حبہ سے بڑی ہو کر خود کو بڑا معتبر جانتی تھی۔

"پیتے (پیسے)۔" حبہ نے چوہدری صاحب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ پھر ہنس دیے۔ اسے پتا تھا کہ اچھی کارکردگی دکھانے پہ تابو پیسے بھی دیتے تھے۔ پچاس کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھتے ہوئے انہوں نے بابر کو مخاطب کیا۔

"اچھا بابر...... ہمایوں بھائی کا موبائل نمبر بتاؤ۔"

"صفر تین صفر صفر......" بابر کھڑا ہو کر ہمایوں کا موبائل نمبر بتانے لگا۔

چوہدری صاحب نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ یہ بھی ان کی عادت تھی کہ وہ ہر بچے کو گھر کا مکمل پتا اور فون نمبر ضرور یاد کرواتے تھے۔ جب ہمایوں کے پاس موبائل نہ تھا تو ان کو شہر میں رہنے والی بہن یاسمین کا لینڈ لائن نمبر یاد کروایا جاتا تھا۔ ان کے لاشعور میں کہیں امت الاحد تھی، ان جیسے گم ہوئے اپنوں سے بچھڑے ہوئے وہ بچے تھے جو رستہ بھٹک کر گھر نہ پہنچ پائے۔

انہیں لگتا تھا کہ ہر بچے کو کلمہ سکھانے کے بعد گھر کا مکمل پتہ اور فون نمبر اردو اور انگریزی دونوں میں یاد کروانا چاہیے۔ تاکہ خدانخواستہ کوئی بچہ رستہ بھول جائے، والدین سے بچھڑ جائے تو اپنے گھر واپس پہنچ جائے۔ کیونکہ بچے گم ہو جائیں تو دنیا اندھیر ہو جاتی ہے۔ اور اگر رل کر کھو جائیں تو بھی بڑی قیامت آتی ہے۔

انہیں اپنے بڑے بھائی کی زندگی کے آخری دن نہ بھولتے تھے۔ امت الاحد کی جدائی نے انہیں روگ لگا دیا تھا۔ اور اسے ایک بار دیکھنے کی حسرت لیے دنیا سے چلے گئے تھے۔

"چلیں پھر؟" رفعت جہاں کی آواز نے انہیں چونکایا۔

"کہاں؟" چوہدری صاحب بھول چکے تھے۔

"لیں...... میں نے کہا تو تھا آپ سے کہ آپا فردوس کی طرف جانا ہے۔ یاسر اور رباب کی شادی کے سلسلے میں صلاح مشورہ کرنے۔"

"شادی!" بچوں کے چہرے پہ چمک آئی۔ کتنا مزا آنے والا تھا۔

"ہوں......" چوہدری صاحب نے بچوں کی محفل برخاست کی اور بیوی کو مشورہ دیا۔

"فردوس کو ہی بلا لو ادھر۔" چوہدری صاحب کو ایک دفعہ بچھر دانی میں جا کر نکلنا بڑا اوکھا کام لگتا تھا۔ بھائیوں کے ساتھ بات چیت، چھوٹے موٹے معاملات یہیں لیٹ کر طے کیے جاتے۔

"لیں...... آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ہم لڑکے والے ہیں۔ تاریخ طے کرتے تو ہم نے ہی جانا ہے ناں۔"

"پتا نہیں جی...... اچھے بھلے بہن بھائی ہوتے ہیں۔ بچوں کے رشتے آپس میں طے کر کے لڑکی والے لڑکے والے بن جاتے ہیں۔" چوہدری صاحب بڑبڑاتے ہوئے بچھر دانی سے باہر نکلنے لگے۔

"پابی کہاں ہیں؟" انہوں نے رحیمہ احمد کی بابت پوچھا۔

"آ رہی ہیں وہ۔ اور آپ بھی کپڑے تبدیل کریں۔ استری کر کے نالا (ازار بند) ڈال کر غسل خانے میں لٹکائے ہیں۔"

رفعت جہاں نے اپنی چادر ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ انہوں نے خود بھی نیا لباس پہن رکھا تھا۔ اور منہ پر کریم لگا کر ہلکے سے رنگ کی لپ اسٹک بھی لگائی ہوئی تھی۔ عام دنوں میں تندر کی طرف جاتے ہوئے یہ تیاری نہیں ہوتی تھی مگر آج خاص دن تھا۔

☆☆☆

"محبت ڈاھڈی (بہت) خراب شے ہے بابا ڈاھڈی۔ اور کچی عمر کی محبت...... بندہ نادانی، کم عقلی اور حماقت جان کر قدم آگے بڑھا دے تو ٹھیک ورنہ تو تو...... رو رو کے ہی ...... ہے۔"

پنوں جو "پیٹ لکھوائی" کی رسم میں اس کے ساتھ نتھی کر دیا گیا تھا، وہ اگر شہر میں پرانے استعمال شدہ کپڑوں کا گاڈھا (ریڑھا) لگانے کے بجائے ہیروں کا سوداگر ہوتا تو بھی اس کا کوہ نور سا دل بھلا کیسے مٹھی میں کر پاتا۔ وہ دل جو "رامو...... رامو" کی کافیاں گاتا پھرتا تھا۔

سچ ہے بابا...... محبت ڈاھڈی خراب شے ہے۔ اور یہ حوراں دمی اللہ رکھیو جو محبت کر بیٹھی تھی تو بس اللہ سائیں معافی...... معافی۔

محبت بھی کس سے رامو سے، وہ رامو جو کسی اور کے در پہ اسے خدا ماننے پڑا تھا۔ اب اس نی بھاگن (بدنصیب) کو روگن تو ہونا ہی تھا۔ سارا دن ماری ماری پھرتی۔ رات بھر کروٹیں لیتی۔ کوئی پکارتا تو آواز کان تک نہ پہنچتی، کوئی سامنے بھی ہوتا تو نظر نہ آتا۔ کان، آنکھ، دل، دماغ سب رامو کے قبضے میں چلے گئے تھے۔

پنوں اچھی حالت والے، کڑھائیوں والے، گوٹے کناری والے کپڑے اس کے لیے الگ نکال چھوڑتا۔ گوٹھ آتا تو تھیلا بھر لاتا۔ وہ کھول کر بھی نہ دیکھتی۔ ہاں اس کی ماں اور بھابی کی موج ہو جاتی۔

"لگتا ہے، تجھے محبت کرنی ہی نہیں آتی...... میں جو تیرے پہ دل جان وارتا ہوں...... تجھ کو قدر ہی نہیں۔" پنوں دل برداشتہ ہو کر کہا کرتا تھا۔

وہ دل ہی دل میں ہنس دیتی۔

"ہاں...... مجھے محبت کرنی ہی نہیں آتی۔" ہنستے ہنستے آنکھ کا بھیگا کنارا صاف کرتی اور سوچتی۔

اس کو ناک منہ پونچھنا بھی نہیں آتا تھا جب سے وہ رامو کے پیار میں پڑ گئی تھی۔ دور شہر سے کبھی کبھار آنے والا وہ راجکمار اس کے دل پہ راج کرنے لگا تھا۔ دین دھرم بھول بیٹھی وہ۔ ماں کو خبر پڑی تو اس کی مار بھی کھائی مگر باز نہ آئی۔

سچ ہی کہتے ہیں...... محبت ڈاھڈی خراب شے ہے۔ اور یہ حوراں دمی اللہ رکھیو جو محبت کر بیٹھی تھی تو بس اللہ سائیں معافی...... معافی۔

☆☆☆

کوہ نور والے فلم کا آخری سین دیکھ رہے تھے جہاں برسوں کے بچھڑے مل رہے تھے۔ غالباً مسکراہٹیں، آنسو، بے تابی، خوشی سے بے قابو ہو کر منہ سے نکلتی چیخیں، سب کچھ تھا اس منظر میں۔

ٹریفک کانسٹیبل نے سیٹی بجا کر انہیں متوجہ کرنا چاہا مگر بے چارا بری طرح ناکام ہوا۔ پھر اس نے خود آگے بڑھ کر بمشکل شوٹنگ رکوائی اور سب کو رستے کے بیچوں بیچ سے ہٹایا۔ وہ سب کوہ نور کے کولڈ کارنر میں آ کر بیٹھ گئے۔

"احل! تم کتنی پیاری ہو گئی ہو۔" فاطمہ نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"کہنے کا سادہ ترین مطلب یہ ہے کہ احل تم پہلے پیاری نہیں تھیں۔" ہمایوں فوراً بولا تو وہ گیلی آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے مسکرا دی۔

"احل! تم نے ہم سب کو پہچان لیا؟" مومنہ نے پوچھا۔ اس نے مومنہ کے سوال کا جواب اثبات میں سر ہلا کر دیا۔

آج یہ لوگ فاطمہ اور یاسر کی شادی کی شاپنگ کرنے حیدر آباد آئے تھے۔ چونکہ رباب کے ولیمے کا جوڑا بھی لینا تھا تو وہ بھی ساتھ تھی۔ اسود نے پرسوں جب اسے بتایا تو وہ تب ہی سوچ بیٹھی تھی ان سب سے ملنے کا اور پرسوں شام سے آج اس وقت تک کا انتظار بڑا طویل لگا۔

"نہیں احل! مجھے تمہاری یادداشت پہ بھروسا نہیں۔ ایک ایک کا نام بتاؤ۔" ہمایوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"بچی کی کلاس نہ لے اتنی لمبی۔ مجھے پہچان لے تو بس کافی۔" بھرے بھرے جسم والی پیاری سی لڑکی نے ہمایوں کے کندھے پہ ہاتھ مارا اور فیصلہ سنا کر احل کی طرف دیکھا۔

"آپ ارم بھابی ہیں۔"

"ہائے میں صدقے جاؤں۔" وہ جی جان سے خوش ہو گئی۔

"اس کی ذہانت سے اتنا متاثر ہونے کی ضرورت نہیں چاچی! اسود نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کون کون آ رہا ہے۔" فاطمہ نے بھی ہمایوں کے ساتھ مل کر اسے تنگ کیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے اسود کی طرف دیکھا جو ولی کے ساتھ مگن تھا۔

"تم لوگ مجھے خوش نہ ہونے دینا جی بھر کے...... ہائے احل! تم سے ملنے کو بڑا ہی جی چاہتا تھا۔" فاطمہ کو گھورنے کے بعد اس نے احل کا دوسرا ہاتھ تھام لیا۔ "تمہارے بھاؤ تمہیں بڑا یاد کرتے ہیں۔"

"ہیں...... اس کے بھاؤ سے آپ کی ملاقات کب ہوئی؟" ہمایوں بڑا ہی سنجیدہ تھا۔

"میں سیفی کی بات کر رہی ہوں۔" ارم نے تنک کر جواب دیا۔

احل نے ہنستے ہوئے ولی کی طرف دیکھا۔ اسے گود میں لینا چاہا لیکن وہ اسود کے پاس سے انچ بھر نہ ہٹا۔ بس گن انکھیوں سے اس نئے چہرے کو دیکھتا رہا۔

"اب جلدی جلدی آپ لوگوں نے جو کھانا ہے کھائیں۔ اور شاپنگ کر لیں۔ واپسی پہ دیر نہیں ہونا چاہیے۔" اسود نے بڑے بھائی کا رول لے لیا۔

"کتنی شاپنگ رہتی ہے؟" احل نے فاطمہ سے پوچھا۔

"ابھی تو بہت کچھ رہتا ہے۔" اس نے فکرمندی سے جواب دیا۔ "خاص چیز...... ولیمے کا سوٹ...... تمہارا انتظار کر رہے تھے کہ آؤ تو مل کر پسند کریں۔" اس کے لیے خاص چیز تو ویسے اپنی شادی کا لہنگا تھا مگر سامنے بھائی بیٹھا تھا اور وہ ٹھہری شرمیلی لڑکی۔

"لو جی کر لو گل...... ابھی تک یہ چار خواتین جوڑے کے رنگ پہ ہی متفق نہ ہو رہی تھیں۔ اب پانچویں شامل ہو گئی ہے، لگتا ہے ہفتے بھر کا قیام کرنا پڑے گا۔" ہمایوں نے سر پکڑا۔

"تمہیں کیا تکلیف ہے۔ تم جاؤ اپنی شاپنگ

کرو۔ اب ہمارے سر پہ سوار نہ ہونا۔" مومنہ تلملائی۔

"جب تک تم سے دو سن نہیں لیتا، اسے تکلیف ہی رہتی ہے۔" رباب ہنسی۔ ہمایوں نے بے اختیار اسود کی طرف دیکھا۔ وہ موبائل کان سے لگائے کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔ ہمایوں نے دل میں شکر ادا کرتے ہوئے رباب کو گھورا۔ اور پھر مومنہ کے خفا سے چہرے پہ نگاہ کی۔ ریشم گلی سے شاپنگ کیے جانے پہ جس کا موڈ خاصا خراب تھا۔

"چلیں آپ لوگ یہاں کی شاپنگ مکمل کریں۔ ہم الرحیم سینٹر جا رہے ہیں۔ فارغ ہو کر ہمیں بتا دینا لیکن ذرا جلدی...... اگر آنو بھان اور صدر جانا ہے تو......" بل وا کر کے اسود اٹھا اور انہیں ہدایات دے کر ولی کا ہاتھ تھام کر بائیک اسٹینڈ کی طرف چلا گیا۔ ہمایوں بھی ڈرائیور کو ڈھونڈنے لگا۔

وہ پانچوں ریشم گلی میں داخل ہو گئیں۔ احتل اور فاطمہ کا تو بس نہ چل رہا تھا کہ بغیر سانس لیے ایک دوسرے سے باتیں کرتی چلی جائیں۔ بہو کے ولیمے کا جوڑا پسند کرنے کے دوران بھی وہ ایک دوسرے کے سر سے سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ جبکہ مومنہ کو کسی جوڑے کا کام پسند نہ آ رہا تھا تو کسی کا رنگ۔ ارم اور رباب نے بہت دیر تک یہ تماشا دیکھا۔ آخر ہونے والی بھو روٹھ گئی۔

"رہنے دیں مامی! دو کی باتیں ختم نہیں ہو رہیں اور تیسری کے نخرے۔ میں اپنے ولیمے پہ پچھلی عید والا سوٹ ہی پہن لوں گی۔" رباب بولی۔

بھلا اب ایسی معصوم بھابھی پہ کس کو پیار نہ آتا۔ وہ دونوں فوراً متوجہ ہوئیں۔ تیسری نے اپنے جی کو ذرا مارا۔ بالآخر فاطمہ کے لیے سرخ رنگ کا عروسی لباس اور رباب کے لیے انگوری رنگ کا ایک لہنگا پسند کر ہی لیا گیا۔ اب مزید لمبا مرحلہ قیمت طے کرنے کا تھا۔ جتنی قیمت بتائی گئی تھی اس سے آدھی قیمت پہ لانے کے لیے ارم چار دفعہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ کسی اور دکان پہ جانے کی دھمکی دیتے ہوئے لڑکیوں کو بھی اٹھنے کے اشارے کیے تب کہیں جا کر اس قیمت پہ لہنگے پیک ہوئے۔ بقول ارم کے ابھی بھی مہنگے لے ڈالے۔

مومنہ کو پوری ریشم گلی کھنگال ڈالنے کے بعد بھی کوئی سوٹ پسند نہ آیا۔ میچنگ چوڑیاں، جیولری اور جوتے تو بعد کی بات تھی۔ اس کو سمجھاتے، اس کو راضی کرتے، اس کو ڈانٹتے سب نے اپنی اپنی خریداری کی۔

احتل ماں کے لیے شیفون کا سفید رنگ کا ایک جوڑا لائی تھی۔ جو اس نے کل حصہ کے ساتھ آ کر بریزے سے لیا تھا۔

"بہت خوب صورت، بہت نفیس ہے لیکن ماں خفا ہوں گی کہ اتنا مہنگا سوٹ تم نے ان کے لیے کیوں لیا۔" فاطمہ کو اس سوٹ کو ایک نظر دیکھ کر ہی اس کی قیمت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

"ماں کے سامنے چیزیں اور قیمتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں فاطمہ!" اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"ایسا تو تم کہہ رہی ہو ناں، ماں تو کہیں گی امت الاحد نے ان ہی پیسوں سے کسی غریب کی مدد کر دی ہوتی، صدقہ کر دیا ہوتا...... سوٹ کا کیا ہے، تن ہی ڈھانپنا ہوتا ہے۔ وہ تو پانچ سو ہزار کے سوٹ سے بھی ڈھانپ سکتے ہیں۔" مومنہ نے سر جھٹک کر کہا۔

احتل کو ماں کے لیے یہ لہجہ برا محسوس ہوا۔

وہ فارغ ہوئے تو ساڑھے چھ ہو چکے تھے۔ اسود ولی کے لیے شاپنگ کر چکا تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ مومنہ نے ابھی تک کچھ نہیں لیا۔ تو وہ اسے شہر کی بہترین آؤٹ لیٹس کی طرف لے آیا۔ جہاں سے سیاہ رنگ کا شیفون کا ایک جوڑا اس کو پسند آیا۔ فاطمہ نے تاسف سے سر ہلایا۔ اسے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ رباب کیا سوچے گی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)